جامعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

آپ کے بچوں کی کتابیں

مکتبہ جامعہ نے بچوں کے لئے بہت سی کتابیں شائع کی ہیں۔ ان کے مضامین سہل ہیں اور زبان آسان۔ اکثر کتابیں جامعہ کے اساتذہ اور معلمین کی لکھی ہوئی ہیں یا ان کی زیر نگرانی تیار ہوئی ہیں۔ بیان کی الجھنوں اور اغلاط سے یہ نسبتاً پاک ہیں۔ لکھائی چھپائی خوشنما ہے اور الفاظ الگ الگ ہیں کہ بچوں کو پڑھنے میں سہولت ہو۔ جامعہ کے لوگ بچوں کا لٹریچر شائع کرنا اپنا خاص کام سمجھتے ہیں اور ایسی کتابیں شائع کی جا رہی ہیں جنھیں دیکھ کر بچے اُن کی طرف بڑھتے ہیں، بھاگتے نہیں۔

بچوں کی کہانیاں	۲ر	عجائب خانہ سمندر	۱۲ر
مرغی اجیر علی	۳ر	کائنات	۵ر
ناخیں خاں	۲ر	دنیا کے بسنے والے	۶ر
...ت کا پھل	۲ر	تعلیمی کھیل	۴ر
...شید نا	۳ر	بچوں کا حساب	
...بچاری	۳ر	حصہ چہارم	۹ر
شہزادی گلنار	۴ر	" پنجم	۱۰ر
بچوں کی نظمیں	۵ر	" ششم	۹ر
بچوں کے بہانہ کھیل	۲ر	باغبانی پر دو کلٹ	۲ر
...واحسر نمیر	۳ر	میلاد النبی پر دو کلٹ	۶ر

پیام تعلیم

اپنی فرصت کے وقت تمہارا جی ہلکی ہلکی مزے مزے کی چیزیں پڑھنے کو چاہتا ہوگا۔ ہم نے پیام تعلیم تمہاری اسی خواہش کو پورا کرنے کے لئے نکالا ہے۔ تمھیں چیزیں بنانے یا جمع کرنے کا شوق ہے تو اس کے بارے میں بھی اچھے اچھے مضمون تمھیں ملیں گے۔ غرض ہر قسم کی دلچسپیاں اس میں موجود ہیں اسے پڑھ کر تمھیں افسوس ہوگا کہ تمھیں دادھیں کیا خبر تھی نہیں تو پہلے سے ایسے اچھے رسالے کو منگایا کرتے۔

قیمت

سالانہ صرف ہے، فی پرچہ ۲ر ، مع ضمیمہ ۴ر

آپ بھی ان میں سے کچھ کتابیں طلب فرما کر ہماری حوصلہ افزائی کیجئے

مکتبہ جامعہ نئی دہلی

بسم اللہ

جامعہ

زیرِ ادارت ۔ ڈاکٹر سید عابد حسین ایم ۔ اے ۔ پی ۔ ایچ ڈی

جلد ۲۸ | جنوری سنہ ۱۹۳۷ء | نمبر ۱

فہرست مضامین

			صفحہ
۱	عبادت	جناب پروفیسر محمد مجیب صاحب بی ۔ اے (آکسن)	۱
۲	غزل کی حمایت	جناب حکیم الطاف احمد صاحب آزاد انصاری	۱۱
۳	یورپ کے نوجوان	جناب برکت علی صاحب فراق متعلم بی ۔ اے (جامعہ)	۲۹
۴	شکوہ شکایت	جناب منشی پریم چند صاحب آنجہانی	۳۷
۵	افلاطون کی نصیحت	جناب عبداللہ سلفی صاحب	۵۱
۶	کارٹون	....	
۷	کلامِ آزاد	جناب حکیم الطاف احمد صاحب آزاد انصاری	
۸	تنقید و تبصرہ	....	

قیمت سالانہ صہ ۔ فی پرچہ ۸ر

پروفیسر محمد مجیب بی ۔ اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے محبوب المطابع برقی پریس میں چھپوا کر شایع کیا

عبادت

مذہبی عقائد کی چھان بین اور جذبۂ دینی کے ارتقاء کا سلسلہ قائم کرنے کی جو کوششیں یورپی عالم ستّر اسّی برس سے کر رہے ہیں اُن سے کوئی اور نتیجہ نکلا ہو یا نہ ہو، قدیم زمانے کی مذہبی روایتوں اور دیومالا کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ مشرق اور مغرب کی مقدس کتابوں کے ترجموں اور تشریحوں نے پہلے کے مقابلے میں مذہبی عقائد کا مطالعہ بہت آسان کر دیا ہے جو عالم مختلف مذہبوں کو اپنے سامنے رکھ کر ان پر اسی انداز سے غور کرتے ہیں جیسے کہ ایک نقاد مختلف شاعروں کے کلام پر، وہ اس نتیجے کو پہنچتے ہیں کہ کسی قدیم یا جدید مذہب میں کوئی بات نئی یا نرالی نہیں ہے، اور کسی مذہب کے پیرو یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ان کے عقائد صحیح اور باقی سب کے غلط ہیں۔ کیوں کہ جس قدر ہم غور کرتے ہیں اتنے ہی ہمیں اس کے ثبوت ملتے جاتے ہیں۔ کہ مذہبوں میں مشترک صفات زیادہ ہیں، اور انفرادی خصوصیات کم، اور یہ خصوصیات بھی حالات اور مذاق کے فرق نے پیدا کی ہیں۔ ایسے حقائق نے نہیں کہ جن کا علم پہلے کسی کو نہ تھا۔ ایک اور نتیجہ جو اس تحقیق سے نکلا ہے یہ ہے کہ ہر مذہب، خواہ وہ کسی قوم کی میراث ہو جس سے وہ اور سب کو الگ رکھنا چاہتی ہو یا ایسا کہ جو عالم گیر بننے کا حوصلہ رکھتا ہو، دراصل انسانوں کی ایسی مادی ضروریات اور اغراض کا ایک عکس ہوتا ہے جن کا پورا ہونا انسان کی ترقی اور کامیابی کے لئے ناگزیر ہو اور اسی وجہ سے اس کو تقدس کا زرہ پہنا کر انکار اور مخالفت سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

یہ اور ایسی بہت سی باتیں یورپی عالموں نے اپنے کلیسا، اس کی تعلیم اور اس کے تعصبات کی ضد میں کہیں، اور چونکہ دینی معلم شروع شروع میں ان باتوں کو اچھی طرح سمجھ نہ سکے وہ ان پر بہت جز بز ہوئے۔ اور ایسے تعلیم یافتہ لوگ جو پرانے عقائد سے مطمئن نہ تھے اس نئے علم کو اصل حقیقت سمجھ بیٹھے۔ مسلمانوں میں پچھلے سو ڈیڑھ سو برس کے اندر نہ عالم ایسے

دھن کے پکے ہوئے ہیں کہ اپنی عاقبت کو علمی تجسس کی نذر کر دیں نہ مذہبی رہنما ایسے صاحب اختیار کہ جس کھوپڑی کو غلط خیالات سے بھرا ہوا پائیں اسے پھوڑ کر رکھ دیں۔ نئے علم اور پرانے مذہب میں تضاد لوگ اب بھی محسوس کرتے ہیں۔ لیکن یہ علم کی کمی یا طبیعت کی کمزوری کی وجہ سے ہے، اور جیسے علم بڑھتا جائے گا اور ذہن غلامی کے اثرات سے پاک ہوتا جائے گا مذہب اور علم کی ہم آہنگی اور یک جہتی بڑھتی جائے گی۔

اگر علمی تحقیق سے یہ ثابت ہوا ہے کہ دنیا کے تمام مذہب ایک ہی حقیقت کو بیان کرنے کے مختلف طریقے ہیں جیسے دنیا کی تمام نسلیں اور قومیں ایک اصل کے مختلف نمونے ہیں تو اس سے کسی مذہب کی قدر گھٹ نہیں جاتی، اور اس کی شخصیت میں بھی فرق نہیں آتا۔ نوع انسانی کا ہر فرد، خواہ اسے تعلیم اور ماحول نے ایک نمونے کے مطابق ڈھالنے کی کتنی کوشش کی ہو، اپنی الگ شخصیت ضرور رکھتا ہے۔ اور بعض افراد جن میں زیادہ قوت ہوتی ہے ہر طرح کے دباؤ کے باوجود ابھر کر نقل کی جگہ نیا نمونہ بن جاتے ہیں۔ اسی طرح جذبۂ دینی اصل میں ہر جگہ ایک ہے لیکن بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جس میں وہ ابھر کر ایک نیا ماحول پیدا کرنے کی قوت حاصل کر لیتا ہے اور اگر بانی مذہب ایسا کامل ہو کہ ایک قوم یا ایک نسل ہی کو اپنا نہ سمجھے بلکہ ہر قوم اور ہر نسل یعنی انسانی فطرت کا ہر نمونہ اس میں مرغوب صفات کی کامل صورت دیکھے تو مذہب خود بخود عالم گیر ہو سکتا ہے۔ اس مذہب میں ایسی حقیقت ہو نہیں سکتی جس کا کبھی کسی کو علم یا احساس نہ تھا۔ اس لئے کہ ایسی نئی حقیقت کے لئے نیا نظام کائنات اور نئی انسانی سرشت درکار ہوگی، نئی بات ہر مذہب میں بانی کی حیثیت، اس کی تعلیم کی مجموعی شکل ہوتی ہے اور مذہب کو پرکھنے کی کسوٹی یہ اندازہ ہے کہ اس میں عام انسانی سرشت اور عام انسانی ماحول کس حد تک مدنظر رکھا گیا ہے اور کس حد تک ایک خاص قوم کا مذاق اور مزاج یعنی وہ صرف اپنوں کی فکر کرتا ہے یا اپنے پرائے کی قید سے آزاد ہے۔

علمی تحقیق نے مذہب کے متعلق جو دوسری حقیقت معلوم کی ہے کہ وہ اصل میں مادی ضروریات اور اغراض کا عکس ہے علم کے پرستاروں کے نزدیک مذہب پر ایک کاری ضرب ہے۔ کیونکہ وہ

اس طرح انسانی ذہن کو تاریخ کے کھونٹے سے باندھ دیتے ہیں اور ان شاعرانہ اور علم کے نقطہ نظر سے آوارہ خیال آرائیوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑتے۔ جن پر جذبہ دینی کی پرورش کی جاتی ہے اب ہر عقیدے کی تاریخ بیان کردینا گویا اس کے کپڑے اتار لینا ہے، کہ پھر وہ بھلے آدمیوں کا سامنا کرنے کے لائق نہ رہے اور پرانے سے پرانے ملاقاتی بھی اس کا ذکر کرتے ہوئے شرمائیں۔ لیکن اگر تاریخ بیان کرنے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے تو ایک عقیدہ ہی منہ چھپانے پر مجبور نہیں ہوگا۔ بلکہ ساری انسانی تہذیب، اور علم کی روشنی میں اندھے ہو کر ہم پھر وحشیوں کی طرح ایسی حقیقتوں کو ٹٹولتے پھریں گے، جو ہماری زندگی کا سہارا بن سکیں، بس فرق یہ ہوا کہ وحشی آئندہ زندگی کا سامان اپنے دلوں میں لئے ہوئے تھے اور ہمارے دل ویرانے ہوں گے۔ ایسے انجام سے بچنے کے لئے ہمیں غور کرنا ہوگا کہ تاریخ حقیقت کے ہر پہلو پر حاوی ہوسکتی ہے یا نہیں۔ اور انسان جسے پیٹ کی غلامی نے رسوا کر ہی دیا ہے اب کتاب کا غلام ہو کر رہے گا۔ یا اس کے ارادے میں اتنی قوت ہے کہ ان نئی زنجیروں کو توڑ سکے۔

ارادہ تو ہر تندرست آدمی میں ہوتا ہے، تاریخ کی کرامات یہ ہے کہ اس نے ارادے کو عین پابندی ثابت کیا ہے۔ مگر ہم کبھی کبھی یہ بھی دیکھتے ہیں کہ پامال قوموں میں اچانک ایسی شخصیتیں نمودار ہوتی ہیں کہ وہی ماحول جس پر پہلے خزاں کی تاثیر تھی بادِ بہار بن کر خوابیدہ قوتوں کو جگاتا اور مردوں میں جان ڈال دیتا ہے۔ تاریخ کے نئے عالم ہمیں یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ماحول میں اس کی قدرت ہے کہ وہ آپ اپنی ضد بن جائے اور ایک طرح سے اپنا جادو نہ چلا سکے تو وہ دوسری طرح چلائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ماحول ایک ایسی قوت، اثرات کا ایسا طلسم ہے کو جو ہمارے ذہن اور تخیل کے قابو میں نہیں آسکتا۔ اور اسے مختارِ کل ٹھہرانا ویسا ہی عقیدہ ہے جیسے کہ اور ہزاروں عقیدے جن کی عزت کرنا علم کی شان کے خلاف معلوم ہوتا ہے اس پر طرہ یہ کہ اس عقیدے کی بدولت اچھے اور برے غلط اور صحیح کی تمیز بھی نہیں رہتی، اس عقیدے کا مقصد سمجھانا، واضح کرنا، تحقیق کا سلسلہ جاری رکھنا ہے ہدایت تو ہمیں نہ اس عقیدے سے حاصل ہوتی ہے نہ تاریخ کے اس دیئے سے جو اس مندر میں جلایا گیا ہے تاریخ

یہ بتا سکتی ہے کہ کیا ہوا اور کیسے ہوا۔ لیکن جو واقع ہوا اس کی اخلاقی قدر و قیمت جانچنے کے لئے تاریخ کا اپنا کوئی معیار نہیں۔ مورخوں کا البتہ اپنا معیار ہوتا ہے جسے ان کے عقیدے اور ذہنی تعصبات قائم کرتے ہیں۔ لیکن اس غیر علمی معیار کو وہ اپنے عقیدوں میں اس طرح چھپا دیتے ہیں کہ دیکھنے والے کو اس کا پتہ نہیں چلتا یہ ہماری سادہ لوحی ہے کہ ہم عالم اور شعبدہ باز کو آدمیوں کی دو مختلف قسمیں سمجھ بیٹھتے ہیں ورنہ عالموں کے بستے پر ہر طرح کا شبہ کیا جا سکتا ہے اور کیا جانا چاہیئے۔

تاریخ کے عالم شعبدہ بازی پر اس وجہ سے مجبور ہوئے ہیں کہ وہ تاریخ سے ایسے کام نکالنا چاہتے ہیں جو اس کے دائرے سے باہر اور اس کے اصل مقصد سے دور ہیں۔ تاریخ ایک نئے دین کی بنیاد نہیں بن سکتی، لیکن جذبۂ دینی کے مظاہر سے ہمیں واقف کر سکتی ہے۔ ماحول قادر مطلق نہیں ہے لیکن وہ انسانی زندگی کے تمام راز اپنے سینے میں رکھتا ہے۔ اس طرح یہ دعویٰ کہ مذہب مادی ضروریات اور اغراض کا عکس ہے۔ موجودہ مذہبوں کو مٹانے اور ایک علمی مذہب قائم کرنے کی نیت سے پیش کیا جائے تو وہ غلط ہے اس لئے کہ مادی اثرات معلوم کرنے کے لئے ہمارے جو ذریعے ہیں وہ محدود ہیں اور محدود رہیں گے اور ان کی حد سے گذرنے کے لئے ایسی بصیرت درکار ہے جو علم کی ایک علیحدہ اور بہت اعلیٰ قسم ہے اور کتابی عالموں اور اصطلاحوں سے بحث کرنے والے فلسفیوں کو نصیب نہیں ہوئی۔ لیکن اگر یہی دعوے جذبۂ دینی کو انتہا پسندوں کے ہاتھوں سے بچانے کے لئے کیا جائے تو وہ بڑی حد تک صحیح ہے۔ مذہب کوئی کتابی علم نہیں ہے، عقل کے کارخانے کی بنی ہوئی چیز نہیں۔ جذبۂ دینی انسانی زندگی اور انسانی شخصیت کو نمو اور فروغ دینے والی قوتوں کا سرچشمہ اور ان کا غیر محدود قدرتی ذخیرہ ہے اور جب تک ہم کو اس دنیا کے خاص مادی ماحول میں زندگی بسر کرنا ہے۔ مذہب کو مادی ضروریات اور اغراض سے کس طرح جدا کیا جا سکتا ہے۔ مادی ضروریات اور اغراض ادنےٰ بھی ہوتی ہیں اور اعلیٰ بھی، مگر اس کا کیا۔ انسان اشرف المخلوقات بھی ہے اور حیوان بھی۔

عبادت جذبۂ دینی کی وہ شکل ہے جو مذہب اور زندگی کے تعلق کو قائم رکھتی ہے اور عبادت

کے جو طریقے اور اس کے جو مقصد کسی مذہب نے مقرر کئے ہوں، انھیں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مذہب اور زندگی کا تعلق کس قسم کا ہے۔ عبادت کے ابتدائی طریقے۔ جن کا رگ وید کے بھجن اعلیٰ سے اعلیٰ، اور جان پرستی سب سے ادنیٰ نمونہ ہے، نوع انسانی کی خیر و عافیت کے لئے دعائیں مانگنے کی مختلف صورتیں ہیں۔ لیکن یہ نوع انسانی کی وہ حالت تھی جب اخلاقی خیر و شر، عدل اور انصاف کا معیار بن کر تیار نہ ہوا تھا، اور نجات کی وہ تمنا جس کے سائے میں بعد کو زندگی بسر ہونے والی تھی جسمانی سلامتی کی خواہش سے جدا نہیں ہوئی تھی۔ عبادت کے طریقے جبلی ہیں، فطری ہیں۔ اخلاقی اور روحانی نہیں ہیں، تاریخ اور حیاتیات کے علم ان کے اور مہذب انسانوں کی عبادت کے درمیان رشتہ قائم کرنے میں اتنے ہی ناکامیاب ہوئے ہیں جتنا کہ انسان کا بندر سے سلسلہ ملانے میں، آدمی انسان اسی وقت سے مانا جاسکتا ہے جب اس کو خیر و شر کا شعور اور علم ہوا۔ اور جب اس نے اپنے اخلاقی معیار کے مطابق زندگی کی طرح ڈالنے کا حوصلہ کیا۔ اس اعتبار سے گوتم بدھ، حضرت عیسیٰ اور پیغمبر اسلام کی تعلیم اور عبادت کا وہ مفہوم جو اس تعلیم میں مضمر ہے پہلے کے اور تمام مذہبوں سے جدا اور اعلیٰ حیثیت رکھتا ہے۔ دنیا کی تاریخ کے سب سے اہم اور نتیجہ خیز انقلاب انھیں مذہبوں کے پھیلنے سے ہوئے۔ یہی وہ "اتفاقات" ہیں جنھیں تاریخ سمجھا نہیں سکتی، آزاد اخلاقی ارادے، کے وہ عظیم الشان مظہر جو ہماری آئندہ ترقی کے ضامن اور اس وقت ہمارا سب سے مضبوط سہارا ہیں۔ یہاں اس بات پر زور دینا مقصود ہے کہ یہ علمی تحقیق کے کارنامے نہیں تھے۔ عبادت کے نئے طریقوں کے ذریعے سے نئی زندگی تعمیر کرنے کے منصوبے تھے اور اس وقت بھی ہماری کامیابی اس پر منحصر ہے کہ ہم اپنی حکمتِ عملی کو علوم صحیحہ کا محتاج نہ بنائیں۔ بلکہ اسے عبادت کا مظہر جانیں

میں در اصل کچھ کہنا اور چاہتا ہوں یہ تمہید تو اس لئے ضروری تھی کہ بغیر اس کے میں اپنا مطلب سمجھا نہیں سکتا تھا۔ جب ایک طرف لوگ مذہب کو اپنی نئی زندگی سے جان بوجھ کر خارج کرنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف لوگ بغیر جانے بوجھے اپنے مذہب کا اسی نئی زندگی سے رشتہ توڑ رہے ہیں۔ ہندوستان میں مذہب کی مخالفت کرنے والے بہت سے ایسے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ

وہ ارتقار کی اس منزل سے گذر چکے ہیں۔ جہاں اخلاق اور اعلیٰ مقاصد کے لئے مذہب اور عقیدے کا سہارا ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ انھوں نے یورپ میں تعلیم پائی ہے یا ان کی نئی معاشرت ان پابندیوں کو گوارا نہیں کرسکتی جو مذہب نے مقرر کی ہیں۔ ان میں سے جو لوگ تعلیم کی بدولت پہنچے ہوئے بنتے ہیں ان کا علمی اور عقلی سرمایہ یورپ کے کسی مفکر کے دو چار نظریے ہوتے ہیں۔ یہ بے بھگو وہ احتیاط بھی نہیں برتتے جو خود علم سکھاتا ہے اور ایسے نظریوں کو بھی بڑے جوش کے ساتھ دہراتے رہتے ہیں جو اگر غلط ثابت نہیں کئے جا چکے ہیں تو حقیقت کا مرتبہ ہرگز نہیں رکھتے، چونکہ وہ خود ارتقار کی اس منزل سے گذر چکے ہیں جہاں قول اور عمل پر ادب اور احترام کی قید لگی ہوتی ہے۔ وہ سقراط کی طرح اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ نادانوں کو چھیڑ کر دانا بنائیں۔ لیکن ان میں سقراط کی سی انسانی ہمدردی اور خلوص نہیں ہوتا۔ سقراط تو سقراط تھا[۵] یہ ڈانس بن کر رہ جاتے ہیں۔ یہ تو وہ ہیں جن کی قسمت ذرا اچھی ہوتی ہے بعض تو بے چارے اپنے غصہ کی آگ میں بھنتے رہتے ہیں۔ نہ آدمی نہ کباب، نئی معاشرت کے شیدائی پھر کچھ اچھے رہتے ہیں ان کے پاس روپیہ ہوتا ہے، چین سے رہتے ہیں۔ اپنے ہی جیسوں سے میل جول رکھتے ہیں اور بحث کا موقع ہوا تو اپنے کسی عام بھائی کو سامنے کر دیتے ہیں۔ نئی زندگی کے یہ دونوں قسم کے ہراول اپنے ان بھائیوں سے جو مذہب اور قدامت پسندی میں گرفتار ہیں سبقت لے جاتے ہیں تو بس اس اعتبار سے کہ اُن کی گرفتاری اور غلامی نئی وضع کی ہے۔

ہندوستان میں مذہب کے ایسے مخالف بھی ہیں جو مصلحت کی بنا پر مذہب کو بحث سے الگ رکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اب تک فسادیوں اور غداروں نے ہمیشہ مذہب اور ملت کی آڑ لی ہے اور سیاسی اغراض اور مفادِ عامہ کا احساس ہندوستانیوں میں جو تھوڑا بہت اتحاد پیدا کرتا ہے اسے مذہب اکثر مٹا دیتا ہے ان لوگوں کو اس سے کوئی مطلب نہیں کہ ترقی اور اصلاح کے رستے میں مذہب کے روڑے اٹکانے والے آدمی کیسے ہیں اور قوم کو دھوکا دیتے ہوئے وہ اپنی ذاتی اغراض کو چھپا سکتے ہیں

---

۵ سقراط نے ایتھنز کی جمہوری عدالت کے سامنے یہ عذر پیش کیا تھا کہ میں ڈانس ہوں میرا کام ایتھنز والوں کو ستانا ہے

یا نہیں وہ تو یہ دیکھتے ہیں کہ فساد اور غداری کسی کو ملت سے خارج نہیں کر دیتی۔ اور مسلمان مسلمان رہتا ہے چاہے وہ ملت کا خادم ہو یا اسے ہر خریدار کے ہاتھ بیچتا پھرے۔ اس صورت میں مذہب سے علیحدہ ہوئے بغیر کوئی کام نہیں بنتا اور اگر مذہب کو چھوڑنے سے ایسے بہت سے آدمی بھی چھٹ جائیں جو قومی مقاصد حاصل کرنے میں مدد دے سکتے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں اس خیال کے جو لوگ ہیں وہ چاہے اصولاً ہر مذہب کے مخالف ہوں اور وہی عقیدے رکھتے ہوں جو یورپی علم یا معاشرت کے غلاموں کے ہیں۔ اُن کی شکایت بالکل بجا ہے۔ ہم برسوں سے ہر روز اور ہر جگہ مذہب کے دغاباز خیر خواہوں کو ہندوستانی قوم ہی نہیں بلکہ اپنی ملت کا کام بگاڑتے اور اسے بے آبرو کرتے دیکھتے آئے ہیں۔ اور ان لوگوں کی طرف سے جو اصولاً اور پورے خلوص کے ساتھ مذہب کو صحیح زندگی اور سچی کامیابی کی بنیاد مانتے ہیں کوئی تحریک نہیں ہوئی ہے کہ دین داری کو پرکھنے کے لئے قوم پرور اخلاق اور مفاد عامہ کا معیار مقرر کیا جائے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ایسا معیار مقرر نہ کیا گیا تو ہندوستان کی ہر ملت اور سب سے پہلے مسلمان خود پرست اور انگریز پرست غداروں کے ہاتھوں تباہ ہوں گے۔

تو باوجود اس کے کہ مذہب پر اعتراض کرنے کا طریقہ اکثر خود قابل اعتراض ہوتا ہے ہمیں اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں میں، اور اب میں بحث صرف مسلمانوں سے کرنا چاہتا ہوں، دین اور دنیا کے درمیان وہ رشتہ نہیں رہا ہے جو ان کا دین سکھاتا ہے وہ اپنی عبادت کے صحیح مفہوم سے ناواقف ہیں یا اسے نظر انداز کر رہے ہیں جس کا ہماری موجودہ پستی اور انتشار ہی ایک ایسا ثبوت ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور دلیل کی ضرورت ہی نہیں۔ ہماری عبادت سراسر روحانی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ ایک تقریب بھی ہے۔ وہ شخصی صرف اس حد تک ہو سکتی ہے کہ خلوص ہر شخص کے لئے لازمی ہے۔ وہ پرستش کا طریقہ ہی نہیں۔ اتحاد اور یک جہتی رکھنے کا ایک ذریعہ بھی ہے۔ انتہا پسندی نے عبادت کے مفہوم کو روزہ نماز کی پابندی تک محدود کر دیا ہے۔ اور روزہ نماز کا مقصد بھی ثواب کمانا ٹھہرایا ہے۔ اور اگر اسلام نے دینی فرائض مقرر کرتے

ہوئے دنیا وی ضروریات کا خیال رکھ کر ایسے رجحانات کی پیش بندی نہ کرلی ہوتی تو ہمارے انتہا پسند بزرگ ایسے اپاہج کے سوا جس کی عمر پلنگ سے اُٹھ کر مصلے پر اور مصلے سے اُٹھ کر پلنگ پر جانے میں صرف ہو، کسی اور طرح کا مزاج اور حوصلہ رکھنے والے آدمی کے لئے دین دار بننا مشکل کر دیتے، لیکن اسلام کی حکمت اور اس کی فطرت شناسی میں بھی ہیں اس تنگ نظری یا یوں کہئے اس روحانی کاہلی سے بچا نہیں سکی ہے جو عبادت کے آسان سے آسان طریقے تلاش کرکے انھیں محبت اور تحقیق کی موشگافیوں اور تقدس اور سند کے وزن کے ذمہ داری کا ایک اچھا خاصا پہاڑ بنا دیتی ہے اور بہت سے فرائض کو جنھیں ادا کئے بغیر اسلامی عبادت کبھی مکمل نہیں ہو سکتی نظر انداز کر دیتی ہے اسے ہم صاف صاف کہنا چاہیں تو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ روزے اور نماز کو لوگ آسان دیکھ کر انھیں کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں۔ جہاد کو جو ارکان اسلام میں اتنی ہی بڑی حیثیت رکھتا ہے بھلا دیتے ہیں۔ اس کی ایسی مہمل تشریح کرتے ہیں کہ اس کا موجودہ حالت میں فرض ہونا ہی مشکوک ہو جاتا ہے۔ مسلمان جہاد کی کسوٹی پر کسی کے ایمان کو پرکھ نہیں سکتے، ایک ریاکاری ہی نہیں بلکہ صریحی غداری کو تسبیح اور مصلے کی بساط بچھاتے ہوئے دیکھتے ہیں اور کچھ کہہ نہیں سکتے، اس لئے کہ وہ غلط فہمی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور سے مخالف، اپنی نیک نیتی ثابت کرنے کے مرحلے ہی سے گذر نہیں پاتے نقصان وہ پہنچاتی ہے، لعنت کسی اور پر بھیجی جاتی ہے

اپنی جداگانہ حیثیت رکھنے کے علاوہ یہ کہنا بھی غلط تھا اور اب بھی غلط ہے کہ مسلمان پر روزے نماز کی ادائگی فرض نہیں غور اسی پر کرنا ہے کہ روزہ اور نماز علامت ہیں اس عبادت کی جو ملت کی معاشی، سیاسی اور اخلاقی اصلاح اور ترقی سے ادا ہوتی ہے مسجد بنا کر کھڑی کر دینا کافی نہیں کہ قبلہ صرف ملی آزادی کی صاف فضا میں نظر آسکتا ہے۔ غریب اور امیر کا ایک صف میں کھڑا ہو جانا کافی نہیں۔ قوم اور ملت کی معاشی حالت میں توازن پیدا کرنا بھی لازمی ہے۔ گھر میں وقت سے نماز پڑھ لینا کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے اگر شخصی زندگی میں کوئی ضبط اور نظام اور مقصد نہیں، نیت باندھنے سے پہلے اور سلام پھیرنے کے بعد نمازی کے دل پر ذاتی اغراض

کا ہجوم رہتا ہے اور وہ خلوص کے ساتھ صرف اپنی ہی سلامتی اور کامیابی کے لئے دعا مانگ سکتا ہے۔ جب تک جہاد کا حوصلہ دل میں نہ ہو اور زندگی میں اپنا رنگ نہ دکھلائے ہماری عبادات ادھوری رہ جاتی ہیں۔

جہاد کے لئے کافر کی شرط لگائی جائے تو وہ بے شک ایک فرض ثابت نہیں کی جا سکتی اس لئے کہ کفار مکہ کے نمونے اس وقت ہمیں بہت تلاش کرنے پڑیں گے لیکن اگر ہم یہ سوچیں کہ مسلمانوں کو پچھلے دو تین سو برس میں کس نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے اور کیسے، تو ہمیں فوراً معلوم ہو جائے گا کہ مسلمانوں کے اصل دشمن کون ہیں اور ہندوستان میں ہمارے مذہب اور ہماری ملت پر غلامی کا جو دھبہ ہے وہ کیسے مٹایا جا سکتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے دیکھئے تو۔ ہندوستان کو آزاد کرنا، اور بلا کسی شرط اور تحفظ حقوق کے آزاد کرنا ہمارا دینی فرض ہو جاتا ہے اور اگر ہم بے وقوف نہیں بننا چاہتے ہیں، تو ہمیں ہتھیار بھی وہی استعمال کرنا چاہئیں جو اس وقت کام آسکتے ہیں۔ ہمارا مقصد میدان میں پرا جما کر کھڑے ہونے سے پورا نہیں ہوگا بلکہ اتحاد اور یک جہتی پیدا کرنے سے۔ جان دینے سے نہیں بلکہ جان کھپانے سے، اس کا نام قومی خدمت یعنی قوم پر احسان کرنا کہئے تو یہ بہت مشکل ہوتا ہے اور اس سے طبیعت جلد اکتا جاتی ہے۔ اسے عبادت سمجھئے تو یہ عادت بن جاتا ہے، خود بخود ہموار ہتا ہے اور آدمی کی نظر دنیاوی کامیابی پر نہیں بلکہ عاقبت پر رکھ کر اس میں وہ عاقبت اندیشی اور انسانی فطرت کا لحاظ پیدا کر دیتا ہے جو اور کسی طرح حاصل نہیں ہوتا۔

لیکن دنیا نے آج کل ایسا رنگ اختیار کیا ہے کہ سیاسی آزادی جہاد کی تمہید نہیں تو اس کا پہلا باب ہی ہو سکتی ہے کہ سیاسی آزادی کے ساتھ ایسی معاشی غلامی ہونا بھی ممکن ہے جو آدمی کی آبرو کو خاک میں ملا دے، اور اسے اس لائق بھی نہ رکھے کہ وہ بازار میں اپنی محنت کیا اپنے آپ کو بیچ کر بھی دو کوڑی حاصل کر سکے۔ ایسا افلاس ممکن ہے جو انسانیت کو بالکل پامال کر دے۔ مختلف طبقوں اور ملتوں میں ایسی بیگانگی اور عداوت ممکن ہے جو کھلم کھلا خانہ جنگی

سے بھی بدتر ہو۔ ہمارے دشمن غیر ہی نہیں بلکہ مختلف طبقوں اور ملتوں کی غیریت بھی ہے اور اغراض کا ایسا اختلاف اور تصادم جو کہ آزادی کے مفہوم ہی کو اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے۔ تاریخ کو دیکھئے تو آزادی کے مطالبے کے ساتھ ہمیشہ ایک غرض لگی ہوتی ہے۔ آزادی کے جھنڈے کے نیچے ایک فوج بھی کھڑی ہوئی ہے۔ کبھی آزادی مذہبی جماعتوں کا مطالبہ تھی جو آزاد ہوئے بغیر اطمینان سے اپنے مذہب کی پیروی نہیں کرسکتی تھیں۔ کبھی وہ ایسے طبقوں کا نعرہ تھی جن کی نشوونما ریاست یا قدامت پسند طبقے روکے ہوئے تھے۔ اس نے بھیس جو بنایا وہ سیاسی تھا، لیکن تھی دراصل وہ کچھ اور۔ اس وقت اگر ہم یہ سمجھیں کہ آزادی کے معنی صرف یہ ہیں کہ انگریز ہندوستان سے چلے جائیں تو ہم آزادی کی بس ظاہری شکل دیکھیں گے۔ اور ظاہری شکل کے ساتھ ہمیشہ ڈھول کے اندر پول کا شبہ لگا رہتا ہے۔ ہمارے دلوں میں آزادی کے حوصلے کو ایک نئی زندگی تعمیر کرنے کا حوصلہ ہونا چاہئے اور زندگی ایک طبقے کے مفاد، کسی ایک خیال کے پرچار سے بہت زیادہ بڑی چیز ہے۔

اس وقت یہ ممکن ہے کہ ان لوگوں کو جو مظلوم ہیں یا اپنے حق سے محروم رکھے گئے ہیں ظلم اور زیادتی کا احساس دلا کر بیدار کیا جائے اور انھیں ان اغراض کی مخالفت ہی پر نہیں جس کی بدولت یہ ظلم ہوا بلکہ اس سارے نظام حیات کو جس نے یہ ظلم روا رکھا درہم برہم کرنے پر آمادہ کیا جائے یعنی مختلف طبقوں کی عداوت مذہب اور تہذیب کی بیخ کنی اور سماج کے اندر خانہ جنگی، وہ تمام مرحلے طے کئے جائیں جنکے بغیر آجکل انقلابی تحریک کا اصولاً صحیح اور عملاً کامیاب ہونا دشوار مانا جاتا ہے یہ بھی ممکن ہے کہ ہم روس کے تجربے سے فائدہ اٹھائیں۔ قومی سیرت اور مخصوص حالات کا گہرا مطالعہ کریں دنیا کا رنگ دیکھتے رہیں اور زندگی کی ایسی اصلاح کریں جو چاہے کسی خاص فلسفے کے مطابق نہ ہو مگر ہمارے دیس اور دیس والوں کو پورا پورا فیض پہنچائے۔ یعنی اس وقت جو ظلم ہو رہا ہے اسے بند کرنے، جو اندھیرا پھیلا ہے اسے دور کرنے، جو مردنی چھائی ہے اس میں نئے حوصلوں کی جان ڈالنے کے لئے دو صورتیں ممکن ہیں، عداوت اور عبادت، اور اگر ہماری عبادت ثواب کمانے تک محدود رہی تو عداوت بلا روک ٹوک اپنا کام کرے گی۔

غزل کی حمایت

اعتراضات اور جوابات

ذیل کا مضمون حکیم آزاد انصاری صاحب

کے مجموعہ کلام کے مقدمے کا ایک حصہ ہے

جو ہنوز زیرِ طبع ہے۔

بعض کورِ مذاق اپنی زبان اور اپنے شعر و ادب کے دشمن کچھ عرصہ سے اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ غزل کا وجود صفحہ ہستی سے مٹا ڈالا جائے۔ یہ نادان اپنی غزل کی دشمنی کے ثبوت میں حسب ذیل دلائل پیش کرتے ہیں۔ (۱) "غزل کا معشوق مذکر ہوتا ہے، اور یہ ایک شرمناک امر ہے۔" (۲) "غزل آج تک انہیں مضامین و مطالب کی حامل چلی آرہی ہے جو صدیوں پہلے ظاہر کئے جا چکے ہیں، اس میں خیالات نو کی مطلق گنجائش نہیں۔" (۳) "غزل کے معشوق کا دہن موہوم ہوتا ہے، کمر معدوم ہوتی ہے، قد سرو و شمشاد سے بھی دو ہاتھ اونچا ہوتا ہے، گردن گردنِ صراحی سے بھی دو تین بالشت لمبی ہوتی ہے، اس کی آنکھیں گلہائے نرگس کے مثل، اس کے بال سنبل کے مانند، اس کی زبان برگ سوسن کے مشابہ ہوتی ہے۔ یہ معشوق ایک ناممکنات کا پتلا ہوتا ہے، اگر کسی طرح مجسم کر دیا جائے تو آدمی ڈر ڈر کے بھاگنے لگیں۔" (۴) "غزل بوالہوسی اور پست خیالی سکھاتی ہے۔" (۵) "غزل کا ہر شعر جداگانہ اور متضاد مضمون کا حامل ہوتا ہے، اس کے اشعار میں کوئی ہم آہنگی یا تسلسل نہیں ہوتا، وہ بالکل اک چوں چوں کا مربہ ہوتی ہے، جو ذہنِ انسانی کو انتشار میں مبتلا کر دیتی ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ واحد دماغ میں بیک وقت اتنے مختلف اور متضاد خیالات پیدا ہو سکیں۔" (۶) "تمام اصنافِ سخن میں تو مطالب و معانی کے لئے الفاظ تلاش کرنے پڑتے ہیں، مگر غزل میں اس کے برخلاف الفاظ کے لئے مطالب و معانی کی جستجو کی جاتی ہے اور یہ ایک بالکل غیر فطری طریقہ ہے۔" یہ دلائل بظاہر تو نہایت پرزور اور قطعی مسکت نظر آتی ہیں، مگر درحقیقت بالکل بے وزن، بے حد

فریب دہ اور محض لچر پوچ ہیں اور ان کی پیداوار نتیجہ ہیں صرف مغرب زدگی کا۔ بالترتیب جوابات ملاحظہ ہوں

(۱) "غزل کا معشوق مذکر ہوتا ہے، اور یہ ایک شرمناک امر ہے"۔ غزل کا معشوق مذکر نہیں ہوتا بلکہ اس میں افعال و صفات مذکر استعمال کئے جاتے ہیں، یہی بالکل درست ہے اور ایسا ہی ہونا چاہئے اس کی وجوہ حسب ذیل ہیں:۔

اوّل مرد صنف قوی ہے اور عورت صنفِ نازک، اور ہر امر میں صنفِ قوی کا لحاظ زیادہ رکھا جاتا ہے۔ اگر مرد و عورت کا جدا جدا ذکر کریں گے تو یوں کہیں گے" اتنے مرد آئے، اتنی عورتیں آئیں"۔ لیکن جب مخلوط و مشترک ذکر منظور ہوگا تو یوں کہنا پڑے گا" اتنے مرد عورت آئے۔ یا اتنے عورت مرد آئے"۔ یعنی لفظِ عورت خواہ مقدم ہو یا موخر فعل دونوں صورتوں میں مذکر ہی رہے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ افعال و صفات مذکر کو افعال و صفاتِ مونث پر ترجیح ہے اور یہ دونوں صنفوں کے لئے استعمال کئے جاسکتے ہیں۔

دوم جب کوئی ایسا عام حکم دیا جاتا ہے جو مرد و عورت دونوں کو حاوی ہو اس وقت بھی ہمیشہ افعال و صفات مذکر ہی استعمال کئے جاتے ہیں۔ مثلاً "جو شخص اس رستے سے گذرے گا اس کو دس روپے جرمانے کی سزا دی جائے گی"۔ یہاں بھی فعل مذکر ہی استعمال کیا گیا ہے۔ مگر صرف اس بنا پر کہ اس حکم میں فعل مونث "گذرے گی" استعمال نہیں کیا گیا عورت کو اس حکم کے اثر سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جاسکتا لیکن اگر یوں کہا جاتا "جو اس رستے سے گذرے گی اُس کو دس روپے جرمانے کی سزا دی جائے گی"۔ تو بالیقین مرد اس حکم کے دائرہ اثر سے خارج ہوتا۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ افعال و صفات مذکر کو ترجیح ہے اور ان کا دائرہ اثر مرد عورت دونوں کو محیط ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ہر ملک کے قوانینِ حکومت اور ہر مذہب کے قوانین شرع میں تمام و کمال افعال و صفات مذکر ہی استعمال کئے گئے ہیں، جو مرد عورت دونوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ دیکھو مقدمہ شعر و شاعری مصنفہ علامہ حالیؒ۔

سوم اگر غزل میں افعال و صفات مونث لائے جانے لگیں تو صرف عورت بہ حیثیت معشوق باقی رہ جائے گی اور مرد اس کے دائرہ سے خارج ہو جائے گا، حالانکہ کبھی مرد، عاشق ہوتا ہے اور کبھی عورت

اور غزل ٹھہری مرد و عورت دونوں کے معاملاتِ عشق کے اظہار کا ذریعہ اس لئے غزل میں افعال و صفات مذکر ہی کا استعمال زیادہ انسب ہے کہ وہ اِن دونوں صنفوں کو حاوی ہے۔ یہی سبب ہے کہ عورتیں بھی جب غزل کہتی ہیں تو وہ بھی افعال و صفات مذکر ہی کو ترجیح دیتی ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ہندی میں شاعری صنفِ نازک کی زبان سے کی جاتی ہے اور اس میں افعال و صفات مؤنث استعمال کئے جاتے ہیں، اور مرد و عورت دونوں کو حاوی ہوتے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ "جناب آپ کے اس استدلال کو افعال و صفات مذکر کی حد تک تو قبول کیا جا سکتا ہے مگر ستم تو یہ ہے کہ غزل میں "سبزہ خط" "چہرا" "دستار" "ترک بچہ" اور "ہندو بچہ" جیسے مخصوص بہ صنف قوی الفاظ بھی تو پائے جاتے ہیں، جس سے قطعی یہ ثابت ہوتا ہے کہ غزل کا معشوق مذکر ہی ہوتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت! آپ اسے مرد کا مرد کے ساتھ عشق جتانا کیوں کہتے ہیں، ممکن ہے ان میں عورت کے جذباتِ عشق ظاہر کئے گئے ہوں، اب اگر یہ کہیں گے کہ "جناب! یہ اشعار تو اکثر مردوں کے کہے ہوئے ہیں" تو میں کہوں گا کہ بے شک یہ مردوں کے کہے ہوئے ہیں۔ مگر کیا مرد عورت کے جذباتِ عشق ظاہر نہیں کر سکتا؟ آخر کیوں نہیں کر سکتا۔ کیا عورت مرد پر عاشق نہیں ہوتی اگر مرد نے عورت کے جذباتِ عشق بھی حوالہ قلم کر دئے تو اس نے کیا گناہ کیا۔ اگر یہ کوئی عیب ہے تو اس کو ہر حالت میں عیب ہونا چاہئے۔ یہ کیا ستم ہے کہ مرد ہندی شاعری میں عورت کے جذباتِ عشق ظاہر کرے تو وہ درست مگر غزل میں نادرست۔ اور پھر آپ اس عیب کو اپنی دیگر اصنافِ سخن مثنوی اور نظم وغیرہ میں تو جائز رکھیں اور بیچاری غزل کو اس بنا پر کشتنی و گردن زدنی قرار دے دیں۔ اور آخر مردانہ حسن بھی تو آخر حسن ہوتا ہے، وہ بھی دلوں کو لبھاتا ہے، وہ بھی نظروں کو دعوتِ نظارہ دیتا ہے، اس میں بھی ایک خاص کشش ہوتی ہے، وہ بھی تعریف کئے جانے کے قابل ہوتا ہے۔ جب یہ درست ہے اور درحقیقت درست ہے تو پھر ایسے اشعار کو بُرے معنی پہنانے کس کا قصور ہے۔ آپ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ ایک مرد نے ایک مرد کے حسن کی تعریف کر دی ہے اور بس۔

اب ایک آخری صورت اور باقی رہ گئی ہے، اور وہ یہ کہ اگر مرد جذباتِ عشق ظاہر کرے تو اس کو افعال وصفات مونث استعمال کرنے چاہئیں، اور اگر عورت ظاہر کرے تو اس کو افعال صفات مذکر البتہ یہ درست بھی ہے اور مناسب بھی، واقعی ایسا ہی ہونا چاہئے، مگر غزل میں نہیں بلکہ دیگر اصناف سخن مثنوی اور نظم وغیرہ میں۔ اس کی وجہ وجہ چہارم میں ملاحظہ ہو۔

چہارم۔ دنیا بھر جانتی ہے کہ متغزلین کی شاعری مجازی شاعری تک محدود نہیں ہوتی، ان کو حقیقی شاعری یعنی متصوفانہ شاعری بھی کرنی پڑتی ہے، اور معشوق حقیقی مذکر ہے، اس کو مونث نہیں بنایا جاسکتا اس لئے غزل میں افعال وصفات مذکر کا استعمال صرف بہتر ومناسب ہی نہیں بلکہ ضروری وناگزیر بھی ہے۔

(۲) غزل آج تک انھیں مضامین ومطالب کی حامل چلی آرہی ہے جو صدیوں پہلے ظاہر کئے جاچکے ہیں، اس میں خیالات نو کی مطلق گنجائش نہیں" یہ غزل دشمن اصحاب شاید واقف نہیں۔ اگر واقف ہیں تو بالیقین اس کھلی حقیقت کے اعتراف سے پہلو تہی کرتے ہیں کہ صنف غزل مخصوص ہے صرف معاملات حسن وعشق کے اظہار کے لئے۔ یہ جذبات واحساسات تمام دوسرے جذبات واحساسات سے محبوب ومرغوب تر جذبات واحساسات ہیں۔ یہ کبھی پہلے چھپائے جاسکے ہیں، نہ آئندہ چھپائے جاسکیں گے، یہ ہمیشہ ظاہر کئے جاتے رہے ہیں اور ہمیشہ ظاہر کئے جاتے رہیں گے۔ یہ اس قدر قوی ہیں کہ کوئی مخالف ومزاحم قوت ان کے اظہار کو روک نہیں سکتی۔ جس طرح زندگی کے لئے چلنا پھرنا کھانا پینا اور سانس لینا ضروری ہے اسی طرح ان کا اظہار بھی ضروری ہے۔ یہ جذبات واحساسات محدود ہیں، غیر محدود نہیں، ان کی ہمیشہ تکرار ہوتی رہی ہے، اور ہمیشہ ہوتی رہے گی۔ آخر بیچارے غزل گو حضرات نئے جذبات واحساسات لائیں کہاں سے، اک بڑے سے بڑا متغزل بھی صرف اتنا ہی کرسکتا ہے کہ ان جذبات واحساسات کو اپنی قوت تخیلہ اور اپنے مخصوص پیرایۂ بیان سے مدد لے کر اک نئی، دل کش، انوکھی اور حسین تر صورت میں پیش کردے اور بس۔ اور اسی کا نام شاعری کمال شاعری ہے۔ بہ فرض محال اگر دشمنان غزل غزل کے مٹانے میں کامیاب بھی ہوجائیں، اور

غزل صفحۂ شاعری سے محو بھی کر دی جائے تو بہرحال ان جذبات و احساسات کے اظہار کے لئے کوئی دوسری صنفِ شعر تلاش کرنی پڑے گی۔ جب ایسا ہے اور ضرور ایسا ہی ہے تو پھر غریب غزل ہی نے کیا قصور کیا ہے، جو آپ اس کو حلال کروانا چاہتے ہیں۔

اب رہا اس اعتراض کا دوسرا جزو کہ غزل میں خیالاتِ نو کی گنجائش نہیں، یہ بھی ایک بڑی حد تک غلط ہے۔ اگر کوئی غزل میں یہ گنجائش پیدا کرنا چاہے تو بالیقین پیدا کی جا سکتی ہے۔ اور بلند خیال اور وسیع النظر متغزلین یہ گنجائش پیدا بھی کرتے رہتے ہیں۔ مگر یہ گنجائش اسی حد تک پیدا کی جا سکتی ہے جس حد تک کہ غزل غزل باقی رہے لیکن دشمنانِ غزل تو غزل کا وجود ہی باقی رکھنا نہیں چاہتے اس سبب سے تو لفظ "گنجائش" فقط مہمل ہو کے رہ جاتا ہے۔

(۳) "غزل کے معشوق کا دہن موہوم ہوتا ہے"۔ قد سرو شمشاد سے بھی دو ہاتھ اونچا ہوتا ہے گردن گردنِ صراحی سے بھی دو چار بالشت لمبی ہوتی ہے۔ اس کی آنکھیں گُلہائے نرگس کا سا، اس کے بال سنبل کے مشابہ اور اس کی زبان برگِ سوسن کے مانند ہوتی ہے، یہ معشوق ایک نا ممکنات کا پتلا ہوتا ہے، اگر اس کو کسی طرح مجسم کر دیا جائے تو آدمی ڈر ڈر کے بھاگنے لگیں"۔

دشمنانِ غزل کا یہ اعتراض بھی چنداں قابلِ اعتنا نہیں۔ اصلیت صرف اتنی ہے، کہ چھوٹا دہانہ (دہن) پتلی کمر، دراز قد اور لمبی گردن خوشنما معلوم ہوتے ہیں، اور اگر ایک حسین میں حسن کے ساتھ یہ صفات بھی پائی جائیں تو اس کا حُسن زیادہ دلفریب اور زیادہ جاذبِ نظر ہو جاتا ہے۔ اب رہ گئے سرو شمشاد، نرگس، سنبل و سوسن۔ یہ محض تشبیہی الفاظ و اشیا ہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ سرو شمشاد اپنے قد و قامت کے لحاظ سے خوش نما نہیں ہوتے۔ نرگس کے پھول میں چشمِ معشوق کی سی مستی نہیں پائی جاتی، سنبل کسی حسین کے بکھرے بالوں کی یاد نہیں دلاتی۔ برگِ سوسن کسی کی زبانِ حسین سے مشابہ نہیں ہوتی، مختصر یہ ہے کہ یہ سب تشبیہی الفاظ اور تشبیہی اشیا ہیں۔ ان کا استعمال غزل میں محض تشبیہاً کیا جاتا ہے نہ کہ بطور اصل و حقیقت۔ مگر دشمنانِ غزل ہیں کہ ان تشبیہات کا اک خوفناک مجسمہ بنا کر ہمارے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہم غزل سے نفور ہو جائیں۔ اتنی بات ضرور ہے کہ بعض مبالغہ پسند

غزل گو اصحاب نے ان تشبیہات کا استعمال حد سے گذرے ہوئے مبالغہ کے ساتھ کیا ہے اور مخالفین غزل کو اسی سے غزل کے معشوق کی ایسی بھونڈی تصویر بنانے کا سامان ...... ہاتھ آیا ہے۔ مگر یہ قصور ان مبالغہ پسند غزل گویوں کا ہے نہ کہ غزل کا۔

(۴) غزل پست خیالی اور بوالہوسی سکھاتی، بلکہ پست خیال غزل گو یہ گندگی پھیلاتے ہیں، کیونکہ غزل گویوں میں اکثریت پست خیال شعرا کی ہے۔ مگر یہ غزل گویوں ہی پر کیا منحصر ہے، ہر صنف شعر میں پست خیال شعرا کی کثرت ہوا کرتی ہے، اور وہ اپنے پست خیالات اور شرمناک جذبات کی اشاعت سے ملک کی ادبی فضا کو گندہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ شعرا حقیقت میں شاعر نہیں ہوتے بلکہ متشاعر ہوتے ہیں۔ یہ ہر ملک، ہر قوم اور ہر دور میں ہوتے ہیں۔ یہ پہلے بھی تھے، اور اب بھی موجود ہیں اگر یہ سچ ہے کہ ہر شے اور ہر کیفیت اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے تو شعرا کے ساتھ متشاعرین کا وجود بھی اسی طرح لازم و ضروری ہے جس طرح نور کے ساتھ ظلمت کا وجود، اگر متشاعر نہ ہوں تو حقیقی شاعر کی تمیز ناممکن ہو جائے۔ متشاعرین کی شاعری ہمیشہ نظر انداز کی جاتی رہی ہے، اور اسی کو اب بھی نظر انداز کر دینا چاہیئے۔ یہ خود کبھی باقی رہے ہیں نہ ان کی شاعری باقی رہی ہے، نہ یہ آئندہ باقی رہیں گے، نہ ان کی شاعری باقی رہے گی۔

متشاعرین کے برخلاف حقیقی شعرا ہر زمانے میں کم ہوتے ہیں، اور بہت کم ہوتے ہیں۔ یہ پہلے بھی کم ہوتے تھے اور اب بھی کم ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ یہ پیغمبروں کی طرح عند الضرورت کبھی کبھی مبعوث ہوا کرتے ہیں، نہ یہ خود پست ہوتے ہیں اور نہ ان کی شاعری پست ہوتی ہے، یہ بلند فطرت، بلند خیال اور بلند نظر ہوتے ہیں۔ یہ جب آتے ہیں تو اپنی قوم، اپنے ملک اور اپنے شعر و ادب کے لئے حیاتِ نو کا پیغام لے کر آتے ہیں۔ اور جب جاتے ہیں تو ان سب کو بقائے دوام عطا کر جاتے ہیں، ایسے بلند فطرت شعرا کو پست خیالی اور بوالہوسی کی اشاعت کا ذمہ دار قرار دینا چاند سورج کو تاریکی و ظلمت کا ذمہ دار ٹھہرانے سے ہرگز کم نہیں۔

زمانۂ حال کے بلند فطرت اور بلند خیال شعرا کی فہرست حسب ذیل ہے۔ جناب بیخود دہلوی

حضرت جگر مراد آبادی - مولانا وحشی شاہجہاں پوری، مولانا حسرت موہانی - جناب آرزو لکھنوی، جناب صفی لکھنوی - جناب فانی بدایونی - جناب جوش ملیح آبادی - جناب نجم آفندی اکبر آبادی - جناب سیماب اکبر آبادی - جناب امجد حیدر آبادی - جناب ضامن کنتوری - جناب چکبست مرحوم - علامہ کیفی دہلوی - جناب پنڈت امر ناتھ ساحر دہلوی - جناب مولانا ظفر علی خاں صاحب - علامہ سر اقبال - جناب سالک مدیر انقلاب لاہور (اگر کسی ضروری صاحب کمال کا نام بوجہ لاعلمی یا سہواً اندراج سے رہ گیا ہو تو خواستگار معافی ہوں)

ان میں بعض صرف غزل گو حضرات ہیں اور بعض ناظم (نظم کہنے والے) بعض ایسے جامع کمال ہیں کہ وہ غزل گو بھی ہیں اور ناظم بھی، اور بعض ایسے وسیع نظر اور رفیع الخیال افراد ہیں جن کی شاعری غزلیاتی یا منظوماتی شاعری کے دائرے کو توڑ کر حکیمانہ و مصلحانہ شاعری کی حدود میں داخل ہو چکی ہے - ہمارا خیال ہے کہ ان غیر معمولی شاعرانہ دل و دماغ رکھنے والی صاحب کمال ہستیوں میں سے علامہ سر اقبال حضرت جوش ملیح آبادی، حضرت فانی بدایونی، مولانا ظفر علی خاں صاحب اور علامہ سیماب اکبر آبادی کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں -

اگر آپ مندرجہ بالا فہرست پر تھوڑا سا بھی غور کریں گے تو اس میں آپ کو اکثریت متغزلین ہی کی نظر آئے گی - للہ ہم کو بتایا جائے کہ ان صاحب کمال ہستیوں میں سے خواہ وہ متغزل ہوں یا غیر متغزل، کس کی شاعری پر شبہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ بوالہوسی و پست خیالی سکھانے والی ہے - اب اگر آپ ان کو چھوڑ کر یا ان میں شامل کر کے ککو، نککو، بدھو یا شبراتی وغیرہ جیسے وقیع شعرا کے نام پیش کرنے کی جرأت کریں گے تو پھر آپ کو "جواب جاہلاں باشد خموشی" - سننے کو تیار رہنا چاہئے - بہر حال غزل کی بلندی و پستی بھی اور اصناف سخن کی طرح کہنے والے پر موقوف ہے اگر کہنے والا پست خیال ہے تو وہ ضرور پست ہوگی، اور بلند خیال ہے تو وہ بالیقین بلند ہوگی یہ اگر سچ ہے اور درحقیقت سچ ہے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پست خیالی و بوالہوسی کی اشاعت کے ذمہ دار ہیں تو وہ ہمارے ملک کے متشاعر ہیں، یا پھر وہ مدیران رسائل و جرائد جو اپنی سنہری

رو پہلی مصلحتوں کی بنا، پر ان متشاعرین کا کلام شایع کرتے رہتے ہیں۔

(۵) "غزل کا ہر شعر جداگانہ خیال اور جذبے کا حامل ہوتا ہے، اس کے اشعار میں کوئی ربط، ہم آہنگی، یا تسلسل نہیں ہوتا۔ وہ بالکل ایک چوں چوں کا مربہ ہوتی ہے، خود ہی انسان کو انتشار میں مبتلا کر دیتی ہے، یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک واحد دماغ میں بہ یک وقت اس قدر مختلف اور متضاد خیالات پیدا ہو سکیں"۔ اس اعتراض کے تین جز ہیں۔ پہلا جز یہ ہے کہ غزل کا ہر شعر جداگانہ خیال یا جذبے کا حامل ہوتا ہے، اس کے اشعار میں کوئی ربط و ہم آہنگی یا تسلسل نہیں ہوتا۔" یہ بالکل درست ہے کہ عموماً غزل کا ہر شعر جداگانہ خیال کا حامل ہوتا۔ مگر یہ بالکل غلط ہے کہ اس میں کوئی ربط و ہم آہنگی یا تسلسل نہیں ہوتا۔ مسلسل غزلوں کی حد تک تو جو فارسی میں زیادہ اور اردو میں نسبتاً کم پائی جاتی ہیں، شاید غزل دشمن حضرات بھی ربط و ہم آہنگی اور تسلسل کے قائل ہوں، رہ گئیں غیر مسلسل غزلیں۔ اگر غائر نظر سے دیکھا جائے اور ہٹ دھرمی سے کام نہ لیا جائے تو وہ بھی ربط و ہم آہنگی یا تسلسل سے معرا نہیں ہوتیں، کیونکہ غزل کا ہر شعر بجائے خود ایک مختصر نظم ہوتا ہے، اور ایسی نظم ہوتا ہے کہ اگر وہ مناسب الفاظ میں پوری قوت سے ادا ہو جائے تو ہزار طول و طویل نظمیں مل کر بھی اس ایک شعر کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ آخر نظم گو حضرات ہی کیا تیر مارتے ہیں۔ یہی نا کہ ایک مفرد خیال کو دس پندرہ یا بیس پچیس اشعار میں پھیلا کر ایک کافی حد تک شرح و بسط سے بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر غزل گو شخص اسی پھیلے ہوئے خیال کو سمیٹ کر اور اپنے مخصوص متغزلانہ اشاروں، کنایوں، اور تلمیحات سے کام لے کر صرف ایک شعر میں ادا کر دیتا ہے جس کا ہر اشارہ یا کنایہ ہزار داستان در آغوش ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی پھر اس سمٹے ہوئے خیال کو دس بیس اشعار میں پھیلا کر نظم کے قالب میں ڈھالے گا (جیسا کہ اکثر آج کل کے نظم گو حضرات کرتے رہتے ہیں) تو یقیناً طاقت تقسیم ہو جائے گی اور جس حد تک طاقت تقسیم ہو جائے گی اسی حد تک اس کا مرتبہ شعریت بھی پست ہو جائے گا۔ یہ سچ ہے کہ آج کل زیادہ سے زیادہ بیس پچیس برس سے) نظم کا لفظ بہ اتباع مغرب جس معنی میں مستعمل ہو رہا ہے اس معنی میں ہمارے ہاں نظم کا وجود نہ تھا، مگر یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ہماری شاعری میں سرے سے نظم کا وجود ہی نہ تھا۔ تھا اور ضرور تھا۔ مگر دوسری صورتوں میں اور ان صورتوں کو نظم کے نام سے موسوم

نہیں کیا جاتا تھا، فارسی زبان میں زیادہ اور اُردو زبان میں کم اکثر مسلسل غزلیں پائی جاتی ہیں، اور مسلسل غزلیں بھی نظم ہی کی صنف میں داخل ہیں، اگرچہ غیر مسلسل غزلیات کا ہر شعر جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، بجائے خود ایک مختصر و مکمل نظم ہوتا ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ ان کے اشعار میں اوّل سے لے کر آخر تک یعنی از مطلع تا مقطع بالاکثر تسلسل نہیں پایا جاتا، اور پایا بھی نہ جانا چاہئے۔ کیوں کہ صنفِ غزل مسلسل اور طول طویل خیالات ادا کرنے کے لئے ایجاد ہی نہیں کی گئی۔ وہ وضع کی گئی ہے صرف مفرد یا مرکب خیالات کے ادا کرنے کے لئے بے حد ایجاز و اختصار کے ساتھ مسلسل اور طول طویل خیالات ادا کرنے کے لئے ہماری شاعری میں دوسری ایک درجن کے قریب اصناف موجود ہیں جن کی فہرست حسب ذیل ہے۔

رباعی، قطعہ، مثلث، ربع، مخمس، مسدس، مثمن، ترکیب بند، ترجیع بند، مستزاد، مثنوی۔

ان میں سے رباعی غزل کے بعد دوسری دلچسپ و کارآمد صنف ہے، جو غزل ہی کی طرح ایجاز و اختصار کے لئے وضع کی گئی ہے، فرق صرف اسقدر ہے کہ رباعی میں متغزلانہ افکار و انداز بیان کی کوئی قید نہیں، اور اس میں غزل کے برخلاف ایک شعر کی جگہ دو شعروں میں اپنے خیالات کو تسلسل کے ساتھ نظم کرنے کی آزادی بھی حاصل ہے، غزل اور رباعی کے بعد تیسری صنف قطعہ ہے۔ یہ صنف ایجاز و اختصار اور شرح و بسط دونوں کو مشترک ہے، کیونکہ قطعہ رباعی کی طرح کم سے کم دو شعر تک محدود ہے اور زیادہ کے لئے اگر قافیہ تنگی نہ کرے تو اشعار کی کوئی تعداد مقرر نہیں، یعنی یہ صنف رباعی کی طرح ایجاز و اختصار کے کام بھی آسکتی ہے اور نظم کی طرح تسلسل اور شرح و بسط کے بھی۔ ان تینوں صنفوں کے علاوہ باقی جس قدر صنف ہیں وہ سب کی سب مسلسل خیالات ربط و ہم آہنگی کے ساتھ ادا کرنے کے لئے ایجاد کی گئی ہیں۔ ان میں سے خصوصاً مثنوی تو ہماری شاعری میں وہ ہمہ گیر و کارآمد صنف ہے جس میں ہر قسم کے بڑے سے بڑے اور طویل سے طویل خیالات بلکہ افسانوں، داستانوں اور تاریخوں تک کو نظم کا جامہ پہنایا جاسکتا ہے۔ اور ایسی سب اصناف سخن جن میں طویل یا حقیر خیالات و واقعات تسلسل کے ساتھ

منظوم کئے جاتے ہیں یا کئے جا سکتے یقیناً نظم ہی کہلانے کی مستحق ہیں۔ اس بحث سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ ہم نے مذکورہ بالا تمام اصنافِ سخن میں سے اگر کوئی صنف اپنے خیالات کو پورے ایجاز و اختصار کے ساتھ بیان کرنے کے لئے وضع کی ہے تو وہ صرف ایک غزل ہے، اگرچہ رباعی اور قطعہ سے بھی ایک حد تک یہ کام لیا جا سکتا ہے مگر ان کا درجہ ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ ماحصل یہ ہے کہ جب اتنی اصناف ہماری شاعری میں مسلسل اور طول طویل خیالات ادا کرنے کے لئے موجود ہیں اور ہم نے ان میں سے صرف ایک غزل کو ایجاز و اختصار کے لئے چن لیا ہے، جو اس کے لئے ہر طرح موزوں اور مناسب بھی ہے، اور حالت یہ ہے کہ اس ضروری صنف کا کوئی بُرا بھلا بدل بھی پیش نہیں کیا جاتا تو پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ غزل کو مٹا ڈالنے کے درپے ہو جانا کہاں کی عقلمندی اور کون سی دانائی اور مصلحت پر مبنی ہے۔

ہم مانتے ہیں کہ کسی خیال کو شرح و بسط کے ساتھ مسلسل ادا کرنے میں جزئیات کا احاطہ کرنا پڑتا ہے۔ اور جزئیات کا احاطہ کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ایجاز و اختصار کا مرتبہ کہیں بلند ہے۔ اور پھر ایجاز و اختصار بھی ایسا ایجاز و اختصار جو جامع و مانع بھی ہو اور ماقل و دل بھی اور اسی قسم کے ایجاز و اختصار کا غزل کے سوا کسی دوسری صنفِ شعر میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے غزل کا مٹا ڈالنا اپنی شاعری کی ایک بے حد دلچسپ اور ضروری صنف ایجاز و اختصار کا مٹا ڈالنا ہے جس کا بدل ملنا مشکل ہے۔

اس اعتراض کا دوسرا جزیہ ہے کہ "چونکہ غزل کے اشعار میں باہم کوئی تسلسل یا ربط و ہم آہنگی نہیں ہوتی لہٰذا وہ بالکل ایک چوں چوں کا مربہ ہوتی ہے، جو ذہنِ انسانی کو انتشار میں مبتلا کر دیتی ہے"۔ ماتم کرنے کی جگہ ہے کہ مغرب زدگی نے مخالفینِ غزل کے ذوقِ صحیح اور وجدانِ سلیم کو اس درجہ مسخ و مفلوج کر دیا ہے کہ طعام و لباس سے لے کر شعر و ادب تک ہر وہ چیز جو ایشیا کی خصوصیات کی حامل ہے خواہ وہ ہماری تہذیب اور ہمارے مذاق کے نقطہ نظر سے کتنی ہی صحیح، دلچسپ اور مفید و اہم کیوں نہ ہو مگر مغربی ذوق اس پر مہرِ تصدیق ثبت نہیں کرتا تو وہ ان دشمنانِ وطن کے نزدیک صفحہ ہستی سے بالکل

مٹا ڈالنے کے قابل ہے۔ خدا جانے یہ حضرات غزل کو جو ایک خالص ایشیائی چیز ہے، مغربی عینک لگا کر کیوں دیکھتے ہیں۔ آخر اس نظر سے کیوں نہیں دیکھتے کہ وہ ایک مجموعہ ہوتی ہے۔ چند مختلف المضامین نظموں کا جو ایک ہی بحر اور ایک ہی ردیف وقافیہ میں لکھی جاتی ہے، اور جس کا ہر شعر بجائے خود ایک مختصر اور مکمل نظم ہوتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر یہی حضرات اپنی آنکھوں سے مغربی عینک اتار کر غزل کو ہماری بتائی نظر سے جو ہماری فطری اور حقیقی نظر ہے دیکھنے کی تکلیف گوارہ فرمائیں گے تو پھر غزل ان کو نہ تو چوں چوں کا مربہ دکھائی دے گی اور نہ کسی قسم کے ذہنی انتشار میں مبتلا کرے گی، بلکہ اس کے برخلاف غزل میں وہ عجیب عجیب خصوصیات، اور ایسی ایسی نا قابل انکار خوبیاں نظر آئیں گی جو مغربی شاعری میں ہزاروں قسم کی جدید العصر ذہنی ترقیات کے باوجود آج تک بھی مفقود و معدوم ہیں۔

اس اعتراض کا تیسرا جز یہ ہے کہ یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک واحد دماغ میں بیک وقت اسقدر مختلف اور متضاد خیالات سما سکیں"۔ اس کے دو جواب ہو سکتے ہیں جنھیں درج ذیل کیا جاتا ہے۔

اول تو یہی غلط ہے کہ "ایک دماغ میں بہ یک وقت دو یا دو سے زیادہ متضاد یا غیر متضاد خیال پیدا ہونے ناممکن ہیں"۔ خاص خاص حالتوں میں اکثر مشاہدے میں آیا ہوگا کہ انسان وقت واحد میں رو بھی رہا ہے اور ہنس بھی رہا ہے، مغموم بھی ہے اور اپنے غم پر خوش و قانع بھی، شکووں سے معمور بھی ہے اور شکر سے تر زبان بھی، مضطرب بھی ہے اور سکون خاطر سے لذت یاب بھی، پریشان بھی ہے اور اپنی پریشانی کا مدح خواں بھی، مانوس بھی ہے اور مایوس بھی، بیدل بھی ہے اور ساعی بھی۔ ایسے واقعات کی سینکڑوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ مگر ہم یہاں صرف دو مثالوں پر اکتفا کریں گے۔ اکثر دیکھا ہوگا کہ جب بچھڑے ہوئے دو عزیز یا دو دلی دوست یا عاشق و معشوق مدت کے بعد ملتے ہیں تو بے اختیار باہم لپٹ جاتے ہیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے ہیں اور جب تک دلوں کی بھڑاس اچھی طرح نہیں نکل جاتی ان کے لپٹ لپٹ کے رونے رُلانے کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس وقت ان کے دلوں میں خوشی و غم کے دوگونہ جذبات وخیالات موجزن نہیں ہوتے اور یہی خوشی و غم کی وہ ملی جلی کیفیت ہے جو عام طور سے "گریہ مسرت" کے دلچسپ اور معنی خیز نام سے مشہور ہے۔ یہ مثال تو

کسی انسانی دل و دماغ میں بہ یک وقت صرف دو متضاد یا غیر متضاد خیالات و جذبات سما سکنے کی مثال تھی اب ہم ایک ایسا شعر پیش کرنا چاہتے ہیں جس سے ایک انسانی دل و دماغ میں بہ یک وقت چار یا چار سے زیادہ مخالف و متضاد خیالات و جذبات کے مستولی ہونے کا ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ یہ شعر ہمارا ہی ہے۔ خدا کے لئے اس کو یہ سمجھ کر یا کہہ کر رد نہ کر دیجئے کہ چونکہ یہ تیرا لکھا ہوا ہے اس لئے ناقابلِ قبول ہے۔

بیدل بھی ہوں، شاداں بھی، شاکی بھی ہوں، نازاں بھی
جو داغ دیا ہوگا، دلچسپ دیا ہوگا

عاشق معشوق سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ میں تمہارے سلوکوں سے بیدل (مایوس و غمگین) بھی ہوں اور شاداں (پُر امید و مسرور) بھی۔ شاکی (شکایت مند اور فریادی) بھی ہوں اور نازاں (مفتخر، شکر گذار اور احسان مند) بھی۔ کیونکہ تم نے مجھے آج تک جتنے داغ بھی دئیے ہیں سب دلچسپ دئیے ہیں۔" ظاہر ہے کہ سب داغ تکلیف دہ ہوتے ہیں اور ان سے اذیت پا کے مایوس و غمگین اور شاکی، فریادی ہونا قدرتی بات ہے۔ مگر چونکہ معشوق نے یہ داغ دورانِ محبت میں دئیے ہیں اور دورانِ محبت میں معشوق کے ہاتھوں پہنچی ہوئی تکلیف بھی راحت سے زیادہ قابلِ قدر ہوتی ہے۔ پھر دلچسپ تکلیف تو اور زیادہ قابلِ قدر ہونی چاہئے۔ اس لئے عاشق خوش بھی ہے اور پُر امید بھی، اور نازاں بھی ہے اور شکر گذار و احسان مند بھی۔ اس حالت میں وہ جن متضاد یا غیر متضاد خیالات و جذبات سے متاثر نظر آ رہا ہے وہ حسبِ ذیل ہیں۔ (۱) خوشی و غم (۲) امید و بیم (۳) تکلیف و راحت (۴) شکر و شکایت (۵) مدح و ذم۔ (۶) بے صبری اور صبر و رضا (۷) احسان مندی و نا احسان مندی وغیرہ۔ ایسی صریح مثالوں کی موجودگی میں کوئی احمق سے احمق بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ کسی انسانی دل و دماغ میں بیک وقت دو یا دو سے متضاد یا غیر متضاد خیالات و جذبات نہیں سما سکتے۔ اگر نہیں سما سکتے تو فرمائیے اتنے جذبات و خیالات کا حامل شعر بہ یک وقت کیونکر موزوں ہو گیا۔

دوئم یہ کہ غزل صرف ایک سانس یا آنِ واحد میں تو لکھ نہیں دی جاتی، اس کے کہنے اور لکھنے کے لئے بھی کچھ مدت درکار ہوتی ہے اور بعض اوقات تو یہ مدت دس دس دن اور پندرہ پندرہ دن

تک طویل ہو جاتی ہے۔ جب ایسا ہے اور فی الواقع ایسا ہی ہے تو اس سے بالبداہت ثابت ہوتا ہے کہ غزل کے مختلف و متضاد مضامین نہ بیک وقت دماغ میں آتے ہیں اور نہ بیک وقت نظم کئے جاتے ہیں۔ بلکہ یکے بعد دیگرے دماغ میں آتے ہیں اور یکے بعد دیگرے نظم کئے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک غزل سات شعر کی ہے، اور اس کی تیاری پر ایک گھنٹہ اور دس منٹ خرچ ہوئے ہیں، یعنی ہر شعر بالاوسط دس منٹ میں کہا اور لکھا گیا ہے یعنی پہلے دس منٹ میں اور دوسرے دس منٹ میں دوسرے متضاد یا غیر متضاد مضمون کا دوسرا شعر، اور اسی طرح تیسرا اور چوتھا اور باقی بھی علیٰ ہذا القیاس۔ مطلب یہ نکلا کہ یہ ساتوں شعر بیک وقت موزوں نہیں کر دئیے گئے بلکہ یکے بعد دیگرے موزوں کئے گئے ہیں، جن کے موزوں کرنے پر جدا جدا دس دس منٹ کا وقت صرف کیا گیا ہے۔ اور حالت یہ ہے کہ انسانی خیال مطلق بے لگام و بے مہار رہتا ہے اور ایک ایک لمحے میں ہزار ہزار موافق و مخالف راہیں اختیار کرتا رہتا ہے، انتشار یا بے لگامی، اور بے مہاری اس کی فطرت میں داخل ہے۔ اگر اس کو بہ جبر و کوشش روکا نہ جائے تو وہ ایک ثانئے کے لئے بھی ایک مرکز یا ایک نقطے پر قایم نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام اور جوگیوں وغیرہ کو سالہا سال تک اپنے خیال کو ایک مرکز یا نقطے پر مرکوز رکھنے کی کوشش و مشق کرنی پڑتی ہے۔ جب انسانی خیال کی یہ حالت ہے کہ ایک ثانئے کے لئے بھی کسی ایک مرکز پر قایم نہیں رہتا تو دس دس منٹ کا فصل زمانی ہے مخالف یا موافق جذبات و خیالات کو موزوں کرنا کیونکر ناممکن قرار دیا جا سکتا ہے۔

بہر حال جب نہ تو یہ صحیح ہے کہ انسانی دل و دماغ بہ یک وقت دو یا دو سے زیادہ مخالف یا موافق جذبات و خیالات سے متاثر نہیں ہو سکتے۔ اور نہ یہ درست کہ "غزل کے تمام اشعار آنِ واحد میں نظم کر دئیے جاتے ہیں"۔ تو پھر ان فریب دہ اور لاطائل دلائل کی بنا پر غزل کی جان کا لاگو ہو جانا محض مغرب زدگی کی پیدا کردہ دیوانگی نہیں تو اور کیا ہے۔

(۶) "تمام اصناف سخن میں تو مطالب و معانی کے لئے الفاظ تلاش کرنے پڑتے ہیں، مگر غزل میں اس کے برخلاف الفاظ کے لئے مطالب و معانی کی جستجو کی جاتی ہے"۔ یہ اعتراض مخالفین غزل کی افواج قاہرہ کے سپہ سالار اعظم، شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کے غزل کش دماغ کی پیدا وار

ہے، مگر اس اعتراض میں بھی کوئی جان نہیں، بلکہ یہ دوسرے اعتراضوں سے بھی زیادہ کمزور اور بودا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ کلام خواہ نظم ہو یا نثر، دو اجزا سے مرکب ہوتا ہے (۱) الفاظ (۲) معانی۔ ہر ادیب کو خواہ وہ ناظم ہو یا ناثر کبھی معانی کے لئے الفاظ تلاش کرنے پڑتے ہیں، اور کبھی الفاظ کے لئے معانی۔ یہ دونوں صورتیں لازم و ملزوم اور فطری ہیں اور ان میں باہم کوئی تضاد نہیں۔ کیا دورانِ تصنیف و تالیف میں کبھی کبھی نہیں بلکہ اکثر ایسے مواقع پیش نہیں آتے کہ استعارے، تشبیہ یا مخصوص تراکیب اور الفاظ کی مختلف اقسام نشست اور دروبست سے ان کو نئے نئے معانی پہنانے پڑتے ہوں۔ ایسے معانی جو روزمرہ کی بول چال اور ان کے لغوی معنی سے بالکل جدا ہوں جس کے بغیر کلام میں جدت، تازگی، تاثیر پیدا ہو ہی نہیں سکتی، زیادہ طول دینے کی ضرورت نہیں۔ یہاں چند مثالیں درج کر دینی کافی ہوں گی۔

پہلی مثال "گل" "بانگ"۔ یہ دو معمولی لفظ ہیں۔ پہلے لفظ کے معنی پھول ہیں، اور دوسرے کے معنی آواز۔ علیحدہ علیحدہ یہ دونوں لفظ بجز اس کے کہ اپنے لغوی معنی دیں کسی قسم کی گہرائی یا تاثیر اپنے اندر نہیں رکھتے۔ مگر جب انھیں دونوں لفظوں کو ملا کر "گلبانگ" بنا دیا جاتا ہے تو کیا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہی دونوں لفظ معمولی ترکیب پانے سے پہلے کیا تھے اور ترکیب پا کر کیا بن گئے۔ پہلے اِن دونوں لفظوں کے معنی کیا تھے اور اب کیا ہو گئے۔ ترکیب پانے کے بعد جو رنگینی، دلکشی اور طاقت لفظ گلبانگ میں پیدا ہو گئی ہے۔ کیا اس کی تشریح ممکن ہے؟

دوسری مثال: "سمند" اور "ناز" بھی دو معمولی لفظ ہیں۔ پہلے لفظ کے معنی "گھوڑا" اور دوسرے کے معنی "ناز" یعنی اک خاص قسم کی "ادائے معشوقانہ"۔ ان میں بھی علیحدہ علیحدہ کوئی جاذبیت اور معنویت نہیں اور نہ لفظاً و معناً کوئی ربط ہے۔ بلکہ ایک شدید قسم کا تنافر پایا جاتا ہے۔ مگر جب یہی دونوں لفظ اس شدید بے ربطی و تنافر کے باوجود ترکیبِ اضافی سے ملا کر "سمندِ ناز" میں تبدیل کر دیتے ہیں تو کس بے پناہ طاقت کے حامل ہو جاتے ہیں کس قدر لطیف، دلکش اور ناقابلِ اظہار معنی پیدا کر دیتے ہیں، اور اپنے مفہوم کو ول کر کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔

تیسری مثال۔ یہ ایک مثال چند در چند مثالوں کا مجموعہ ہے۔ ذیل کے دو اشعار ملاحظہ کیجئے

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس "زود پشیماں" کا پشیماں ہونا

نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے
پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

مندرجہ بالا اشعار کی جدت، تازگی، دلفریب انداز بیان اور رفعتِ خیالی کو چھوڑیئے کہ یہ ایسی ظاہر باہر چیزیں ہیں جن کو ایک اندھا بھی دیکھ سکتا ہے۔ صرف "زود پشیماں" کی دلنواز ترکیب، اور "نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے" کی عجیب وغریب اور معجزانہ اسالیب بیان پر غور فرمائیے۔ کہا تو گیا ہے "زود پشیماں" مگر معنی پیدا کر دیئے گئے ہیں "دیر پشیماں" کے اور پھر کس قدر "دیر پشیماں" کہ قتل کرنے کے بعد جفا سے توبہ کی جا رہی ہے۔ ظاہر تو کیا جا رہا ہے کہ "نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے" لیکن مقصد یہ ہے کہ ہم سمجھ گئے "کہ تم کہیں سے آ رہے ہو" اور پھر یہی نہیں کہ سمجھ گئے کہ تم کہیں سے آ رہے ہو، بلکہ یہ بھی سمجھ گئے کہ کہاں سے آ رہے ہو" اور مزید براں یہ بھی کہ "کیا کر کے آ رہے ہو" آپ نے دیکھا کہ اس مصرعے کے چند سیدھے سادے الفاظ کن عجیب وغریب بلیغ مطالب ومعانی کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں اور پھر رہنمائی بھی کتنی کامیاب رہنمائی۔ اب اس شعر کا دوسرا مصرعہ لیجئے "پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے"۔ اک غزل کے انداز بیان سے ناواقف شخص تو یہ کہدے گا کہ "یہ مصرعہ بالکل مہمل ہے، نہ اس کو پہلے مصرعہ سے کوئی ربط اور نہ یہ خود کسی مطلب ومعنی کا حامل۔ مگر ایک اداد انِ غزل اسے سُن کر پھڑک اُٹھے گا اور بے ساختہ پھڑک اُٹھے گا، اور شورِ "احسنت ومرحبا" سے آسمان سر پر اُٹھالے گا۔ وہ فوراً سمجھ جائے گا کہ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ "شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں"۔ اب غور فرمائیے کہاں تو "پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے" اور کہاں "شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں"، کن معمولی الفاظ کو کن دلچسپ اور عجیب وغریب معنی کا حامل بنا دیا گیا ہے۔ یہ غزل کا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے۔ ہم اس قسم کی اور سینکڑوں مثالیں پیش کر سکتے تھے۔ مگر ہمارا خیال ہے کہ سمجھنے والے کے لیئے اتنی مثالیں کافی ہو سکتی ہیں۔ اور جو نہ سمجھنا چاہے اُس کے لئے لاکھوں مثالیں بھی بیکار محض ہیں

آپ نے ملاحظہ فرمایا؟ کہ مذکورہ بالا مثالوں میں انھیں روزمرہ کے معمولی الفاظ کو جنھیں ہم ہمیشہ استعمال کرتے رہتے ہیں اور جن کی نسبت ہم کو کبھی شبہ بھی نہ گذرا تھا کہ ان کے کچھ اور معنی بھی ہو سکتے ہیں، کیسے کیسے نئے دلکش اور ماورائے فہم وقیاس مطالب ومعانی کا جامہ پہنا دیا گیا ہے جن کا لغوی معنی سے کوئی تعلق نہیں اور یہ جامہ پہنا کر ان کو ایسی غیر محدود طاقت کا مالک بنا دیا گیا ہے جس کا احاطہ کرنا بھی دشوار ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انھیں روزمرہ کے معمولی الفاظ کو جن میں اس سے پہلے کوئی جان نہ تھی۔ یہ ناقابلِ قیاس طاقت کس نے بخش دی اس کا صرف ایک ہی جواب ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ محض شاعر کی اس طاقتِ خلاقی نے جو اس گر سے آگاہ تھی کہ الفاظ کو اک خاص صورت سے ترکیب دے کر ان میں نئے نئے مطالب ومعانی کیونکر پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ بہرحال وہ ادیب شاعر جو معانی کو صرف الفاظ کا جامہ پہنانا تو جانتا ہے، مگر الفاظ کے لئے نئے نئے مفہوم اور نئے نئے معانی پیدا کرنے سے عاجز وقاصر ہے، ہرگز ادیب وشاعر کہلانے کا مستحق نہیں، کیونکہ گو معانی کو الفاظ کا جامہ پہنانا بھی فکر وکاوش کا محتاج ہے، مگر پھر بھی آسان کام ہے لیکن الفاظ میں نئے نئے مفہوم ومعانی پیدا کرنا سخت دشوار ہے اور ہر ادیب وشاعر کے بس کا روگ نہیں۔

غزل پر مذکورہ بالا اعتراضات کے علاوہ بعض اور اعتراضات کئے گئے ہیں، مگر وہ اسقدر غیر اہم ہیں کہ ان کے باضابطہ جواب دینے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ ان میں سے چند کے مختصر جوابات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

پہلا اعتراض:۔ "غزل کا وجود فارسی اور اردو کے سوا اور کسی زبان میں نہیں پایا جاتا، یہ کھلا ثبوت ہے اس امر کا کہ غزل ایک بیکار چیز ہے"۔ اول تو یہی غلط ہے کہ غزل کا وجود دنیا کی اور زبانوں میں نہیں پایا جاتا۔ کیونکہ کسی زبان کی شاعری کا جذبات حسن وعشق سے خالی رہنا ناممکن ہے۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری مروجہ غزل کی صورت میں نہیں پایا جاتا، دوسری صورتوں میں پایا جاتا ہو مگر ان جذبات کا اظہار جس صورت میں بھی پایا جائے ہم اسکو اپنی زبان میں "غزل" کے سوا اور کچھ کہہ ہی نہیں سکتے۔ دوسرے اگر دنیا کی دوسری زبانوں میں غزل جیسی کارآمد اور دلچسپ صنف کا وجود نہیں پایا جاتا تو اس کو ان زبانوں کی بدقسمتی سمجھئے۔

دوسرا اعتراض:۔ "غزل میں ایک ایک عاشق کے ہزار ہزار رقیب ہوتے ہیں، جن سے

رات دن جوتی بیزار ہوتی رہتی ہے۔"

جواب۔ اول تو بات یہ ہے کہ انتہائے عشق میں عاشق کے احساسات بہت نازک ہو جاتے ہیں، وہ انسان تو انسان ہوا، گھٹا، دریا، پہاڑ، چاند، سورج، باغ، صحرا، طوطا، مینا، آئینہ، کنگھی وغیرہ جس جس چیز کی طرف معشوق کی نگاہِ التفات جاتی ہے، ان سب کو اپنا رقیب سمجھنے لگتا ہے۔ یہ دلیل ہے کمالِ محبت کی، اور کمالِ محبت کمالِ عشق مانا گیا ہے، جو مذہبِ عشق کی رو سے اجرِ عظیم کا مستحق ہے، دوسرے ایک حسین پر بہت سے انسانوں کا فریفتہ ہو جانا بھی تو کوئی عجیب و نادر واقعہ نہیں بلکہ یہ تو بالکل اک کھلا ثبوت ہے معشوق کی فراوانیٔ حسن کا، اور یہی شاعر کا منشا ہوتا ہے۔ اب رہا جوتی بیزار کا معاملہ، سو اگر آپ کو شاعر بہ حیثیت عاشق اپنے رقیبوں سے لفظی اظہارِ بیزاری یا زبانی ہاتھا پائی، سچ مچ کی جوتی بیزار نظر آنے لگے تو اس میں بے چارے شاعر کا کیا قصور، بہتر ہو کہ آپ اپنی آنکھوں کا علاج کرائیں۔

تیسرا اعتراض: "غزل کے مضامین میں یک رنگی و توافق نہیں ہوتا۔ یعنی ایک شعر میں جس شے کو سراہ کر عزیز بنایا جاتا ہے اُسی کو دوسرے شعر میں مذمت کر کے گرا دیا جاتا ہے۔"

جواب۔ شاعر کوئی فلسفی یا مورخ نہیں ہوتا کہ اس کے کلام میں یک رنگی و توافق کا نہ پایا جانا عیب میں داخل سمجھا جائے۔ وہ صرف شاعر ہوتا ہے۔ اور شاعر کا کام یہ ہے کہ وہ کسی شے کو دیکھ کر جن مخالف و موافق جذبات سے متاثر ہوا ان کو شعر کا جامہ پہنا دے، اگر اس نے ایک شعر میں ایک چیز کو سراہا ہے اور دوسرے شعر میں اس کی مذمت کی ہے، اور ان دونوں شعروں میں کافی شاعرانہ دلکشی پائی جاتی ہے تو یہ اس کے کمالِ فن کی دلیل ہے نہ کہ نقص، کمال کی تفصیل کے لئے دیکھو مقدمہ شعر و شاعری مصنفہ علامہ حالی علیہ الرحمہ۔

چوتھا اعتراض "غزل گو، غزل میں خاص اپنے اصلی جذبات ظاہر کرنے پر قادر نہیں ہوتا بلکہ کبھی یا تو یہ جذبات اپنے نادیدہ جبر طاری کرنے پڑتے یا پھر اسے اس پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ وہ دوسروں کے جذبات کو حوالۂ قلم کرے۔"

جواب۔ اوّل تو یہ غلط ہے کہ غزل گو، غزل میں اپنے جذبات ظاہر کرنے پر قادر نہیں ہوتا، اگر وہ فی الواقع قادر نہیں ہوتا تو پھر وہ شاعر نہیں بلکہ متشاعر ہے، کیونکہ شاعری میں اپنے خیالات وجذبات کو جامۂ شعر پہنانا اس سے آسان کام ہے، اور چونکہ یہ آسان کام ہے اس لئے ہر غزل گو شاعر غزل میں بالاکثر اپنے ہی خیالات وجذبات کو شعر کے سانچے میں ڈھالتا ہے اور وہ زیادہ تر ایسے ہی قافیوں کا انتخاب کرتا ہے جو اس کو اس کام میں مدد دے سکیں، اور یہی وجہ ہے کہ ہر متغزل کے کلام میں بعض خیالات وجذبات کی بہتات ہوتی ہے، اور بعض کم، بعض بہت کم یا کالعدم ہوتے ہیں۔ اور اسی کمی بیشی سے یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ ایک شاعر کے رجحانات طبیعت اپنی زندگی میں کیا تھے، اور اس کو کن خیالات وجذبات یا کن معاملات سے زیادہ سابقہ پڑا تھا، اور کن سے کم۔ دوسرے شاعر کو تو ترجمانِ عالم کہا گیا ہے، اور بجا طور پر کہا گیا ہے۔ اس کے لئے اپنے خیالات وجذبات ظاہر کرنا تو ایک پیش پا افتادہ چیز ہے، اس کو تو چرند پرند، نباتات وجمادات، کوہ ودریا، چاند سورج، آسمان وزمین، غرضکہ ہر چیز کی زبان سے بولنے اور ان سے گفتگو کرنے کی قدرت ہوتی ہے۔ جب یہ صحیح ہے تو پھر اگر ایک غزل گو شاعر اپنے علاوہ اپنے دوسرے ابنائے جنس کے خیالات وجذبات کو جامۂ شعر پہنانے یا دنیا کی دوسری جاندار اور بے جان اشیا کی زبان سے بولنے اور ان سے ہم کلام ہونے پر قادر ہے تو یہ اس کے شاعرانہ کمال کی ایک روشن دلیل ہے نہ کہ کوئی قابلِ الزام وگردنت جرم۔ یہ کونسا انصاف ہے کہ آپ تمام دیگر اصنافِ سخن یعنی نظموں وغیرہ میں تو اس جرم کا ارتکاب روا رکھیں اور اس کو مستحسن سمجھیں، مگر بے چاری غزل کو اس مستحسن جرم کی پاداش میں جلّاد کے حوالے کردیں۔

———— ❊ ————

یورپ کے نوجوان

کاش اس مضمون کا عنوان "یورپ کے نوجوان" کے بجائے "یورپی نوجوان" ہوتا۔ مگر یہ تخیل اب چند سال سے امید موہوم ہوکر رہ گیا ہے۔ یورپ کے مختلف ممالک کے نوجوان اپنے اپنے مقاصد کے ماتحت متحد ضرور ہیں، مگر مجھے شبہ ہے کہ آیا انھیں کبھی اتنی قوت نصیب ہو گی کہ وہ سیاسی، جماعتی یا کم سے کم اخلاقی مسائل میں فیصلہ کُن ثابت ہو سکے۔

جنگِ عظیم کے بعد ہم نوجوانوں کو یقین نہ آتا تھا کہ پھر اس پیمانے کی دوسری کشمکش بھی ہو سکتی ہے یہ خیال فاتح اور مفتوح دونوں کے یہاں مسلّم تھا۔ مگر ۱۹۲۲ء میں ویسٹ منسٹر ایبی میں مجھے پہلی بار یہ خیال ہوا کہ شاید میں غلطی پر ہوں۔ میں "نامعلوم سپاہی" کی قبر کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی لوح پر لکھا تھا "وہ جو خدا کی راہ میں کام آیا اور اپنے ملک اور بادشاہ کے لئے قربان ہوا، اس نے عدل وانصاف اور بنی نوعِ انسان کی آزادی کی خاطر اپنی جان دی"۔ چند ہی گھنٹوں کے بعد مجھے ایک تھانے میں جانے کا اتفاق ہوا، کیونکہ میں ایک ایسے ملک کا باشندہ ہوں جو کبھی دشمن رہ چکا تھا اور اسی لئے میری وہاں تصدیق اور جانچ ہونی تھی۔ تھانے کے افسر نے مجھ سے پوچھا "تم جنگ میں شریک تھے؟" میں نے کہا "میں اس وقت بہت چھوٹا تھا" اس نے مجھے نیچے سے اوپر تک دیکھا، اور کہنے لگا "خیر، اگلی جنگ کے لئے بہت موزوں ہو" اس موقع پر تو مجھے گمان بھی نہیں گذرا کہ سارجنٹ کا قول ٹھیک نکلے گا۔ مگر یہ شبہ جو اس وقت پیدا ہوا تھا، اب پورے یقین کے درجے تک پہنچ چکا ہے۔

یورپ کی موجودہ نسل کے اندر وہی انقلابی جذبہ اور کشمکش نظر آتی ہے، جو بالعموم ان نوجوانوں کے اندر کارفرما ہوا کرتی ہے جو کسی اہم تاریخی زمانے میں نشوونما پاتے ہیں۔ نوجوانوں نے اپنے زمانے کے سیاسی اور سماجی نظام ادب کے رجحانات، فنونِ لطیفہ کے معیار اور مذہب کے

تخیلات کے خلاف ہمیشہ بغاوت کی ہے اس لئے موجودہ انقلابی جذبہ بھی کوئی نئی چیز نہیں، ہاں مقاصد کی پیچیدگی کشمکش کی شدت اور دباؤ کی زیادتی کی وجہ سے نمایاں معلوم ہوتا ہے۔

یورپ کی اس نئی نسل کو عمر سے قطع نظر، تجربے کے لحاظ سے دو گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے پہلے گروہ میں اکثر وہ لوگ شامل ہیں جن کے دلوں میں جنگ کے قبل کے زمانے کی یاد باقی ہے، اور دوسرے میں وہ لوگ ہیں جو آشنائے جنگ یا اس کے بعد کے ایام میں پلے اور بڑھے۔ روزی کا سوال دونوں کے لئے یکساں طور پر مشکل ہے مگر اس سے بھی مشکل یہ امر ہے کہ وہ اپنے لئے مناسب نصب العین تجویز کرسکیں جو ان کے مقاصد کے شایانِ شان ہو۔ اس لئے جوں جوں وہ عمر میں ترقی کرتے جاتے ہیں، ان کی مشکلات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ موجودہ حالات چونکہ ناقابل حل ہوتے جارہے ہیں، اس لئے انقلاب کی ضرورت ناگزیر تر ہوتی جاتی ہے۔ ان حالات کے پیش نظر جو کچھ نہ ہوتا کم تھا۔ اسی لئے آج کل مختلف ممالک کے نوجوان نہایت سرگرمی کے ساتھ ایسے سیاسی نظام کے ماتحت مصروف عمل ہیں جن کا فلسفیانہ پہلو ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔

جنگ کے بعد یورپ کی نئی نسل کے سامنے کون کون سی صورتیں تھیں؟ ایک طرف تو مختلف ممالک کی محدود قوم پرستی جس کی بنیاد ملوکیت پر تھی، ایک دوسرے سے دست بگریباں تھی اور دوسری جانب آزاد سرمایہ داری اور آمرانہ اشتراکیت (Dictatorial Comunism) میں رقابت تھی۔ جنگ کے بعد فوراً ہی ہر جگہ اشتراکی انقلابات سے آزاد سرمایہ داری کو اندیشہ ہو چلا تھا۔ مگر قوم پرستی نے پھر سنبھالا لیا اور اب نوجوان اس گومگو میں پڑ گئے کہ "یا جمہوریت اچھی دنیا میں باقی رہے گی یا اشتراکی پیغمبروں کا قول کہ ایک عالمگیر انقلاب قریب ہے، صحیح نکلے گا۔ مگر یہ سوال جتنا بظاہر سادہ معلوم ہوتا ہے اتنا آسان نہیں ہے۔ کم و بیش تمام ممالک میں ان دونوں صورتوں میں انتخاب کرنا ناممکن ہوگیا ہے۔ اور جہاں ناممکن نہیں تھا وہاں بھی اب متضاد سیاسی تخیلات کے ایک جگہ جمع ہو جانے سے مشکلات پیدا ہوگئی ہیں۔ اشتراکیت کا دعویٰ ہے کہ اس کا وجود عقلِ سلیم پر مبنی ہے اور اس کے ذریعے ساری دنیا کا بھلا ہوگا۔ اس نے جمہوریت سے آمریت تک اپنے

مدارج مقرر کئے ہیں، اس کی مدمقابل آزاد یا قدامت پسند سرمایہ داری ہے جو اس تخیل پر مبنی ہے کہ عدم مداخلت (Laissez Faire) کے اصول کے ماتحت جماعت کی جو خود بخود ترتیب ہو جاتی ہے وہی برقرار رکھی جائے۔ فاشستیوں کے نزدیک بھی حصولِ مقاصد کا ذریعہ "استدلال" اور "عقل" ہے۔ مگر نازیوں کے یہاں کامیاب زندگی کا گُر یہ ہے کہ جو کچھ فوراً سمجھ میں آجائے اس پر بے چون و چرا اور بغیر کسی استدلال کے کاربند ہو جانا چاہیئے۔ جب موجودہ نسل کے رہنما قوت و اقتدار کے لئے سرمایہ دار اور اشتراکی تہذیبوں میں جنگ کے نعرے لگاتے ہوئے اُٹھتے ہیں، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ "قیامِ انسانیت" کی خاطر جنگ ناگزیر ہے۔ تو تخیلات کی حسرتناک پیچیدگی اپنی اصلی صورت میں نمایاں ہو جاتی ہے۔

غرض یورپ کی نئی نسل کا نہ تو زاویۂ نگاہ ایک ہو سکتا ہے، اور نہ مقاصد۔ البتہ انہوں نے اپنے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے جو طریق عمل اختیار کیا ہے اسی کی بنا پر ان کو دو مختلف گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ حامیانِ جنگ کا طبقہ جس نے اس چار سالہ کشمکش کے دوران میں ہوش سنبھالا ہے، یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ قوت کی حکومت کو تسلیم کرنا چاہیئے۔ چنانچہ جنگ کو ناگزیر سمجھ کر انھوں نے طے کر دیا کہ سیاسی اور جماعتی مسائل کا فیصلہ مشین گن پر چھوڑ دینا چاہیئے۔

حامیانِ امن جنھوں نے جنگ کے بعد کے زمانے میں ہوش سنبھالا، یہ سمجھتے ہیں کہ قیامِ امن کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے۔ کوشش امن سے ان کا مقصد جنگ کا سرے سے خاتمہ کرنا نہیں ہے بلکہ وہ اسے نیک کام سمجھ کر کرتے ہیں وہ بین الاقوامی اور قومی مفادات کے درمیان خوش معاملگی پیدا کرنے کے حامی ہیں اور اس سے پیشتر کہ باہمی کشمکش اسقدر نازک اور پیچیدہ صورت اختیار کرے کہ بغیر جنگ کے اسکا تصفیہ ہی نہ ہو سکے وہ اس گُتھی کو سلجھا دینا چاہتے ہیں۔ حامیانِ جنگ میں ایسے لوگ شامل ہیں جو طاقت اور اثر کے لحاظ سے بڑھے ہوئے ہیں اور روز بروز اُن کی طاقت اور تعداد میں ترقی ہو رہی ہے لیکن حامیانِ امن میں بھی ایسے لوگ شامل ہیں جن کے سیاسی، جماعتی اور معاشی تجربات نسبتاً زیادہ پختہ اور مسلم ہیں، اور روز بروز یہ

طبقہ بھی ترقی کر رہا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یورپ کے نوجوانوں کی اکثریت ان دو طبقوں میں سے کس کے ساتھ ہوگی۔ یورپ میں نوجوانوں کی موجودہ تحریکات پر سیر حاصل تبصرے کے لئے تو مضامین کا ایک سلسلہ درکار ہے، مگر ہم یہاں ان کی ذہنیت کا مختصر طور سے تجزیہ کریں گے جس سے اُن کے طریقِ عمل پر کچھ روشنی پڑے گی۔ یورپ کی نئی نسل کی اخلاقی اور ذہنی کیفیت کا شاید سب سے زیادہ یاس انگیز پہلو یہ ہے کہ آج کل آپس میں خیالات و جذبات کا تبادلہ تقریباً ختم ہوگیا ہے اور وہ اپنے ہی ملک کے محدود دائرے میں رہ کر توموں کے اندر مناقشانہ جذبات کو مشتعل کرتے رہتے ہیں۔ ہر عقیدے اور مسلک کے لوگوں نے اپنے ارد گرد گویا جادو کا ایک حلقہ سا بنالیا ہے جس کے اندر رہ کر وہ طرح طرح کے قومی ترانوں اور نعروں کی صورت میں صرف اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنایا کرتے ہیں اور محض اپنے ہی مسائل میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں۔ آج کل سائنس کی بدولت باہمی میل جول کی کتنی سہولتیں فراہم ہیں، اس کے باوجود یہ جادو نہیں ٹوٹتا۔ اور کیا مجال کہ ان "طلسمی حلقوں" کے باہر کوئی قدم رکھ سکے۔ آج یورپ ذہنی اعتبار سے متعدد حصوں میں اس طرح تقسیم ہے کہ ایک کو دوسرے کے خیالات کی مطلق خبر نہیں۔ یہ صورت اتنی نمایاں ہے کہ یورپ میں ذہنی بیداری کے نشاۃ ثانیہ کے بعد سے آج تک کبھی رونما نہیں ہوئی تھی۔ ایک ہی مثال لیجئے۔ سولھویں صدی سے لے کر اٹھارویں صدی تک Erasmus کی تصانیف کا مطالعہ — جو تعلیم یافتہ نوجوانوں کی مشترکہ زبان (Lingua franca) لاطینی میں لکھتا تھا۔ یورپ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نہایت آزادی کے ساتھ کیا جاسکتا تھا۔ اور اس کا ترجمہ بھی اسی طرح آزادی کے ساتھ درجنوں زبانوں میں ہوتا تھا اور کونگسبرگ سے آکسفورڈ تک تمام یورپ میں علم کی خاطر سفر کرتے تھے۔ اور ارباب علم و ادب کا ہر ملک میں سرگرمی سے خیر مقدم ہوتا تھا۔ مگر ایک آج کا زمانہ ہے کہ کتابوں کی درآمد تک محال ہے۔ یورپ کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں بیرونی طالب علموں کی تعداد ایام انقلاب فرانس سے

علاوہ اتنی کم کبھی نہیں رہی جتنی آج ہے۔

جن لوگوں نے روسمیک کے کھیل دیکھے ہیں۔ یا انھیں عالمگیر اسکاوٹس جمہوری دیکھنے کا موقع ملا ہے، انھیں ان دونوں موقعوں پر عالمگیر اجتماع کو دیکھ کر یقین ہوگیا ہے کہ نوجوان دنیا کو باہم منظم دیکھنے کے متمنی اور مشترکہ نظام عمل کو نہایت دلیری کے ساتھ قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ان مظاہروں کے دیکھنے کے بعد یورپ کے موجودہ نوجوانوں سے کچھ امید بندھتی ہے مگر کون نہیں جانتا کہ محض امید ہی کافی نہیں ہوتی۔ اس لئے فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ضرورت کس چیز کی ہے؟ اگرچہ اس سوال کو سن کر بیشتر نوجوان جواب کی طرف سے آنکھیں پھیرلیں گے اور اپنے اپنے مسائل میں مصروف ہوجائیں گے۔ لیکن ہر ملک میں ایسے چند نوجوان بھی ملیں گے جو قوموں کے بنیادی اختلافات کو دور کر کے ان کو ہم آہنگ کرنے کی ضرورت اور ان کے باہمی تعلقات میں لوچ پیدا کرنے کی اہمیت کو محسوس کریں گے۔

انھیں اس امر کا زیادہ سے زیادہ احساس ہو رہا ہے کہ دنیا تو خیر، یورپ کو بھی متحد کرنے میں نہ اشتراکیت کے متعدد پہلوؤں میں سے کوئی پہلو اور نہ سرمایہ داری کی آزادانہ شکل کوئی بھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ ان میں سے کسی کو کامیابی ہوگی بھی تو اس حالت میں کہ اس کے اصولوں کو تمام دنیا متفقہ طور پر سمجھ لے اور انھیں برتنے کے لئے تیار ہوجائے۔ نظری حیثیت سے تو دنیا اشتراکیت کے زیر اثر بھی اور سرمایہ داری کے ماتحت بھی شگفتہ رہے گی، اس لئے کہ دونوں نظریوں کی بنیاد اس مفروضے پر قایم ہے کہ ہر جگہ ایک ہی قسم کے انسان بستے ہیں۔ آزاد خیال طبقے کے لائحہ عمل کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ یہ نتیجہ انفرادی کوششوں سے رونما ہوگا۔ اس کے برعکس اشتراکیوں کا دھیان ہے کہ یہ یکسانیت طاقت کے بغیر نہیں پیدا ہوسکتی۔ ان نظریوں کے عملی پہلو نے انھیں ایسی پیچیدگی میں ڈال دیا ہے کہ سرمایہ دارانہ اور اشتراکی دونوں قسم کی ریاستوں میں اس مقصد کے حصول کے لئے طاقت کے استعمال کو ضروری سمجھا جاتا ہے مساوات کا یہ نظریہ ممکن ہے قومی مسائل کو کسی حد تک حل کرنے میں کامیاب ہوجائے۔ مگر جب

ین الاقوامی معاملات میں برتا جائے گا تو بالکل بیکار ثابت ہوگا حتیٰ کہ تمام دنیا جماعتی دباؤ
، تنگ آکر ایسا طریقۂ فکر و عمل اختیار کرنے پر مجبور ہوگی جو ایلڈ و ہکسلے (Aldous Huxley)
م و بیش اپنی تصنیف "خیالی دنیائے جدید" (Brave New World) میں پیش کیا ہے
نوجوانان یورپ کے مفکرین کو اب احساس ہو چلا ہے کہ یورپ میں جمہوریت، آمریت۔
تیت اور اشتراکیت کا سایہ بہلو بہ پہلو قایم رہے گا۔ ان کے حامی ممکن ہے اپنے اندرونی (ملکی)
ل کو سلجھانے میں کامیاب ہو جائیں، مگر مستقبل میں انھیں اُس وقت تک دوام اور استقلال
نہیں ہو سکتا، جب تک ان میں بین الاقوامی معاملات کو سلجھانے کی صلاحیت نہ پیدا ہو جائے۔
کوئی اسکیم ابھی تک مرتب نہیں ہوئی ہے، مگر اس کی ضرورت کو سب محسوس کر رہے ہیں۔ اگر
دل میں معقولیت پسندی آگئی تو یہ سوال کہ کس ملک میں کونسا سیاسی اور معاشی نظام رائج ہے
یادہ اہم نہ ہوگا لیکن اگر ان کے خیالات میں وسعت اور رواداری نہ آئی تو ان کے درمیان
ب اندیشہ ناک کشمکش جاری ہی ہے۔ دوسری ریاستوں سے بھی ان کے تعلقات خوش گوار
ہیں گے۔

آج کل یورپ میں باہمی اختلافات اور اتحاد بالجبر کے مسائل نے جو صورتِ حال اختیار
ی ہے اس کی ایک جیتی جاگتی تصویر جولین بنڈا (Julien Benda) کے مشہور مقالہ
م یورپ" (Discours a la Nation Europeenne) میں نظر آتی ہے۔ مقالہ نگا
مقالہ مشہور جرمن فلسفی "فشٹے" (Fichte) کے خطبات کے جواب میں لکھا ہے۔ فشٹے نے
صدی پہلے یہ خطبات برلن یونیورسٹی میں (Rede an die Deutsche Nation) کے
ن سے دئے تھے۔ یہ دونوں تصنیفیں علمی و ادبی حیثیت سے اپنی اپنی جگہ ممتاز ہیں اور جتنی
یت نوجوانانِ یورپ میں ان کو حاصل ہوئی شاید ہی کسی اور تصنیف کو حاصل ہوئی ہو۔ اگر کوئی
ان دونوں نظریات میں سے انتخاب کرنا چاہے تو اس کے لئے مشکل ہو جائے گا۔ مگر
ت یہ ہے کہ ان دونوں تقریروں کا مطالعہ اگر غور سے کیا جائے اور ان کی اصلیت کو

سمجھنے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں کوئی بین اور بنیادی فرق نہیں ہے۔ نِشٹے نے قومیت کی تعلیم دی ہے اور اُسے فلسفۂ حیات کی بنیاد کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ اس کی رُو سے افراد کی زندگی وعمل کا بنیادی مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ اس سے جرمن قوم کی تہذیبی سماجی اور معاشی ترقی میں زیادہ سے زیادہ مدد ملے۔ گویا نشٹے کی تعلیم مشترکہ مفاد پر انفرادی مفاد کی قربانی کی حامی ہے۔ اس کے علاوہ بین الاقوامی معاملات میں فِشٹے نے بھی دوسری قوموں کے ساتھ رواداری، احترام اور مساوات کے اصولوں کو برتنے کی بڑے زور سے حمایت کی ہے۔ دوسری جانب بنڈا (Banda) "مذہب انسانیت" (Humanitarianism) کا علمبردار ہے اور بین الاقوامی کشمکش میں اُسی "انسانی رویہ" کے اختیار کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔

بنڈا نے اپنی تصنیف میں فکر وعمل کے دو معیار قایم کئے ہیں۔ ایک اعلیٰ اور دوسرا ادنیٰ۔ اُس نے "یورپ" کو مقدم اور "قوم" کو موخر رکھا ہے۔ مگر بہ حالتِ موجودہ جب فِشٹے اور بنڈا کے حامی "قومی" اور "یورپی" جذبے کی تعریف کرنے لگتے ہیں تو دونوں کے دونوں اسے کھینچ تان کر اپنے ہی میعار کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ بنڈا کا منتہائے نظر "یورپی قوم" سے یہ نہیں تھا کہ وہ یورپ کو ایک قوم کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ بلکہ اس سے اس کا مفہوم وہ ہے جو یورپ کے متعلق فِشٹے نے پیش کیا ہے۔

جا۔ اوٹن (J. Otten) نے جو یورپ کی نئی نسل کے نمائندوں میں ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔ بنڈا کے خطبے پر تبصرہ کرتے ہوئے بڑی مایوسی کا اظہار کیا ہے۔ اپنے مقالہ (Mobility and Revolution) میں لکھتا ہے۔

"ہمیں شاعرانہ اور مبہم باتوں، خیالی اور متعصبانہ اصولوں اور روایتی پابندیوں سے آزاد ہونا پڑے گا۔ اپنے ہمسایوں کی غلط روایات اور مضرت رساں تعصبات میں رواداری کا جذبہ پیدا کرنا تو مشکل ہے ہی۔ مگر اس سے بھی مشکل یہ ہے کہ ان عقائد و تخیلات کی درشتی کو دُور کیا جائے جن کے ہاتھوں یورپ تباہ ہو رہا ہے۔ لیکن اگر

ہمیں اچھی فصل کاٹنا اور دوسری کاشت کرنا ہے تو یہ سب کچھ کرنا ہی پڑے گا"

ضرورت اس امر کی ہے کہ یورپ کے نوجوانوں میں ایک غیر مقلدانہ جذبۂ خدمت وایثار پیدا ہو، وہ ہر قسم کی صورتِ حال سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہیں اور قومی اور بین الاقوامی زندگی کے تمام تغیرات پر جو آئے دن رونما ہوتے رہتے ہیں، نظر رکھتے ہوں اور ان پر قابو پانے کے لئے کوشاں رہیں۔

کیا ان خیالات کے علمبردار کوشش کریں گے کہ یورپ کے نوجوانوں میں اس مقصد کی اہمیت اور ضرورت کا احساس پیدا ہو جائے؟ اور کیا اس کی تکمیل کے لئے وہ کوئی راستہ نکالنے کی منظم کوشش کریں گے؟ یا پھر اس حسرتناک انجام کا انتظار کیا جائے جو کبھی سماریا کے اچھوتوں کا ہوا تھا۔ کیا انجیل مقدس کا نظریۂ حیات و موت یہ نہیں:۔

"موت کے انتظار میں ہم یہاں کیوں بیٹھے رہیں، اس خوف سے کہ شہر میں داخل ہوں گے تو سب مر جائیں گے، ہم قدم نہ اٹھائیں تو یہاں بھی تو آخر مرنا ہی ہے"؟

کیا ممکن نہیں کہ نوجوانانِ یورپ بھی انہی انسانوں کی طرح آگے قدم بڑھائیں "اور کامرانی کا پیغام لائیں؟

شکوہ شکایت

زندگی کا بڑا حصہ اسی گھر میں گذر گیا مگر کبھی آرام نہ نصیب ہوا، میرے شوہر دنیا کی نگاہ میں بڑے نیک اور خوش خلق اور فیاض اور بیدار مغز ہونگے، لیکن جس پر گذرتی ہے وہی جانتا ہے۔ دنیا کو تو اُن لوگوں کی تعریف میں مزہ آتا ہے جو اپنے گھر کو جہنم میں ڈال رہے ہوں اور غیروں کے پیچھے اپنے کو تباہ کئے ڈالتے ہوں۔ جو گھر والوں کے لئے مرتا ہے اس کی تعریف دنیا والے نہیں کرتے۔ وہ تو ان کی نگاہ میں خود غرض ہے، بخیل ہے، تنگدل ہے، مغرور ہے، کور باطن ہے۔ اسی طرح جو لوگ باہر والوں کے لئے مرتے ہیں ان کی تعریف گھر والے کیوں کرنے لگے۔ اب انہیں کو دیکھو۔ صبح سے شام تک مجھے پریشان کیا کرتے ہیں۔ بازار سے کوئی چیز منگواؤ تو ایسی دوکان سے لائیں گے جہاں کوئی گاہک بھول کر بھی نہ جاتا ہو۔ ایسی دوکانوں پر نہ چیز اچھی ملتی ہے نہ وزن ٹھیک ہوتا ہے، نہ دام ہی مناسب۔ یہ نقائص نہ ہوتے تو وہ دوکان بدنام ہی کیوں ہوتی۔ انھیں ایسی ہی دوکانوں سے سودا سلف خریدنے کا مرض ہے۔ بار بار کہا کسی چلتی ہوئی دوکان سے چیزیں لایا کرو وہاں مال زیادہ کھپتا ہے۔ اس لئے تازہ مال آتا رہتا ہے۔ مگر نہیں۔ ٹٹپونجیوں سے ان کی ہمدردی ہے اور وہ انھیں اُلٹے اُسترے سے مونڈتے ہیں۔ گیہوں لائیں گے تو سارے بازار سے خراب، گھنا ہوا چاول ایسا موٹا کہ بیل بھی نہ پوچھے۔ دال میں کنکر بھرے ہوئے۔ منوں لکڑی جلاڈالو کیا مجال کہ گلے۔ گھی لائیں گے تو آدھوں آدھ تیل۔ اور نرخ اصلی گھی سے ایک چھٹانک کم تیل لائینگے تو ملاوٹ کا۔ بالوں میں ڈالو تو چکٹ جائیں۔ مگر دام دے آئیں گے اعلیٰ درجے کے چنبیلی کے تیل کے۔ چلتی ہوئی دوکان پر جاتے تو جیسے انہیں ڈر لگتا ہے۔ شاید اونچی دوکان اور پھیکے پکوان کے قائل ہیں۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ نیچی دوکان پر سڑے پکوان ہی ملتے ہیں۔

ایک ان کی بات ہو تو برداشت کرلی جائے۔ روز روز کی یہ مصیبت نہیں برداشت

ہوتی۔ میں کہتی ہوں آخر آپ ٹٹپونجیوں کی دوکان پر جاتے ہی کیوں ہیں۔ کیا ان کی پرورش کا ٹھیکہ تمہیں نے لے لیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں مجھے دیکھ کر بُلانے لگتے ہیں۔ خوب! ذرا انھیں بُلا لیا اور خوشامد کے دو چار الفاظ سُنا دیئے، بس آپ کا مزاج آسمان پر جا پہنچا۔ پھر انھیں سدھ نہیں رہتی کہ وہ کوڑا کرکٹ باندھ رہا ہے یا کیا۔ پوچھتی ہوں تم اس راستے سے جاتے ہی کیوں ہو؟ کیوں کسی دوسرے راستے سے نہیں جاتے۔ ایسے اٹھائی گیروں کو منہ ہی کیوں لگاتے ہو۔ اس کا کوئی جواب نہیں۔ ایک خموشی سو بلاؤں کو ٹالتی ہے۔

ایک بار ایک زیور بنوانا تھا۔ میں تو حضرت کو جانتی تھی۔ ان سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ ایک پہچان کے سنار کو بُلا رہی تھی۔ اتفاق سے آپ بھی موجود تھے۔ بولے یہ فرقہ بالکل اعتبار کے قابل نہیں۔ دھوکا کھاؤ گی۔ میں ایک سُنار کو جانتا ہوں۔ میرے ساتھ کا پڑھا ہوا ہے برسوں ساتھ ساتھ کھیلے ہیں۔ میرے ساتھ چالبازی نہیں کر سکتا۔ میں نے سمجھا جب ان کا دوست ہے اور وہ بھی بچپن کا تو کہاں تک دوستی کا حق نہ نبھائے گا۔ سونے کا زیور اور پچاس روپے ان کے حوالے کئے۔ اور اس بھلے آدمی نے وہ چیز اور روپے نہ جانے کس بے ایمان کو دیدیئے کہ برسوں کے پیہم تقاضوں کے بعد جب چیز بن کر آئی تو روپے میں آٹھ آنے تانبا۔ اور اتنی بدنما کہ دیکھ کر گھن آتی تھی۔ برسوں کا ارمان خاک میں مل گیا۔ رو پیٹ کر بیٹھ رہی۔ ایسے ایسے دغاباز تو ان کے دوست ہیں جنھیں دوست کی گردن پر چھُری پھیرنے میں بھی عار نہیں۔ انکی دوستی بھی انھیں لوگوں سے ہے جو زمانہ بھر کے فاقہ مست، قلانچ، بے سر و سامان ہیں، جن کا پیشہ ہی ان جیسے آنکھ کے اندھوں سے دوستی کرنا ہے۔ روز ایک نہ ایک صاحب قرض مانگنے کے لئے سر پر سوار رہتے ہیں اور بلا لئے گلا نہیں چھوڑتے۔ مگر ایسا کبھی نہ ہوا کہ کسی نے روپے ادا کئے ہوں۔ آدمی ایک بار کھو کر سیکھتا ہے، دو بار کھو کر سیکھتا ہے۔ مگر یہ بھلے مانس ہزار بار کھو کر بھی نہیں سیکھتے۔ جب کہتی ہوں روپے تو دے آئے۔ اب مانگ کیوں نہیں لاتے، کیا مر گئے تمہارے وہ دوست۔ تو بغلیں جھانک کر رہ جاتے ہیں۔ آپ سے دوستوں کو سوکھا جواب نہیں

دیا جاتا۔ خیر سُو کھا جواب نہ دو۔ میں بھی نہیں کہتی کہ دوستوں سے بے مروّتی کرو۔ مگر ٹال تو سکتے ہو کیا بہانے نہیں بنا سکتے، مگر آپ انکار نہیں کر سکتے۔ کسی دوست نے کچھ طلب کیا اور آپ کے سر پر بوجھ پڑا۔ بیچارے کیسے انکار کر دیں۔ آخر لوگ جان جائیں گے کہ یہ حضرت بھی نادست ہیں۔ دنیا انہیں امیر سمجھتی رہے چاہے میرے زیور ہی کیوں نہ گرو رکھنے پڑیں۔ سچ کہتی ہوں بعض اوقات ایک ایک پیسے کی تنگی ہو جاتی ہے۔ اور اس بھلے آدمی کو روپے جیسے گھر میں کاٹتے ہیں۔ جب تک روپے کے وارے نیارے نہ کرلے، اسے کسی پہلو قرار نہیں۔ ان کے کرتوت کہاں تک کہوں۔ میری تو ناک میں دَم آگیا۔ ایک نہ ایک مہمان روز بلائے بے درماں کی طرح سر پر سوار۔ نہ جانے کہاں کے بے فکرے ان کے دوست ہیں۔ کوئی کہیں سے آکر مرتا ہے، کوئی کہیں سے۔ گھر کیا ہے اپاہجوں کا اڈا ہے۔ ذرا سا تو گھر مشکل سے دو چار پائیاں اوڑھنا بچھونا بھی با افراط نہیں۔ مگر آپ ہیں کہ دوستوں کو دعوت دینے کے لئے تیار۔ آپ تو مہمان کے ساتھ لیٹیں گے اس لئے انہیں چار پائی بھی چاہیئے، اوڑھنا بچھونا بھی چاہیئے ورنہ گھر کا پردہ کھل جائے۔ جاتی ہے تو میرے اور بچّوں کے سر۔ زمین پر پڑے پڑے سُکڑ کر رات کاٹتے ہیں۔ گرمیوں میں تو خیر مضائقہ نہیں۔ لیکن جاڑوں میں تو بس قیامت ہی آجاتی ہے گرمیوں میں بھی کھلی چھت پر تو مہمانوں کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ اب میں بچّوں کو لئے قفس میں پڑی تڑپا کروں۔ اتنی سمجھ بھی نہیں کہ جب گھر کی یہ حالت ہے تو کیوں ایسوں کو مہمان بنائیں جن کے پاس کپڑے لتّے تک نہیں۔ خدا کے فضل سے ان کے سبھی دوست ایسے ہی ہیں۔ ایک بھی ایسا خدا کا بندہ نہیں جو ضرورت کے وقت انہیں دھیلے سے بھی مدد دے سکے دو ایک بار حضرت کو اس کا تجربہ اور بے حد تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ مگر اس مرد خدا نے تو جیسے آنکھیں کھولنے کی قسم کھالی ہے۔ ایسے ہی ناداروں سے ان کی پٹتی ہے۔ ایسے ایسے لوگوں سے آپ کی دوستی ہے کہ کہتے شرم آتی ہے۔ جسے کوئی اپنے دروازے پر کھڑا ہی نہ ہونے دے وہ آپ کا دوست ہے۔ شہر میں اتنے امیر کبیر ہیں۔ آپ کا کسی سے بھی ربط ضبط نہیں۔

کسی کے پاس نہیں جاتے۔ امرا مغرور ہیں، مدمّغ ہیں، خوشامد پسند ہیں۔ ان کے پاس کیسے جائیں دوستی گانٹھیں گے ایسوں سے جن کے گھر میں کھانے کو بھی نہیں۔

ایک بار ہمارا خدمتگار چلا گیا اور کئی دن دوسرا خدمتگار نہ ملا۔ میں کسی ہوشیار اور سلیقہ مند نوکر کی تلاش میں تھی۔ مگر بابو صاحب کو جلد سے جلد کوئی آدمی رکھ لینے کی فکر سوار ہوئی گھر کے سارے کام بدستور چل رہے تھے مگر آپ کو معلوم ہو رہا تھا کہ گاڑی رُکی ہوئی ہے۔ ایکدن جانے کہاں سے ایک بانگڑو کو پکڑ لائے اس کی صورت کہے دیتی تھی کہ کوئی جانگلو ہے مگر آپ نے اس کی ایسی ایسی تعریفیں کیں کہ کیا کہوں۔ بڑا فرماں بردار ہے، پرلے سرے کا ایمان دار، بلا کا محنتی، غضب کا سلیقہ شعار اور انتہا درجے کا باتمیز۔ خیر، میں نے رکھ لیا۔ میں بار بار کیونکر ان کی باتوں میں آجاتی ہوں، مجھے خود تعجّب ہے۔ یہ آدمی صرف شکل سے آدمی تھا۔ آدمیت کی کوئی علامت اس میں نہ تھی۔ کسی کام کی تمیز نہیں۔ بے ایمان نہ تھا، مگر احمق اول نمبر کا۔ بے ایمان ہوتا تو کم سے کم اتنی تسکین تو ہوتی کہ خود کھاجاتا ہے۔ کم بخت دوکانداروں کی فطرتوں کا شکار ہو جاتا تھا۔ اُسے دس تک کی گنتی بھی نہ آتی تھی۔ ایک روپیہ دے کر بازار بھیجوں تو شام تک حساب نہ سمجھا سکے۔ غصّہ پی پی کر رہ جاتی تھی۔ خون جوش کھانے لگتا تھا کہ سُوَر کے کان اُکھاڑ لوں۔ مگر ان حضرت کو کبھی اسے کچھ کہتے نہیں دیکھا۔ آپ نہا کر دھوتی چھانٹ رہے ہیں اور وہ دور بیٹھا تماشہ دیکھ رہا ہے۔ میرا خون کھولنے لگتا لیکن انھیں ذرا بھی احساس نہیں ہوتا۔ جب میرے ڈانٹنے پر دھوتی چھانٹنے جاتا بھی تو آپ اُسے قریب نہ آنے دیتے۔ اس کے عیبوں کو ہنر بنا کر دکھایا کرتے تھے اور اس کوشش میں کامیاب نہ ہوتے تو ان عیوب پر پردہ ڈال دیتے تھے۔ کمبخت کو جھاڑو دینے کی بھی تمیز نہ تھی۔ مردانہ کمرہ ہی تو سارے گھر میں ڈھنگ کا ایک کمرہ ہے۔ اس میں جھاڑو دیتا تو اِدھر کی چیز اُدھر، اوپر کی نیچے گویا سارے کمرہ میں زلزلہ آگیا ہو اور گرد کا یہ عالم کہ سانس لینی مشکل۔ مگر آپ کمرہ میں اطمینان سے بیٹھے رہتے، گویا کوئی بات ہی نہیں۔ ایک دن میں نے اُسے خوب ڈانٹا اور کہہ دیا اگر کل

سے تو نے سلیقہ سے جھاڑو نہ دی تو کھڑے کھڑے نکال دونگی۔ سویرے سو کر اٹھی تو دیکھتی ہوں کمرہ میں جھاڑو دی ہوئی ہے۔ ہر ایک چیز قرینہ سے رکھی ہے، گرد و غبار کا کہیں نام نہیں۔ آپ نے فوراً ہنسکر کہا دیکھتی کیا ہو، آج گھورے نے بڑے سویرے جھاڑو دی ہے۔ میں نے سمجھا دیا۔ تم طریقہ تو بتاتی نہیں ہو، اُلٹی ڈانٹنے لگتی ہو۔ لیجئے صاحب، یہ بھی میری ہی خطا تھی۔ خیر۔ میں نے سمجھا اس نالائق نے کم سے کم ایک کام تو سلیقہ کے ساتھ کیا۔ اب روز کمرہ صاف ستھرا ملتا۔ اور میری نگاہوں میں گھورے کی کچھ وقعت ہونے لگی۔ اتفاق کی بات۔ ایک دن میں ذرا معمول سے سویرے اُٹھ بیٹھی اور کمرے میں آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ گھورے دروازے پر کھڑا ہے اور خود بدولت بڑی تندہی سے جھاڑو دے رہے ہیں۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ ان کے ہاتھ سے جھاڑو چھین لی اور گھورے کے سر پر پٹک دی۔ حرام خور کو اسی وقت دھتکار بتائی۔ آپ فرمانے لگے اس کی تنخواہ تو بیباق کر دو۔ خوب! ایک تو کام نہ کرے دوسرے آنکھیں دکھائے، اس پر تنخواہ بھی دیدوں۔ میں نے ایک کوڑی بھی نہ دی۔ ایک کُرتہ دیا تھا وہ بھی چھین لیا۔ اس پر حضرت کئی دن مجھ سے روٹھے رہے۔ گھر چھوڑ کر بھاگے جا رہے تھے۔ بڑی مشکلوں سے رُکے۔

ایک دن مہتر نے اتارے کپڑوں کا سوال کیا۔ اس بیکاری کے زمانے میں فالتو کپڑے کس کے گھر میں ہیں۔ شاید رئیسوں کے گھر میں ہوں۔ میرے یہاں تو ضروری کپڑے بھی کافی نہیں۔ حضرت ہی کا توشہ خانہ ایک بقچی میں آجائے گا جو ڈاک کے پارسل سے کہیں بھیجا جا سکتا ہے۔ پھر اس سال سردی کے موسم میں نئے کپڑے بنوانے کی نوبت بھی نہ آئی تھی۔ میں نے مہتر کو صاف جواب دے دیا۔ سردی شدّت کی تھی۔ اس کا مجھے خود احساس تھا۔ غریبوں پر کیا گزرتی ہے، اس کا بھی علم تھا۔ لیکن میرے یا آپ کے پاس اس کا افسوس کے سوا اور کیا علاج ہے۔ جب رؤسا اور امراء کے پاس ایک ایک مال گاڑی کپڑوں سے بھری پڑی ہوئی ہے تو پھر غربا کیوں نہ برہنگی کا عذاب جھیلیں۔ خیر۔ میں نے تو اسے جواب دے دیا۔ آپ نے کیا کیا کہ اپنا کوٹ اٹھا کر اس کے حوالے کر دیا۔ میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ حضرت کے پاس یہی ایک

کوٹ تھا۔ یہ خیال نہ ہوا کہ پہنیں گے کیا۔ مہتر نے سلام کیا، دعائیں دیں، اور اپنی راہ لی۔ آخر کئی دن سردی کھاتے رہے۔ صبح کو گھومنے جایا کرتے تھے، وہ سلسلہ بند ہو گیا۔ مگر دل بھی انھیں قدرت نے عجیب قسم کا دیا ہے۔ پھٹے پرانے کپڑے پہنتے آپ کو شرم نہیں آتی۔ میں تو کٹ جاتی ہوں۔ آپ کو مطلق احساس نہیں۔ کوئی ہنستا ہے تو ہنسے آپ کی بلا سے۔ آخر مجھ سے نہ دیکھا گیا تو ایک کوٹ بنوا دیا۔ جی تو جلتا تھا کہ خوب سردی کھانے دوں مگر ڈری کہ کہیں بیمار پڑ جائیں تو اور بھی آفت آجائے آخر کام تو انھیں کو کرنا ہے۔

یہ اپنے دل میں سمجھتے ہوں گے میں کتنا نیک نفس اور منکسر مزاج ہوں۔ شاید انھیں ان اوصاف پر ناز ہو۔ میں انھیں نیک نفس نہیں سمجھتی۔ نہ منکسر مزاج ہی سمجھتی ہوں۔ یہ سادہ لوحی ہے سیدھی سادی حماقت۔ جس مہتر کو آپ نے اپنا کوٹ دیا اسی کو میں نے کئی بار رات کو شراب کے نشہ میں بدمست، جھومتے دیکھا ہے اور آپ کو دکھا بھی دیا ہے تو پھر دوسروں کی کج روی کا تاوان ہم کیوں دیں۔ اگر آپ نیک نفس اور فیاض ہوتے تو گھر والوں سے بھی تو فیاضانہ برتاؤ کرتے یا ساری فیاضی باہر والوں کے لئے ہی مخصوص ہے۔ گھر والوں کو اس کا عشر عشیر بھی نہ ملنا چاہیئے؟ اتنی عمر گذر گئی مگر اس شخص نے کبھی اپنے دل سے میرے لئے ایک سوغات بھی نہ خریدی۔ بیشک میں جو چیز طلب کروں اسے بازار سے لانے میں انھیں کلام نہیں بطلق عذر نہیں۔ مگر روپے میں دیدوں یہ شرط ہے۔ انھیں خود کبھی توفیق نہیں ہوتی۔ یہ میں مانتی ہوں کہ بیچارے اپنے لئے بھی کبھی کچھ نہیں لاتے۔ میں جو کچھ منگوا دوں اسی پر قناعت کر لیتے ہیں۔ مگر آخر انسان کبھی کبھی شوق کی چیزیں چاہتا ہی ہے۔ اور مردوں کو دیکھتی ہوں۔ گھر میں عورت کے لئے طرح طرح کے زیور۔ کپڑے۔ شوق سنگار کے لوازمات لاتے رہتے ہیں۔ یہاں یہ رسم ممنوع ہے۔ بچوں کے لئے بھی مٹھائی، کھلونے۔ باجے۔ بگل شاید اپنی زندگی میں ایک بار بھی نہ لائے ہوں قسم سی کھالی ہے۔ اس لئے میں تو انھیں بخیل کہوں گی۔ بدشوق کہوں گی، مردہ دل کہوں گی فیاض نہیں کہہ سکتی۔ دوسروں کے ساتھ ان کا جو فیاضانہ سلوک ہے اسے میں حرص نمود اور

سادہ لوحی پر محمول کرتی ہوں۔ آپ کی منکسر مزاجی کا یہ عالم ہے کہ جس دفتر میں آپ ملازم ہیں اس کے کسی عہدے دار سے آپ کا میل جول نہیں۔ افسروں کو سلام کرنا تو آپ کے آئین کے خلاف ہے۔ نذر نیاز ڈالی تو دور کی بات ہے۔ اور تو اور، کبھی کسی افسر کے گھر جاتے بھی نہیں۔ اس کا خمیازہ آپ نہ اٹھائیں تو کون اٹھائے۔ اوروں کو رعایتی چھٹیاں ملتی ہیں، آپ کی تنخواہ کٹتی ہے۔ اوروں کی ترقیاں ہوتی ہیں آپ کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ حاضری میں پانچ منٹ بھی دیر ہو جائے تو جواب طلب ہو جاتا ہے۔ بیچارے جی توڑ کر کام کرتے ہیں۔ کوئی پیچیدہ مشکل کام آجائے تو انھیں کے سر منڈھا جاتا ہے۔ انھیں مطلق عذر نہیں۔ دفتر میں انھیں گھسّو اور پِٹّو وغیرہ خطابات ملے ہوئے ہیں۔ مگر منزل کتنی ہی دشوار طے کریں، ان کی تقدیر میں وہی سوکھی گھاس لکھی ہے۔ یہ انکسار نہیں ہے۔ میں تو اسے زمانہ شناسی کا فقدان کہتی ہوں۔ آخر کیوں کوئی شخص آپ سے خوش ہو دنیا میں مروت اور رواداری سے کام چلتا ہے۔ اگر ہم کسی سے کھنچے رہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہم سے نہ کھچا رہے۔ پھر جب دل میں کبیدگی ہوتی ہے تو وہ دفتری تعلقات میں بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔ جو ماتحت افسر کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے، جس کی ذات سے افسر کو کوئی ذاتی فائدہ پہنچتا ہے یا جس پر اعتماد ہوتا ہے اس کا لحاظ وہ لازمی طور پر کرتا ہے۔ ایسے بے غرضوں سے کیوں کسی کو ہمدردی ہونے لگی۔ افسر بھی انسان ہیں۔ اس کے دل میں جو اعزاز و امتیاز کی ہوس ہے وہ کہاں پوری ہو۔ جب اس کے ماتحت ہی فرنٹ رہیں۔ آپ نے جہاں ملازمت کی وہیں سے نکالے گئے۔ کبھی کسی دفتر میں سال دو سال سے زیادہ نہ چلے۔ یا تو افسروں سے لڑ گئے۔ یا کام کی کثرت کی شکایت کر بیٹھے۔

آپ کو کنبہ پروری کا دعویٰ ہے۔ آپ کے کئی بھائی بھتیجے ہیں۔ وہ کبھی آپ کی بات بھی نہیں پوچھتے مگر آپ برابر ان کا منہ تاکتے رہتے ہیں۔ ان کے ایک بھائی صاحب آجکل تحصیلدار ہیں۔ گھر کی جائداد انھیں کی نگرانی میں ہے۔ وہ شان سے رہتے ہیں۔ موٹر خرید لی ہے۔ کئی نوکر ہیں۔ مگر یہاں بھولے سے بھی خط نہیں لکھتے۔ ایک بار ہمیں روپے کی سخت ضرورت ہوئی

میں نے کہا اپنے برادر مکرّم سے کیوں نہیں مانگتے۔ کہنے لگے کیوں انھیں پریشان کروں۔ آخر انھیں بھی تو اپنا خرچ کرنا ہے۔ کون سی ایسی بچت ہو جاتی ہو گی۔ میں نے بہت مجبور کیا تو آپ نے خط لکھا معلوم نہیں خط میں کیا لکھا۔ لیکن روپے نہ آنے تھے نہ آئے۔ کئی دنوں کے بعد میں نے پوچھا کچھ جواب آیا حضور کے بھائی صاحب کے دربار سے؟ آپ نے ترش ہو کر کہا ابھی ایک ہفتہ تو خط پہنچے ہوئے ابھی کیا جواب آسکتا ہے۔ ایک ہفتہ اور گذرا۔ اب آپ کا یہ حال ہے کہ مجھے کوئی بات چیت کرنے کا موقع ہی نہیں عطا فرماتے۔ اتنے بشاش نظر آتے ہیں کہ کیا کہوں۔ باہر سے آتے ہیں تو خوش خوش کوئی نہ کوئی شگوفہ لئے ہوئے۔ میری خوشامد بھی خوب ہو رہی ہے۔ میرے میکے والوں کی تعریف بھی ہو رہی ہے۔ میں حضرت کی چال سمجھ رہی تھی۔ یہ ساری دلجوئیاں محض اس لئے تھیں کہ آپ کے برادر مکرم کے متعلق کچھ پوچھ نہ بیٹھوں۔ سارے ملکی، مالی، اخلاقی، تمدنی، مسائل میرے سامنے بیان کئے جاتے تھے۔ اتنی تفصیل اور شرم کے ساتھ کہ پروفیسر بھی دنگ رہ جائے۔ محض اس لئے کہ مجھے اس امر کی بابت کچھ پوچھنے کا موقع نہ ملے لیکن میں کب چوکنے والی تھی۔ جب پورے دو ہفتہ گذر گئے اور بیمہ کمپنی کے روپے روانہ کرنے کی تاریخ موت کی طرح سر پر آپہنچی تو میں نے پوچھا کیا ہوا۔ تمہارے بھائی صاحب نے دہن مبارک سے کچھ فرمایا۔ یا ابھی تک خط ہی نہیں پہنچا۔ آخر ہمارا حصہ بھی گھر کی جائداد میں کچھ ہے یا نہیں؟ یا ہم کسی لونڈی باندی کی اولاد ہیں؟ پانچ سو روپے سال کا نفع نو دس سال قبل تھا۔ اب ایک ہزار سے کم نہ ہو گا۔ کبھی ایک جھنجھی کوڑی بھی ہمیں نہیں ملی۔ موٹے حساب سے ہمیں دو ہزار ملنا چاہیئے۔ دو ہزار نہ ہو۔ ایک ہزار ہو، پانچ سو ہو۔ ڈھائی سو ہو۔ کچھ نہ ہو تو بیمہ کمپنی کے پریمیم بھر کو تو ہو۔ تحصیلدار کی آمدنی ہماری آمدنی کی چوگنی ہے۔ رشوتیں بھی لیتے ہی ہیں۔ تو پھر ہمارے روپے کیوں نہیں دیتے۔ آپ ہیں ہیں ہاں ہاں کرنے لگے۔ یہ بیچارے گھر کی مرمّت کراتے ہیں۔ عزیزو اقارب کی مہمان داری کا بار بھی تو انھیں پر ہے۔ خوب! گویا جائداد کا منشا محض یہ ہے کہ اس کی کمائی اسی میں صرف ہو جائے۔ اس بھلے آدمی کو بہانے گھڑنے بھی نہیں آتے۔ مجھ سے پوچھتے میں ایک نہیں ہزار بتا دیتی

کہہ دیتے گھر میں آگ لگ گئی۔ سارا اثاثہ جل کر خاک ہو گیا۔ یا چوری ہو گئی۔ چور نے گھر میں تنکا تک نہ چھوڑا۔ یا دس ہزار کا غلہ خریدا تھا اس میں خسارہ ہو گیا، گھاٹے سے بیچنا پڑا۔ یا کسی سے مقدمہ بازی ہو گئی، اس میں دیوالہ پٹ گیا۔ آپ کو سوجھی بھی تو پھر سی بات۔ اسی جولانی طبع پر آپ مصنف اور شاعر بھی بنتے ہیں۔ تقدیر ٹھونک کر بیٹھ رہی۔ پڑوس کی بیوی سے قرض لئے تب جا کر کام چلا۔ پھر بھی آپ بھائی بھتیجوں کی تعریف کے پل باندھتے ہیں تو میرے جسم میں آگ لگ جاتی ہے۔ ایسے برادران یوسف سے خدا بچائے!

خدا کے فضل سے آپ کے دو بچے ہیں۔ دو بچیاں بھی ہیں۔ خدا کا فضل کہوں یا خدا کا قہر کہوں۔ سب کے سب اتنے شریر ہو گئے ہیں کہ معاذ اللہ۔ مگر کیا مجال کہ یہ بھلے مانس کسی بچے کو تیز نگاہ سے بھی دیکھیں۔ رات کے آٹھ بج گئے ہیں، بڑے صاحبزادے ابھی گھوم کر نہیں آئے ہیں گھبرا رہی ہوں۔ آپ اطمینان سے بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہیں۔ جھلائی ہوئی آتی ہوں، اور اخبار چھین کر کہتی ہوں جا کر ذرا دیکھتے کیوں نہیں لونڈا کہاں رہ گیا۔ نہ جانے تمہارے دل میں کچھ قلق ہے بھی یا نہیں۔ تمہیں تو خدا نے اولاد ہی ناحق دی۔ آج آئے تو خوب ڈانٹنا۔ تب آپ بھی گرم ہو جاتے ہیں۔ ابھی تک نہیں آیا! بڑا شیطان ہے۔ آج بچا آتے ہیں تو کان اکھاڑ لیتا ہوں۔ مارے ہنٹروں کے کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔ یوں بگڑ کر، طیش کے عالم میں آپ اس کی تلاش کرنے نکلتے ہیں۔ اتفاق سے آپ اُدھر جاتے ہیں، اِدھر لڑکا آجاتا ہے۔ میں کہتی ہوں تو کدھر سے آگیا۔ وہ بیچارے تجھے ڈھونڈھنے گئے ہوئے ہیں۔ دیکھنا آج کیسی مرمت ہوتی ہے یہ عادت ہی چھوٹ جائے گی۔ دانت پیس رہے تھے۔ آتے ہی ہوں گے۔ چھڑی بھی ہاتھ میں ہے۔ تم اتنے شریر ہو گئے ہو کہ بات نہیں سنتے؟ آج قدر عافیت معلوم ہو گی۔ لڑکا سہم جاتا ہے اور لیمپ جلا کر پڑھنے لگتا ہے۔ آپ ڈیڑھ دو گھنٹے میں لوٹتے ہیں۔ حیران و پریشان، اور بدحواس۔ گھر میں قدم رکھتے ہی پوچھتے ہیں آیا کہ نہیں؟ میں ان کا غصہ بھڑکانے کے ارادے سے کہتی ہوں۔ آ کر بیٹھا تو ہے۔ جا کر پوچھتے کیوں نہیں؟ پوچھ کر

ہار گئی کہاں گیا تھا۔ کچھ بولتا ہی نہیں۔

آپ گرج پڑتے ہیں۔ منّو۔ یہاں آؤ۔

لڑکا تھر تھر کانپتا ہوا آکر آنگن میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ دونوں بچیاں گھر میں چھپ جاتی ہیں کہ خدا جانے کیا آفت نازل ہونے والی ہے۔ چھوٹا بچہ کھڑکی سے چوہے کی طرح جھانک رہا ہے۔ آپ جامہ سے باہر ہیں، ہاتھ میں چھڑی ہے۔ میں بھی وہ غضبناک چہرہ دیکھ کر پچھتانے لگتی ہوں کہ کیوں ان سے شکایت کی۔ آپ لڑکے کے پاس جاتے ہیں۔ مگر بجائے اس کے کہ چھڑی سے اس کی مرمت کریں آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بناوٹی غصّہ سے کہتے ہیں، تم کہاں گئے تھے جی۔ منع کیا جاتا ہے، مانتے نہیں ہو۔ خبردار جواب اتنی دیر کی۔ آدمی شام کو گھر چلا آتا ہے یا اِدھر اُدھر گھومتا ہے؟

میں سمجھ رہی ہوں کہ یہ تمہید ہے۔ قصیدہ اب شروع ہوگا۔ گریز تو بری نہیں لیکن یہاں تمہید ہی خاتمہ ہو جاتی ہے۔ بس آپ کا غصّہ فرو ہو گیا۔ لڑکا اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے اور غالباً خوشی سے اُچھلنے لگتا ہے۔

میں احتجاج کی صدا بلند کرتی ہوں "تم تو جیسے ڈر گئے۔ بھلا دو چار طمانچے تو لگائے ہوتے۔ اسی طرح تو لڑکے شیر ہو جاتے ہیں۔ آج آٹھ بجے آیا ہے کل نو کی خبر لیگا۔ اس نے بھی دل میں کیا سمجھا ہوگا۔"

آپ فرماتے ہیں "تم نے سنا نہیں میں نے کتنے زور سے ڈانٹا۔ بچہ کی روح ہی فنا ہو گئی ہوگی۔ دیکھ لینا جو پھر کبھی دیر میں آئے۔"

"تم نے ڈانٹا تو نہیں، ہاں آنسو پونچھ دیئے۔"

آپ نے ایک نئی اُپج نکالی ہے کہ لڑکے تادیب سے خراب ہو جاتے ہیں۔ آپ کے خیال میں لڑکوں کو آزاد رہنا چاہیئے۔ ان پر کسی قسم کی بندش یا دباؤ نہ ہونا چاہیئے۔ بندش سے آپ کے خیال میں لڑکے کی دماغی نشوونما میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ

لڑکے شتر بے مہار بنے ہوئے ہیں۔ کوئی ایک منٹ بھی کتاب کھول کر نہیں بیٹھتا۔ کبھی گلی ڈنڈا ہے کبھی گولیاں، کبھی کنکوے۔ حضرت بھی انھیں کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ چالیس سال سے تو متجاوز آپ کی عمر ہے مگر لڑکپن دل سے نہیں گیا۔ میرے باپ کے سامنے مجال تھی کہ کوئی لڑکا کنکوا اُڑا لے یا گلی ڈنڈا کھیل سکے۔ خون پی جاتے۔ صبح سے لڑکوں کو پڑھانے بیٹھ جاتے۔ سکول سے جونہی لڑکے واپس آتے پھر لے بیٹھتے۔ بس شام کو آدھ گھنٹے کی چھٹی دیتے۔ رات کو پھر کام میں جوت دیتے۔ یہ نہیں کہ آپ تو اخبار پڑھیں اور لڑکے گلی گلی خاک چھانتے پھریں۔ کبھی کبھی آپ بھی سینگ کٹا کر بچھڑے بن جاتے ہیں۔ لڑکوں کے ساتھ تاش کھیلنے بیٹھ جاتے ہیں ایسے باپ کا بھلا لڑکوں پر کیا رُعب ہو سکتا ہے۔ ابّا جان کے سامنے میرے بھائی سیدھے آنکھ اٹھا کر دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ان کی آواز سنتے ہی قیامت آجاتی تھی۔ انھوں نے گھر میں قدم رکھا اور خموشی طاری ہوئی۔ ان کے روبرو جاتے ہوئے لڑکوں کی جان نکلتی تھی اور اسی تعلیم کی یہ برکت ہے کہ سبھی اچھے عہدوں پر پہنچ گئے۔ صحت البتہ کسی کی بہت اچھی نہیں ہے۔ تو ابّا جان کی ہی صحت کون بہت اچھی تھی۔ بیچارے ہمیشہ کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا رہتے۔ پھر لڑکوں کی صحت کہاں سے اچھی ہو جاتی۔ لیکن کچھ بھی ہو۔ تعلیم و تادیب میں انھوں نے کسی کے ساتھ رعایت نہیں کی۔

ایک روز میں نے حضرت کو بڑے صاحبزادے کو کنکوا اُڑانے کی تعلیم دیتے دیکھا۔ یوں گھماؤ، یوں غوطہ دو، یوں کھینچو، یوں ڈھیل دو۔ ایسا دل و جان سے سکھا رہے تھے گویا گرومنتر دے رہے ہوں۔ اس دن میں نے بھی ان کی ایسی خبر لی کہ یاد کرتے ہوں گے۔ میں نے صاف کہہ دیا تم کون ہوتے ہو میرے بچوں کو بگاڑنے والے۔ تمھیں گھر سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ نہ ہو۔ لیکن آپ میرے بچوں کو خراب نہ کیجئے۔ بُرے بُرے شوق نہ پیدا کیجئے۔ اگر آپ انھیں سدھار نہیں سکتے تو کم سے کم بگاڑئیے نہیں۔ لگے باتیں بنانے۔ ابّا جان کسی لڑکے کو میلے تماشے نہیں لیجاتے تھے لڑکا سر پٹک کر مر جائے مگر ذرا بھی نہ پسیجتے تھے اور ان بھلے آدمی کا یہ حال ہے کہ ایک ایک سے

پوچھ کر میلے لے جاتے ہیں۔ چلو چلو، وہاں بڑی بہار ہے، خوب آتشبازیاں چھوٹیں گی، غبارے اڑیں گے۔ ولایتی چرخیاں بھی ہیں۔ ان پر مزے سے بیٹھنا۔ اور تو اور۔ آپ لڑکوں کو ہاکی کھیلنے سے بھی نہیں روکتے۔ یہ انگریزی کھیل بھی کتنے خوفناک ہوتے ہیں۔ کرکیٹ، فٹ بال، ہاکی ایک سے ایک مہلک۔ گیند لگ جائے تو جان ہی لے کر چھوڑے۔ مگر آپ کو ان کھیلوں سے بڑی رغبت ہے۔ کوئی لڑکا میچ میں جیت کر آجاتا ہے تو کتنے خوش ہوتے ہیں گویا کوئی قلعہ فتح کر آیا ہو۔ حضرت کو ذرا بھی اندیشہ نہیں ہے کہ کسی لڑکے کو چوٹ لگ گئی تو کیا ہوگا ہاتھ پاؤں ٹوٹ گیا تو بیچاروں کی زندگی کیسے پار لگے گی۔

پچھلے سال لڑکی کی شادی تھی۔ آپ کو یہ ضد تھی کہ جہیز کے نام کانی کوڑی بھی نہ دیں گے، چاہے لڑکی ساری عمر کنواری بیٹھی رہے۔ آپ اہل دنیا کی خبیث النفسی آئے دن دیکھتے رہتے ہیں، پھر بھی چشم بصیرت نہیں کھلتی۔ جب تک سماج کا یہ نظام قائم ہے اور لڑکی کا بلوغ کے بعد کنواری رہنا انگشت نمائی کا باعث ہے، اس وقت تک یہ رسم فنا نہیں ہوسکتی۔ دو چار افراد بھلے ہی ایسے بیدار مغز نکل آئیں جو جہیز لینے سے احتراز کریں، لیکن اس کا اثر عام حالات پر بہت کم ہوتا ہے اور برائی بدستور قائم رہتی ہے۔ جب لڑکوں کی طرح لڑکیوں کے لئے بھی بیس پچیس کی عمر تک کنواری رہنا بدنامی کا باعث نہ سمجھا جائے گا اس وقت آپ ہی آپ یہ رسم رخصت ہو جائے گی۔ میں نے جہاں جہاں پیغام دیئے جہیز کا مسئلہ پیدا ہوا اور آپ نے ہر موقع پر ٹانگ اڑائی۔ جب اس طرح ایک پورا سال گذر گیا اور لڑکی کا سترہواں سال شروع ہو گیا تو میں نے ایک جگہ بات پکی کر لی۔ حضرت بھی راضی ہو گئے۔ کیونکہ ان لوگوں نے قرارداد نہیں کی۔ حالانکہ دل میں انھیں پورا یقین تھا کہ اچھی رقم ملے گی اور میں نے بھی طے کر لیا تھا کہ اپنے مقدور بھر کوئی بات اٹھا نہ رکھوں گی شادی کے بہ خیر و عافیت انجام پانے میں کوئی شبہہ نہ تھا۔ لیکن ان مہاشے کے آگے میری ایک نہ چلتی تھی۔ یہ رسم بیہودہ ہے۔ یہ رسم بے معنی ہے۔ یہاں روپیہ کی کیا ضرورت؟ یہاں گیتوں

کی کیا ضرورت؟ ناک میں دم تھا۔ یہ کیوں، وہ کیوں؟ یہ تو صاف چھیڑ ہے۔ تم نے میرے منہ میں کالک لگادی۔ میری آبرو مٹادی۔ ذرا خیال کیجئے بارات دروازے پر پڑی ہوئی ہے اور یہاں بات بات پر ردّوقدح ہو رہی ہے۔ شادی کی ساعت رات کے بارہ بجے تھی اس دن لڑکی کے ماں باپ برت رکھتے ہیں۔ میں نے بھی برت رکھا۔ لیکن آپ کو ضد تھی کہ برت کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب لڑکے کے والدین برت نہیں رکھتے تو لڑکی کے والدین کیوں رکھیں۔ میں اور سارا خاندان ہر چند منع کرتا رہا لیکن آپ نے حسبِ معمول ناشتہ کیا۔ کھانا کھایا۔ خیر۔ رات کو شادی کے وقت کنیا دان کی رسم آئی۔ آپ کو کنیا دان کی رسم پر ہمیشہ سے اعتراض ہے۔ اسے آپ مہمل سمجھتے ہیں۔ لڑکی دان کی چیز نہیں۔ دان روپے پیسے کا ہوتا ہے۔ جانور بھی دان دئے جا سکتے ہیں۔ لیکن لڑکی کا دان ایک لچر سی بات ہے کتنا سمجھاتی ہوں صاحب، پرانا رواج ہے۔ شاستروں میں صاف اس کا حکم ہے۔ عزیز و اقارب سمجھا رہے ہیں مگر آپ ہیں کہ کان پہ جوں نہیں رینگتی۔ کہتی ہوں، دنیا کیا کہے گی؟ یہ لوگ کیا بالکل لامذہب ہوگئے۔ مگر آپ کان ہی نہیں دیتے۔ پیروں پڑی۔ یہاں تک کہا کہ بابا تم کچھ نہ کرنا۔ جو کچھ کرنا ہوگا میں کرلوں گی تم صرف چل کر منڈپ میں لڑکی کے پاس بیٹھ جاؤ اور اسے دعا دو۔ مگر اس مردِ خدا نے مطلق سماعت نہ کی۔ آخر مجھے رونا آگیا۔ باپ کے ہوتے میری لڑکی کا کنیا دان چچا یا ماموں کرے، یہ مجھے منظور نہ تھا۔ میں نے تنہا کنیا دان کی رسم ادا کی۔ آپ گھر میں جھانکے تک نہیں۔ اور لطف یہ کہ آپ ہی مجھ سے روٹھ بھی گئے۔ بارات کی رخصتی کے بعد مجھ سے مہینوں بولے نہیں۔ جھک مار کر مجھی کو منانا پڑا۔

مگر کچھ عجیب دل لگی ہے کہ ان ساری برائیوں کے باوجود میں ان سے ایک دن کے لئے بھی جدا نہیں رہ سکتی۔ ان سارے عیوب کے باوجود میں انھیں پیار کرتی ہوں۔ ان میں وہ کون سی خوبی ہے جس پر میں فریفتہ ہوں مجھے خود نہیں معلوم۔ مگر کوئی چیز ہے ضرور جو مجھے ان کا غلام بنائے ہوئے ہے۔ وہ ذرا معمول سے دیر میں گھر آتے ہیں تو میں بے صبر

ہو جاتی ہوں۔ ان کا سر بھی درد کرے تو میری جان نکل جاتی ہے۔ آج اگر تقدیر ان کے عوض مجھے کوئی علم اور عقل کا پتلا، حُسن اور دولت کا دیوتا بھی دے تو میں اس کی طرف آنکھیں اُٹھا کر نہ دیکھوں۔ یہ فرض کی بیڑی نہیں ہے۔ ہرگز نہیں۔ یہ رواجی وفاداری بھی نہیں ہے۔ بلکہ ہم دونوں کی فطرتوں میں کچھ ایسی رواداریاں، کچھ ایسی صلاحیتیں پیدا ہو گئی ہیں گویا کسی مشین کے کل پُرزے گھِس گھِسا کر فٹ ہو گئے ہوں۔ اور ایک پُرزے کی جگہ دوسرا پرزہ کام نہ دے سکے چاہے وہ پہلے سے کتنا ہی سڈول اور نیا اور خوشنما کیوں نہ ہو۔ جانے ہوئے رستے سے ہم بے خوف، آنکھیں بند کئے چلے جاتے ہیں۔ اس کے نشیب و فراز، موڑ اور گھماؤ، سب ہماری آنکھوں میں سمائے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس کسی انجان رستے پر چلنا کتنی زحمت کا باعث ہو سکتا ہے۔ قدم قدم پر گمراہ ہو جانے کے اندیشے۔ ہر لحظہ چور اور رہزن کا خوف! بلکہ شاید آج میں ان کی برائیوں کو خوبیوں سے تبدیل کرنے پر بھی تیار نہیں۔





سانپ کے منہ میں مینڈک نہ اُگلا جائے نہ نگلا جائے۔



اسپین کے ساتھ مدعیانِ ہمدردی کی دستگیری

ورسائی کے معاہدے پر ایک اور ضرب

ورسائی کے معاہدہ میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ جرمنی دریا بین الاقوامی اختیار میں رہیں گے لیکن ہٹلر نے نومبر ۱۹۳۶ء میں اپنے ملک کے سب دریاؤں پر کامل قبضہ کا اعلان کر دیا۔



دنیا کی بڑی طاقتوں کا جنگی ساز و سامان

بحری قوت - ایک جہاز برابر ہے ایک لاکھ ٹن کے

برطانیہ	ٹن ۱۱۹۱۰۰۰
امریکہ	″ ۱۰۷۳۰۰۰
جاپان	″ ۸۵۰۰
فرانس	″ ۵۰۲۰۰۰
اٹلی	″ ۴۱۶۵۰۰
روس	″ ۲۰۰۰۰۰
جرمنی	″ ۱۸۰۰۰۰

ہوائی طاقت - ایک جہاز برابر ہے ۵۰۰ جہازوں کے

روس	۴۰۰۰
برطانیہ	۳۵۰۰
فرانس	۳۱۰۰
جرمنی	۳۰۰۰
اٹلی	۳۰۰۰
امریکہ	۱۵۰۰
جاپان	۱۰۰۰

بری طاقت

ایک آدمی برابر ہے ایک لاکھ فوج کے

جرمنی سپاہی	۱۲۰۰۰۰۰
روس	″ ۱۳۰۰۰۰۰
اٹلی	″ ۷۵۰۰۰۰
فرانس	″ ۶۶۵۰۰۰
برطانیہ	″ ۵۴۰۰۰۰
جاپان	″ ۴۰۰۰۰۰
امریکہ	″ ۱۴۰۰۰۰

کلام آزاد

جناب حکیم الطاف احمد صاحب آزاد انصاری اردو کے نہایت خوش فکر شعراء میں سے ہیں، غزل گوئی میں آپکا پایہ بہت بلند ہے اور اردو کے چوٹی کے غزل گو شعراء میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ آپ کے کلام کی خصوصیت انتہائی سلاست و روانی کے ساتھ باریک سے باریک فلسفیانہ اور عارفانہ مسائل کا بیان کرنا ہے۔ مگر اس کے باوجود آپ کی غزل، غزل کے حدود سے متجاوز ہو کر وعظ و خطبہ کی صورت نہیں اختیار کرتی اسکی رنگینی اور دلکشی برابر قائم رہتی ہے۔ ذیل میں ہم موصوف کی زیر طبع دیوان سے چند غزلیں منتخب کرکے پیش کرتے ہیں۔ اس انتخاب کا باقی حصہ اگلی اشاعت میں شائع کیا جائے گا۔

حالِ دلِ فگار سنایا نہ جائے گا — زخمِ درونِ سینہ دکھایا نہ جائے گا
ظاہر کا ربط و ضبط بڑھانے سے فائدہ — دل ایسی چیز ہے کہ گنوایا نہ جائے گا
اک مدعائے واجب الاظہار دل میں ہے — لیکن زبان تک کبھی لایا نہ جائے گا
یارانِ غمگسار کی غمخواریاں فضول — الفت وہ درد ہے کہ بٹایا نہ جائے گا
اب تیری عادتوں کا بدلنا محال ہے — جو ہم نے کھو دیا ہے وہ پایا نہ جائے گا
تیرے ستم جو آج نہ بھولے تو کل سہی — لیکن ترا خیال بھلایا نہ جائے گا
انجامِ کار کا بھی تجھے کچھ خیال ہے — کیا جو سنائیگا وہ سنایا نہ جائے گا
غیروں کے واسطے ہی مسیحائے وقت ہو — ہم کو تو خاک میں بھی ملایا نہ جائے گا

آزاد مفت جان کھپانے سے فائدہ
قسمت کی خوبیوں سے بر آیا نہ جائے گا

کبھی مہرباں ہو کے دل شاد فرما — کبھی قدرِ خدماتِ آزاد فرما
اگر ہو سکے بھول کر یاد فرما — اگر شاد فرما سکے شاد فرما
کبھی اپنی موجودہ غفلت سے باز آ — کبھی الفتِ ما مضے یاد فرما
یہ خاموشی حیرت افزا کہاں تک — کچھ احباب کے حق میں ارشاد فرما

اسیرانِ الفت بہ تنگ آچکے ہیں
جو خوفِ خدا ہے تو آزاد فرما

کچھ احساسِ تکلیفِ شوقِ نہاں کر
کچھ اظہارِ دردِ خداداد فرما

جو بر لا سکے حاجتِ شوق برلا
جو فرما سکے فکرِ امداد فرما

ترے لطف بے انتہا ہیں تو ہونگے
کبھی کوئی تشریحِ اعداد تو فرما

جہاں تک ہو پامالِ جور و جفا کر
جہاں تک ہو تکمیلِ بیداد فرما

کہاں تک جنونِ تغافل کہاں تک
کچھ اصلاحِ طبعِ خداداد فرما

کبھی شرطِ منصف مزاجی بجا لا
کبھی حق رسیہائے آزاد فرما

شکر ہے کہ دل دے کر یارِ دلربا پایا
یعنی جس قدر کھویا اس سے کچھ سوا پایا

خنجرِ فنا کھا کر ثمرۂ بقا پایا
زیست کی بنا ڈھا کر زیست کا مزا پایا

جس نے ہر دو عالم کو چشمِ غور سے دیکھا
اس نے ہر دو عالم سے تم کو ماورے پایا

ہم نے بے نشاں ہو کر آپ کا نشاں ڈھونڈا
ہم نے آپ کو کھو کر آپ کا پتا پایا

شاد رہ کے بھی شاکر رنج سہہ کے بھی شاکر
بندۂ محبت کو بندۂ رضا پایا

ہم کو بتکدے میں بھی شانِ حق نظر آئی
ہم نے بتکدے کو بھی خانۂ خدا پایا

صرف اک غمِ الفت وجہِ صد خوشی دیکھا
ورنہ ہر تعلق کو رنج و غم فزا پایا

ہاں متاعِ راحت بھی قیمتی سہی لیکن
جنسِ دردِ الفت کو جنسِ بے بہا پایا

اے ندیمِ دور اندیش ابھی نئے عشقِ جاناں ہیں
یہ نہ پوچھ کیا کھویا اس کو دیکھ کیا پایا

اسمیں شک نہیں آزاد شوخ بھی ہے منہ پھٹ بھی
کچھ سہی مگر اس کو آدمی کھرا پایا

سرسبز پھر بہار سے سارا چمن ہوا
معمورِ جلوۂ گل و سرو و سمن ہوا

پھر حکمِ مے کشی مسرت کا عام ہے
پھر اذنِ چارۂ غم و رنج و محن ہوا

پھر شیخ دل سے پیرِ مغاں کا مرید ہے
پھر زاہدوں کا نشۂ تقویٰ ہرن ہوا

پھر محو سادہ زاہد شب زندہ دار ہے
پھر رہن بادہ خرقۂ زہد کہن ہوا

پھر جام لے کے ساقی رنگیں ادا ہوا
پھر گرم نغمہ مطرب گل پیرہن ہوا

پھر صحن گلستاں میں بساط طرب بچھی
پھر شغل مے کشی لب نہر چمن ہوا

پھر جلسۂ طرب میں غزلخوانیاں چھڑیں
پھر انعقاد محفل شعر و سخن ہوا

پھر چار سمت سرو قدوں کے ہجوم ہیں
پھر اجتماع لالہ رخان زمن ہوا

پھر ہم زبان ہر صنم گل بدن بنا
پھر مہربان ہر بت غنچہ دہن ہوا

پھر اختر مقدر عالم چمک اٹھا
پھر آفتاب لطف خدا ضو فگن ہوا

پھر اب کے سال چار طرف اتنے خم لنڈھے
آزاد فاقہ مست بھی پی کر مگن ہوا

حق الفت ادا کریں گے آپ؟
آپ پاس وفا کریں گے آپ؟

ہم فریب نگاہ کیوں کھاتے
کیا خبر تھی دغا کریں گے آپ

کون واقف کسی کا دل لے کر
کیا بنائیں گے کیا کریں گے آپ

آپ کیوں درپئے دل و جاں ہیں
ہم نثار ادا کریں گے آپ

آپ پرسان حال غم ہوں گے؟
آپ خوف خدا کریں گے آپ؟

کب تک آزاد جبر کے ہوتے
صبر پر اکتفا کریں گے آپ

اس کو قید مکاں سے کیا نسبت
بے نشاں ہے نشاں سے کیا نسبت

عرش و کرسی کی رفعتیں برحق،
مگر اس آستاں سے کیا نسبت

مہر بھی ضو فشاں سہی لیکن
اس رخ ضو فشاں سے کیا نسبت

شیخ کعبہ خدا کا گھر ہی سہی — پھر دیرِ مغاں سے کیا نسبت

برق مضطر سہی مگر آزادؔ

میرے قلبِ تپاں سے کیا نسبت

میں وہ بیکس کہ واجبُ الامداد — تو وہ کافر کہ خوگرِ بیداد

دل بھی ناشاد جان بھی ناشاد — ہر طرح جی پہ آ بنی فریاد

ایک دل اور سینکڑوں دلبر — ایک صید اور لاتعد صیّاد

ہائے وہ لطف الفت باہم — یاد ہے آج تک وہ عالم یاد

منزل عشق پر خطر ہے تو ہو — شوق کہتا ہے ہرچہ بادا باد

او ستم دوست انصفی فرما — داد خواہوں پر اور یہ بیداد

کون تابِ مقاومت لاتا — ہم تھے اور تیرے عشق کی افتاد

اب وہ ظالم ہے اور فکرِ جفا — لے امید وفا مبارک باد

نہ وہ صبر و سکون دل باقی — نہ وہ صبر و سکوں کی استعداد

میرے غم سے نمودِ شادی غم — میرے دم سے وجود کون و فساد

کہیں آباد ہی نہ ہونے دیا — بارک اللہ! قسمت برباد

حال آزادؔ کیا گذارش ہو

کہ وہ آزادیاں نہ وہ آزاد

اک مرا دل کہ مصائب کا شکار — اک مری جان کہ صرفِ افکار

تو اور اک چشم عنایت سے دریغ — میں اور امید وفا کا آزار

نامرادانہ بسر ہوتی ہے — نہ وہ دنیا ہے نہ وہ لیل و نہار

نہ وہ تسکین کے پہلو باقی
نہ وہ امید نہ وہ صبر و قرار
نہ کوئی درد و مصیبت کا شریک
نہ کوئی یار نہ کوئی غم خوار
نہ وہ خوش وقتی بزم عشرت
نہ وہ دل چسپئ سیر گلزار
نہ وہ محفل نہ وہ غوغائے نشاط
نہ وہ گلشن نہ وہ دنیائے بہار
نہ وہ آنکھیں نہ وہ رنگیں جلوے
نہ وہ نظریں نہ وہ لطف دیدار
جس جگہ جائیے دل کو وحشت
جس طرف دیکھیے کلفت دوچار
کامرانی کا زمانہ نہ رہا
کوئی حسرت ہو نکلنی دشوار
کیا پڑی ہے کہ کوئی رہبر ہو
میں ہوں اور منزل دشوار گذار
اے ترے لطف کی دنیا بھوکی
اس طرف بھی نگہ لطف شعار
کوئی انجام کا کھٹکا نہ رہا
اے زہے شغل ہجوم افکار
وضع آزاد نرالی دیکھی
ہاتھ میں سبحہ گلے میں زنار

تو کہ ہر وقت غرق جلوۂ ناز
میں کہ دن رات سجدہ ہائے نیاز
بارک اللہ دلربا انداز
آنکھ میں سحر بات میں اعجاز
میری امید یاس کی تمہید
میری تسکین درد کا پرداز
میرے حصے کا اضطراب ازل
میرے قصے کا درد سے آغاز
تیرے گھر کے طواف میرا حج
تیرے در کے سجود میری نماز
تیری منزل بلند تر منزل
میری پرواز پست تر پرداز
وہ کمال کرم وہ غایت قرب
وہ وصال بہم وہ راز و نیاز
طاقت ضبط راز۔ سلب نہ کر
جو مرا راز خود وہ تیرا راز
تم ہمارے ہو ہم تمہارے ہیں
۔ ۔ دل کی آواز غیب کی آواز

شکر احسان دوست، دل بخشا | اور وہ دل کہ درد سے ممتاز
سرمدی زندگی عطا کردی | اے غمِ دوست تیری عمر دراز
بندہ پرور اب آپ کا آزاد
خود ہی بندہ ہے خود ہی بندہ نواز

وہ شیدائے اصنام ہے اور بس | یہ عہد در و بام ہے اور بس
کل آفاق اب تک بایں عقل ورائے | گرفتارِ اوہام ہے اور بس
وجودِ وفا کی تلاشیں عبث | فقط نام ہی نام ہے اور بس
نہ اذکارِ دنیا نہ افکارِ دیں | حدیث مے و جام ہے اور بس
وہی ہم ہیں اور شغل بیکار عشق | وہی فرصت نام ہے اور بس
زمانہ ہے اور کوشش جد و جہد | مگر ہم ہیں آرام ہے اور بس
نہ آزاد مے کش نہ شاہد پرست
وہ کم بخت بدنام ہے اور بس

تو ہے اور فکرِ جفا ہے اور بس | میں ہوں اور شکرِ خدا ہے اور بس
بندہ پرور اس طرف بھی اک نظر | اک نظر کی التجا ہے اور بس
یا تو دل تھا اور لاکھوں مدعا | یا دل بے مدعا ہے اور بس
کوئی بارِ عشق اٹھا سکتا بھی ہو | ادعا ہے ادعا ہے اور بس
عادت چون و چرا کے دن گئے | اب سرِ صبر و رضا ہے اور بس
کل تک اصرار خطا تھا لیکن آج | میں ہوں اقبال خطا ہے اور بس
ہو چکے دنیا کے شکوے ہو چکے | اب فقط تجھ سے گلا ہے اور بس

ناخدا بھی ناخدائی کر چکے
اب خدا کا آسرا ہے اور بس
دوستو ناصح مرا دشمن نہیں
اِک ذرا سر پھر گیا ہے اور بس

شکوۂ جور و جفا سے کیا غرض
کیا غرض اِک بیوفا سے کیا غرض
اب کوئی امید ہی دل میں نہیں
زحمتِ بیم و رجا سے کیا غرض
دل جہاں بہلے وہی گلزار ہے
باغ و گلشن کی فضا سے کیا غرض
مجھ کو اپنی زندگی دو بھر نہیں
التفات جاں فزا سے کیا غرض
آپ کے ارمان بھی تھوڑے نہیں
جستجوئے ماسوا سے کیا غرض
آپ کی حسرت بھی ناکافی نہیں
خواہش ہر دوسرا سے کیا غرض
اب سراپا مدعا ہوں اب مجھے
عرض حال مدعا سے کیا غرض
آپ تکمیلِ ستم فرمائیے
آپ کو خوف خدا سے کیا غرض
جن کو توفیق مے و معشوق ہے
ان کو ضبط اتقا سے کیا غرض
حضرت آزاد ہم اک رند ہیں
پارسایانہ ریا سے کیا غرض

تنقید و تبصرہ

پیلی یاس اور میلی ساند | ڈراما مصنفہ مارس میٹرلنک، مترجمہ جناب ثنائی صاحب، مقدمہ از پروفیسر شرف عالم آرزو جلیلی صاحب، ناشر پنجاب بک ڈپو، تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۶۰ اصفحے۔ قیمت ۱۲

مارس میٹرلنک یورپ کے انوکھے ڈرامانویسوں، ادیبوں اور فلسفیوں میں مشہور ہے۔ انسان کی لاعلمی، بے بسی، موت کے بعد کی انجان دنیا کے خیالی نقشے، یہ اس کے پسندیدہ موضوع ہیں۔ زبان میں اسے خاص ملکہ ہے۔ بلکہ بیشتر فرانسیسی ادیبوں کی طرح اس کا اصل سرمایہ زبان ہی ہے۔ وہ حقیقت نگاری کیا دنیا اور زندگی اور انسانوں کی اس شکل کو جو ہم دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں نظرانداز کر کے تمام تصورات اور جذبات کو تمثیل کے کڑھاؤ میں گھوٹتا ہے اور زبان کے قوام میں ڈال کر نئے نئے مزے کی مٹھائیاں تیار کرتا ہے جن میں سے سب کی تعریف یہ ہے کہ وہ معدے تک پہنچنے نہیں پاتیں۔ کبھی منہ ہی میں گھل کر ہوا بن جاتی ہیں۔ کبھی دماغ میں ہلکا سا سرور پیدا کر کے رہ جاتی ہیں۔

پروفیسر آرزو جلیلی صاحب نے مقدمے میں میٹرلنک کی سوانح حیات اور اس کی ادبی خصوصیات بیان کی ہیں اور خاصی وضاحت سے۔ ترجمہ بھی خاصا رواں ہے۔ لیکن ہم اصل سے مقابلہ نہیں کر سکے۔ اس لئے اسکی صحت کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ چھپائی اچھی نہیں ہے۔ اور نام صحیح پڑھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ شروع میں منیجر صاحب پنجاب بک ڈپو نے فاضل مترجم، اور مقدمہ نویس کا شکریہ ادا کیا ہے۔ اور اشاعت کے آداب میں اس نئی رسم کا اضافہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

م م

نصاب شہریت | مصنفہ پروفیسر عطار اللہ، ایم اے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ ناشر قومی کتب خانہ لاہور، تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۲۸۶ صفحے۔

یہ کتاب مڈل اسکولوں کے طلبار کے لئے تیار کی گئی ہے اور اس میں پنجاب کے حالات خاص طور پر مدنظر رکھے گئے ہیں۔ نظام حکومت کا کوئی بڑا شعبہ توجہ سے محروم نہیں رہا ہے اور آخر میں مجلس اقوام یا لیگ آف نیشنز کا بھی ذکر خیر ہے۔ اگر خیال نہیں رکھا گیا ہے تو طالب علم کی طبیعت اور دلچسپی کا، اور اس حقیقت کا کہ ضروری معلومات کے ساتھ طالب علم کے دل میں ایسے حوصلے پیدا ہونا چاہئیں جو اسے اچھا اور سچا شہری بنائیں۔ اس ایک کتاب کے مضامین کو چار کتابوں میں تقسیم کرکے انھیں اس طرح بیان کرنا چاہئے تھا کہ طالب علم کا شوق بڑھے اور علم سے اسے لگاؤ ہو جائے۔ لیکن دنیا کی مصلحتوں کو کوئی کیا کرے۔

م م

فن انشا پردازی | ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم اے، پی ایچ ڈی، پروفیسر ادبیات اردو، جامعہ عثمانیہ، ناشر کا نام و پتہ درج نہیں۔ تقطیع ۱۶ × ۲۲ ، حجم ۱۱۵ صفحے مع اشاریہ

یہ اس قسم کی کتاب ہے جیسے کہ انگریزی میں کوئلر کاوچ کی تصنیف لکھنے کا فن (THE ART OF WRITING QUILLER COUCH) اور اتنی ہی مفید اور دلچسپ بھی ہے۔ اس میں نومشق ادیبوں کو جو ہدایتیں دی گئی ہیں وہ بیشتر صحیح اور اچھی ہیں اور اس وقت جو بدمذاقی پیدا ہو گئی ہے اس میں اعتراض کرنے میں کوئی تکلف نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن ایک بڑی کسر یہ رہ گئی ہے کہ مختلف اچھے اور برے طرز کی عبارتوں، موزوں اور ناموزوں تشبیہوں اور استعاروں کے نمونے نہیں دئے گئے ہیں۔ انشار پرداز کو اپنی زبان سے محبت ہونا ضروری ہے اور یہ محبت زبان کے اچھے نمونے ہی پیدا کر سکتے ہیں۔ ہمارے خیال میں عنوانات کے مسئلے پر اس قدر تفصیل سے بحث کرنا۔ جیسے کہ فاضل مصنف نے کیا ہے۔ چنداں کارآمد نہیں۔ مضمون سمجھ میں آجائے تو عنوان خود بخود قائم ہو جاتا ہے۔ اور مضمون سمجھ میں آنے کے لئے موضوعوں اور عنوانوں کی فہرست نہیں بلکہ مطالعہ اور مشاہدے کا شوق درکار ہے اسی طرح ہم سمجھتے ہیں کہ انشا پردازی کے علم کو افسانہ نویسی کے فن سے براہ راست کوئی مطلب نہیں۔ افسانہ نویس کی ہدایت نقاد کا کام ہے معلوم نہیں فاضل مصنف نے شاعری کو بحث سے کیوں خارج کر دیا ہے۔ ہم کو تو صرف، نثر

لکھنے والوں پر یہ جتانا ہے کہ انھیں الفاظ اور محاوروں اور زبان کی روانی پر اتنی ہی توجہ کرنا چاہیئے جتنی کہ شاعر کرتے ہیں۔ دوسری زبانوں میں بھی نظم کی ادبی خوبیاں نثر کے لئے نمونہ مانی جاتی ہیں لیکن فاضل مصنف کے مدنظر اصولی بحث نہیں معلوم ہوتی بلکہ اس وقت کی ضرورت، اور اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ کتاب بہت مناسب ہے اور خاصی مکمل بھی۔

م م

ہندستانی لسانیات | ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم اے، پی ایچ ڈی پروفیسر ادبیات اردو۔ جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد، تقطیع ۲۲×۱۸، حجم ۱۶۰ صفحے مع اشاریہ۔ ناشر کا نام درج نہیں۔ ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن، کتابستان، سٹی روڈ، الہ آباد، مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔

اردو زبان کی تاریخ پر کام کیا جاچکا ہے۔ لیکن یہ پہلی کتاب ہے جس میں اردو اور ہندستانی پر علم لسانیات کے اصولوں کے مطابق بحث کی گئی ہے۔ فاضل مصنف نے ابتدا علم لسانیات سے کی ہے۔ اور زبان کی ماہیت، آغاز اور تشکیل کے طریقے سمجھا کر، اور دنیا کی زبانوں کی تقسیم پر ایک نظر ڈال کر ہندوستان کی زبانوں کی تقسیم واضح کی ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں صرف ہندوستان پر بحث کی گئی ہے اور اس بحث میں لسانیات، تاریخ، روشن خیالی اور وسعت نظر سب نے برابر کا حصہ لیا ہے۔

یہ کتاب ضروری معلومات کا ایک خزانہ ہے اور وہ اردو بولنے والے بہت ہی غریب رہ جائیں گے جو اس سرمائے سے فائدہ نہ اٹھائیں۔

م م

بچہ کا دل اور دوسرے ڈرامے | از سعدی مچھلی شہری، ناشر بچوں کا کتب خانہ، کلائیو روڈ، نئی دہلی۔ حجم ۱۷۶ صفحے، تقطیع ۳۰×۲۰/۱۶

یہ سات ڈراموں کا مجموعہ ہے، اور خواجہ حسن نظامی صاحب، شوکت تھانوی صاحب فرید جعفری صاحب نے اس کا مقدمہ، دیباچہ اور تعارف لکھا ہے، ڈرامے سب بالکل مہمل ہیں۔

نوجوان مصنف کو اگر واقعی ادبی ذوق ہے تو انھیں اچھے ڈراموں کا مطالعہ کرنا اور لکھنے کی مشق کرنا چاہیئے۔

ضربِ کلیم بالِ جبریل کے بعد ڈاکٹر اقبال کے تازہ اردو کلام کا مجموعہ ضربِ کلیم کے نام سے شائع ہوا ہے۔ یہ کس قدر دلکش اور روح پرور ہے صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ان اشعار کی تعریف کرنا یا دوسرے شعرا کے کلام کی طرح اُن کی داد دینا، یا اپنے خیال کے ساتھ ان کی مطابقت دکھانا، یا بے کیف توضیحات کرکے اُن کی لطافت کو کھونا نہ صرف کور ذوقی ہے بلکہ شریعتِ ادب میں گناہِ کبیرہ ہے۔ کیونکہ یہ شاعری نہیں ہے بلکہ حیاتِ ملیہ اسلامیہ کے ان اہم مسائل کے متعلق جن میں منکرین غلطاں و پیچاں ہیں۔ اور جو دفتر کے دفتر سیاہ کرنے سے بھی حل نہیں ہوتے دو دو اور چار چار شعروں میں جچی اور تلی رائیں، روشن تعلیمات، اور بے پردہ حقائق ہیں جو اہلِ بصیرت کی نگاہوں میں موتی کی طرح بڑی چمک رہے ہیں۔ ان کی کیفیت بقول مرزا بیدل یہ ہے

نزاکتہاست در تصویرِ مینا خانۂ حیرت مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگِ تماشا را

ان کو تو بس دیکھیئے، پڑھیئے، سوچیئے اور نہاں خانۂ دل کے کسی گوشہ میں محفوظ رکھیئے۔

لیکن چونکہ میرا طریقۂ فکر جداگانہ ہے۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کی بعض باتوں سے کلی طور پر میں متفق نہیں ہوسکا۔ انھیں کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ مہدی کے عنوان سے وہ فرماتے ہیں

مجذوب فرنگی نے باندازِ فرنگی مہدی کے تخیل سے کیا زندہ وطن کو
اے وہ کہ تو مہدی کے تخیل سے ہے بیزار نومید نہ کر آہوئے مشکیں سی ختن کو

اس میں غالباً روئے سخن میری طرف ہے۔ کیونکہ مہدی کے عقیدے کے قرآنی ہونے سے سب سے پہلے میں نے علی الاعلان انکار کیا ہے، اس لئے گذارش کرتا ہوں کہ تخیل سے مراد اگر عقیدہ ہے تو ہمارے پاس اس کا ایک معیار ہے یعنی کلام اللہ۔ اس میں کہیں مہدی بھیجنے کا

وعدہ نہیں کیا گیا ہے لہٰذا اگر ہم یہ عقیدہ رکھا بھی کریں تو اللہ کے اوپر کیا ذمہ داری ہے کہ وہ مہدی کو بھیجے۔ اور اگر محض تخیل مقصود ہے تو مایوس قوموں کے تخیلات بھی اُن کے لئے عذاب ہی ہوا کرتے ہیں صدیوں پر صدیاں گذرتی جا رہی ہیں اور امت ہے کہ اس امید میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہے کہ

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

کبھی کبھی جب مایوسی کا غلبہ ہوتا ہے تو گھبرا کے کہنے لگتی ہے۔

یہ انتظارِ مہدی و عیسےٰ بھی چھوڑ دے

پھر مجبور ہو کر اس ٹوٹی ہوئی امید کا سہارا لیتی ہے اور پکارتی ہے۔

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا

غالباً اسی تخیل کا اثر ہے کہ ملت کے اُن سربرآوردہ افراد کو بھی جو اس وقت تعمیرِ قوت میں سرگرم ہیں ڈاکٹر صاحب اپنے بلند معیار کے مطابق نہیں پاتے اور کہتے ہیں

نہ مصطفےٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی | کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

دوسری بات یہ ہے کہ انھوں نے کہا ہے۔

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے | غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز

یہ خالص شاعرانہ استدلال ہے۔ غالب کی طرح جس نے کہا ہے۔

کیوں ردِّ قدح کرے ہے زاہد | مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

جس طرح مگس کی قے کہدینے سے شہد کی لطافت اور شیرینی میں فرق نہیں آسکتا اسی طرح محکومیت کی نسبت سے الہام بھی اگر حق ہو۔ غارت گرِ اقوام نہیں ہو سکتا۔ خود حضرت عیسےٰ علیہ السلام رومی سلطنت کے محکوم تھے جن کی نسبت ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہے

فرنگیوں کو عطا خاکِ سوریا نے کیا

نبیٔ عفت و غمخواری و کم آزاری

بلکہ اکثر انبیاء کرام علیہم السلام محکوم اقوام ہی میں مبعوث کئے گئے جس کے خاص اسباب وعلل تھے جن کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں۔

دراصل نبوت کی صداقت کا معیار حاکمیت یا محکومیت پر نہیں ہے بلکہ خود الہام کی نوعیت پر ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اسی مجموعے میں ایک دوسرے شعر میں اس کسوٹی پر بھی اس کو کسا ہے۔

وہ نبوت ہے مسلمان کے لئے برگِ حشیش جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

نسخ جہاد اور کفر کی غلامی کا دوامی پٹہ کبھی سچی نبوت کی تعلیم نہیں ہو سکتی۔

پنجابی مسلمانوں کی مذہبی ذہنیت کے متعلق فرماتے ہیں۔

مذہب میں بہت تازہ پسند اس کی طبیعت کرے کہیں منزل تو گذرتا ہے بہت جلد

تحقیق کی بازی ہو تو شرکت نہیں کرتا ہو کھیل مریدی کا تو ہرتا ہے بہت جلد

تاویل کا پھندا کوئی صیاد لگا دے یہ شاخ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد

یہ حقیقت اگرچہ ناقابل انکار ہے مگر اسی ذم سے پنجابی مسلمان کی مدح کا بھی ایک پہلو نکلتا ہے جو یقیناً ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر بھی رہا ہوگا۔ مگر انھوں نے اس تنبیہہ کے موقع پر اس کا اظہار مناسب نہیں سمجھا۔ لیکن میں تو ظاہر کئے بغیر نہیں رہوں گا۔ یعنی

لیکن اُسے مل جائے جو اچھا کوئی رہبر بگڑا ہوا مدت کا سنورتا ہے بہت جلد

نظریہ حیات کے متعلق تین اقوال لکھے ہیں۔

سپنوزا

نظر حیات پہ رکھتا ہے مردِ دانشمند حیات کیا ہے حضور و سرور و نور وجود

فلاطون

نگاہ موت پہ رکھتا ہے مردِ دانشمند حیات ہے شب تاریک میں شرر کی نمود

اقبال

حیات و موت نہیں التفات کے لائق فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

فلسفۂ خودی پر پہنچ کر رک گئے۔ لیکن تصوف (کہ برائے شعر گفتن خوب است) ایک قدم اور آگے بڑھاتا ہے اور صوفی کی زبان سے کہتا ہے۔

حیات وموت وخودی جلوہ ہیں عوارض نفس　　حقیقت ایک ہی جو خود ہے شاہد ومشہود

(اسلم)

بلاغ الحق | مصنفہ شمس العلما حافظ سید محب الحق صاحب۔ کتابت وطباعت وکاغذ عمدہ، تقطیع ۲۰×۲۶/۸ ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ قیمت فی نسخہ ۲؎۔

مصنف سے "پرفضا" پٹنہ کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

شمس العلماء حافظ محب الحق صاحب کا سلسلہ حقانیہ چار جلدوں میں ہے۔ اس کی پہلی تین جلدیں دعوۃ الحق، منہاج الحق، اور شرعۃ الحق مطبوع ہو کر شائع ہو چکیں اور عام طور پر اہل نظر نے ان کو پسند کیا اور ارجمند تصنیف قرار دیا۔ لیکن یہ چوتھا حصہ جو ان سب کا نچوڑ اور بیان کی خوبی اور دلائل کے متانت کے باعث نہایت پر مغز ہے اب تک نہیں چھپا تھا۔ یہ پہلی بار شہزادہ ناصر الدین محمد اسد الرحمٰن قدسی کے حکم سے عزیزی پریس آگرہ میں چھپ کر شائع ہوا ہے۔ اس میں عقائد اسلامی، عبادات معاملات، اور اخلاق وغیرہ کے متعلق قرآن کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں۔ جو لوگ قرآن سے ذوق رکھتے ہیں ان کے لئے یہ کتاب نہ صرف مفید بلکہ شمع راہ ہے۔

جامع النحو | مولفہ حکیم محمد احمد صاحب۔ معلم مدرسۃ الاصلاح۔ سرائے میر اعظم گڈھ۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ ضخامت ۱۰۰ صفحے۔ تقطیع ۲۰×۲۶/۸ قیمت فی نسخہ ۸/

مصنف سے مل سکتی ہے۔

حکیم محمد احمد صاحب زمانے سے صرف و نحو کی تعلیم دیتے دیتے اس کے ماہر ہو گئے ہیں۔ انھوں نے اپنے تعلیمی تجربے کے بعد طلبا کی آسانی کے لئے یہ کتاب لکھی۔ میرا خیال ہے کہ ... اس کتاب سے نحو عربی کے مسائل ذہن نشین ہو سکتے ہیں۔ اس آسانی

کے ساتھ کسی درسی کتاب سے نہیں ہو سکتے۔ اس میں طلبا کی ضروریات پیش نظر رکھی گئی ہیں اور خوش اسلوبی کے ساتھ مسائل ترتیب دیے گئے ہیں۔ جو لوگ عربی سیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کو نحو کے لئے یہ کتاب ضرور منگانی چاہیئے۔

خانۂ کعبہ کے موجودہ محافظ کی سرگذشت

یعنی

سوانح حیات سلطان ابنِ سعود

جس میں پہلی سعودی حکومت کے محیر العقول کارنامے عرب میں ترکی اور مصری حکومتوں کے اُلجھے ہوئے حالات خاندان ابنِ رشید کی المناک سرگذشت۔ تحریکِ وہابیت کی تبلیغ واشاعت۔ وہابیوں کا جزر و مد۔ تحریک اخوان کی بناء و تاسیس۔ سلطان ابنِ سعود کے عہد بعہد کے حالات و کوائف اور درخشندہ فتوحات۔ فتح حجاز کے مفصل واقعات۔ دستور ملکی کا قیام و نفاذ۔ انتظاماتِ ملکی کی اصلاحات۔ علوم و فنون کی ترویج و تشویق۔ امنیت و مدنیت کے لئے گراں قدر مساعی۔ نجدی معیشت و معاشرت۔ مغربی حکومتوں سے تعلقات اور متعدد معاہدات وغیرہ وغیرہ پوری شرح و بسط سے درج ہیں۔

کتاب مستند معلومات کا بے نظیر ذخیرہ ہے۔ طباعت دیدہ زیب۔ کاغذ نہایت اعلیٰ۔ ضخامت ۲۰×۲۶/۸ ۲۷۶ صفحے۔ قیمت صرف دو روپے

ملنے کا پتہ

مینجر سلسلہ "مشاہیر اسلام" نمبر ۵ اجالندھر شہر (پنجاب)

ثانوی تعلیم کی اصلاح و تنظیم

جیسا کہ تمام حضرات کو معلوم ہوگا۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس جوبلی اس سال علی گڑھ میں ایسٹر کی تعطیلات میں منعقد ہو رہا ہے۔ تعلیمی مباحث کی شمولت کے لئے اور تقسیم کار کے اصول پر اجلاس کو مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ جن میں سے ہر ایک کے لئے ایک علیحدہ سکریٹری اور صدر کا انتخاب ہوا ہے۔ انھیں شعبوں میں ایک شعبہ ثانوی تعلیم کا ہے۔ جس کی صدارت ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب (پرنسپل جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) فرمائیں گے۔

چونکہ ثانوی تعلیم کا مسئلہ ملک کی ذہنی اور علمی ترقی کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے اور اس کے بہت سے مسائل غور طلب ہیں۔ جن کا کوئی مناسب اور تشفی بخش حل اب تک پیش نہیں ہو سکا اس لئے میں ملک کے تمام ارباب فکر اور ماہرین تعلیم سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس شعبے کے اجلاس میں شامل ہو کر اس کے مباحث میں شریک ہوں اور جو حضرات ثانوی تعلیم کے کسی مسئلہ پر اپنا مقالہ پڑھنا چاہیں وہ مجھے اپنے اس ارادے سے مطلع فرمائیں اور مقالہ کا عنوان لکھ بھیجیں۔ فروری کے اخیر تک مقالہ کی ایک نقل میرے پاس آجانی چاہیئے تاکہ اس کو پروگرام میں شامل کیا جا سکے۔ شعبہ کانفرنس کا عام عنوان "ثانوی تعلیم کی اصلاح اور تنظیم" ہوگا اور مقالہ نگار حضرات سے درخواست ہے کہ وہ مسئلے کے کسی خاص پہلو سے بحث کریں۔ مقالے مختصر ہونے چاہئیں اگر زیادہ طویل ہوں تو کانفرنس میں پڑھنے کے لئے ان کی ایک تلخیص تیار کر لینی چاہیئے۔ شعبہ کا مفصل پروگرام بعد میں شائع کیا جائے گا۔

غلام السیدین
سکریٹری شعبہ تعلیم ثانوی
پرنسپل۔ ٹریننگ کالج۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

بقائے صحت کے لئے ایک اچھی دوا

اوکاسا OKASA

دماغی کام کرنے والوں کیلئے ایک بہترین چیز ہے

اوکاسا کے استعمال سے چہرے کا رنگ نکھر جاتا ہے چستی و توانائی بڑھ جاتی ہے۔

اوکاسا کے استعمال سے جھریاں اور سفید بال نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔

اوکاسا کے استعمال سے اعضائے رئیسہ نئی قوت محسوس کرنے لگتے ہیں۔

اوکاسا کے استعمال سے اضمحلال، چڑچڑاپن نیز دوسری عصبانی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں۔ اور آدمی کی تمام زائل شدہ قوتیں عود کر آتی ہیں۔

اس سے پہلے کہ

بحالی قوت رفتہ کا وقت گذر جائے اوکاسا کا استعمال شروع کر دیجئے

سو ٹکیوں کا بکس دس رُپے عہ — آزمائش کے لئے ۳۰ ٹکیاں چار روپے

اوکاسا کے استعمال سے مکمل فائدہ حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ نئی اور تازہ اوکاسا کی ٹکیاں استعمال کی جائیں اس کی شناخت یہی ہے کہ تازہ اوکاسا کے ڈبے پر ایک سرخ فیتہ ہوتا ہے۔

اوکاسا ہر دوا فروش سے مل سکتی ہے۔ یا ذیل کے پتے سے بھی منگا سکتے ہیں۔

اوکاسا کمپنی برلن انڈیا (لمیٹڈ) نمبر ۱۲ امپیرٹ و پوسٹ بکس نمبر ۳۹۶ - بمبئی

تاریخ الامت

ابتدائے رسالت سے آخر زمانۂ خلافت عثمانیہ تک تمام ضروری معلومات اور مسلمانوں کے کارناموں کا ذکر نہایت سلیس اور دلچسپ عبارت میں کیا گیا ہے۔

اسلامی تاریخ کا یہ سلسلہ مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری نے بڑی جانفشانی اور تحقیق سے مرتب فرمایا ہے ملک کی متعدد یونیورسٹیوں اور کالجوں میں داخل نصاب ہے۔ بالخصوص ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے طلبار کے لئے نہایت مفید ہے طباعت وکتابت نہایت عمدہ۔

حصہ اول	سیرۃ الرسولؐ	قیمت	عیہ	مجلد	عہ ر
حصہ دوم	خلافت راشدہ	قیمت	عا ر	〃	عہ ر
حصہ سوم	خلافت بنی امیہ	قیمت	عہ ر	〃	عہ ر
حصہ چہارم	خلافت عباسیہ	قیمت	عا ر	〃	عہ ر
حصہ پنجم	عباسیہ بغداد	قیمت	عا ر	〃	عہ ر
حصہ ششم	عباسیہ مصر	قیمت	عا ر	〃	عہ ر
حصہ ہفتم	خلافت عثمانیہ	قیمت	عہ ر	〃	عہ ر

نوٹ۔ جو صاحب یہ مکمل سلسلہ بیک وقت طلب فرمائیں گے ان کو پورا سٹ مجلد پیش کیا جائے گا۔ اور قیمت غیر مجلد کی لی جائے گی۔ جلدیں نہایت اہتمام کے ساتھ اچھے مضبوط کپڑے کی تیار کرائی گئی ہیں جس پر کتاب اور مکتبہ جامعہ کا نام بلاک سے چھپوایا گیا ہے۔ جلد پر ایک خوشنما کاغذ کا کور ہے۔ اس کی طباعت بھی بلاکوں سے کی گئی ہے۔

حصص اول و دوم طلبار کی ضروریات کے خیال سے چھوٹے سائز پر بھی شائع کئے ہیں اور ان کی قیمت ہر ایک کی ایک ایک روپیہ ہے۔

جامعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

آپ کے بچوں کی کتابیں

مکتبہ جامعہ نے بچوں کے لئے بہت سی کتابیں شائع کی ہیں۔ ان کے مضامین سہل ہیں اور زبان آسان۔ اکثر کتابیں جامعہ کے اساتذہ اور معلمین کی لکھی ہوئی ہیں یا ان کی زیر نگرانی تیار ہوئی ہیں۔ بیان کی الجھنوں اور اغلاط سے یہ نسبتاً پاک ہیں۔ لکھائی چھپائی خوشنما اور الفاظ الگ الگ ہیں کہ بچوں کو پڑھنے میں سہولت ہو۔ جامعہ کے لوگ بچوں کا لٹریچر شائع کرنا اپنا خاص کام سمجھتے ہیں اور ایسی کتابیں شائع کی جا رہی ہیں جنھیں دیکھ کر بچے اُن کی طرف بڑھتے ہیں: بھاگتے نہیں۔

بچوں کی کہانیاں	۲ر	عجائب خانہ سمندر	۳ر
مرغی اجیرمی	۳ر	کائنات	۵ر
نانھیل خان	۲ر	دنیا کے بسنے والے	۳ر
نیت کا پھل	۳ر	تعلیمی کھیل	۴ر
شیدا	۳ر	بچوں کا حساب	
بچاری	۳	حصہ چہارم	۹ر
شہزادی گلنار	۴ر	" پنجم	۱۰ر
بچوں کی نظمیں	۵ر	" ششم	۹ر
بچوں کے اسمٰعیل	۳ر	باغبانی پر دو پکٹ	۴ر
جواہر پارے	۳ر	میلادالنبی پر دو پکٹ	۶ر

پیام تعلیم

اپنا فرصت کے وقت تمھارا جی ہلکی ہلکی مزے مزے کی چیزیں پڑھنے کو چاہتا ہوگا۔ ہم نے پیام تعلیم تمھاری اسی خواہش کو پورا کرنے کے لئے نکالا ہے۔ تمھیں چیزیں بنانے یا جمع کرنے کا شوق ہے تو اس کے بارے میں بھی نیچے اچھے مضمون تمھیں ملیں گے۔ غرض ہر قسم کی دلچسپیاں اس میں موجود ہیں۔ اسے پڑھ کر تمھیں افسوس ہوگا کہ بھئی واہ ہمیں کیا خبر تھی نہیں تو کبھی سے ایسے اچھے رسالے کو منگایا کرتے۔

قیمت

سالانہ صرف عہ، فی فرجہ ۲ر، مع ضمیمہ ۴ر

آپ بھی ان میں سے کچھ کتابیں طلب فرما کر ہماری حوصلہ افزائی کیجیے

مکتبہ جامعہ، نئی دہلی

بسم اللہ

جامعہ

زیر ادارت۔ ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ ڈی

نمبر ۲	فروری ۱۹۳۷ء	جلد ۲۷

فہرست مضامین

۱	مولینا نذیر احمد کی تصنیفات کا عام رنگ	جناب علی عباس حسینی صاحب لکھنؤ	۸۱
۲	امثال القرآن	جناب مولنا نجم الدین صاحب	۹۷
۳	پابندیاں	جناب عبدالقادر صاحب ۔ بی ۔ اے (جامعہ)	۱۱۹
۴	پاٹ	جناب حیات اللہ صاحب انصاری ۔ بی ۔ اے ۔	۱۳۱
۵	غزل	حضرت جگر مرادآبادی	۱۶۵
۶	احسن الکلام	جناب احسن مارہروی	۱۶۶
۷	کلام آزاد	حضرت آزاد انصاری	۱۶۷

قیمت سالانہ ۵ روپے　　　　فی پرچہ ۸ آنے

پروفیسر محمد مجیب ۔ بی ۔ اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے محبوب المطابع برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا

ہماری متعدد فہرستیں

مکتبہ جامعہ نے اپنے زبردست ذخیرے کی فہرستیں ایک خاص نوعیت سے علیحدہ علیحدہ شایع کی ہیں۔ جو حضرات جس خاص مضمون یا شعبے سے دلچسپی رکھتے ہوں، از راہِ کرم مطلع فرمائیں مطبوعہ فہرست فوراً حاضر کی جائے گی۔ چند فہرستوں کے نام درج ذیل ہیں:۔

(۱) مطبوعاتِ جامعہ۔ جامعہ کی شایع کردہ اور سول ایجنسی کی کتابوں کی مکمل فہرست۔

(۲) ناشرینِ اُردو۔ جامعہ کے علاوہ اردو کتابوں کے تمام ناشرین کی فہرستوں کا مجموعہ۔

(۳) مصنفینِ اُردو۔ مشہور مصنفین، مترجمین و مولفین اردو کی کتابوں کی فہرست

(۴) بچوں کی کتابیں۔ بچوں کے لئے اُردو کی کتابوں کی فہرست۔

(۵) عورتوں کی کتابیں۔ عورتوں اور بچیوں کے لئے پسندیدہ کتابیں۔

(۶) مختصر فہرست کتب۔ کتب اُردو کی تقریباً ایک ہزار مشہور کتابوں کی فہرست۔

(۷) ادبی کتابیں۔ تاریخ و تنقید ادب، مقالات و انشاء، ناول، افسانہ، نظم، ڈراما، مکاتیب، ظرافت وغیرہ پر اُردو کتابوں کی مکمل فہرست۔

(۸) مذہبی کتابیں۔ ڈھائی سو منتخب مذہبی کتابوں کی فہرست۔

(۹) تاریخی کتابیں۔ پانچسو منتخب تاریخی کتابوں کی فہرست۔

(۱۰) اجتماعیات، سیاسیات، معاشیات، تعلیم، فلسفہ، منطق، نفسیات، اخلاقیات، طبیعات، کیمیا، طب، حفظانِ صحت، زراعت اور صنعت و حرفت پر اردو کی تمام کتابوں کی مکمل فہرست زیرِ طبع ہے۔ عنقریب شایع ہوگی۔

مکتبہ جامعہ دہلی

مولانا نذیر احمد کے مختصر سوانح

اور

ان کی تصنیفات کا عام رنگ

مختصر سوانح

آپ کا پورا نام مع خطابات اور ڈگریوں کے شمس العلماء مولوی حافظ ڈاکٹر نذیر احمد ال ال ڈی ہے۔ آپ ۶ دسمبر ۱۸۳۶ء کو نگینہ ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ فارسی گھر پر اپنے والد مولوی سعادت علی صاحب سے پڑھی۔ عربی کی تکمیل دہلی کالج میں کی ۱۸۵۴ء میں ضلع گجرات میں ایک اسکول میں نوکر ہوئے مگر دو ہی برس بعد اپنے صوبے میں جگہ مل گئی۔ اور کانپور کے ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہو گئے۔ اسی زمانے میں آپ نے مرآۃ العروس اور بنات النعش لکھی۔ یہ کتابیں عام طور پر بہت مقبول ہوئیں۔ گورنمنٹ سے آپ کو ان پر انعام ملا۔ اور آپ کا تبادلہ الہ آباد کر دیا گیا، یہاں آپ نے انگریزی بھی اتنی حاصل کر لی کہ اس زبان کی کتابیں پڑھنے اور سمجھنے لگے۔ اس زمانے میں تعزیرات ہند کا اردو میں ترجمہ ڈائرکٹر صاحب سررشتہ تعلیم کی نگرانی میں ہو رہا تھا۔ مولانا نذیر احمد نے بھی چند صفحے ترجمہ کر کے پیش کئے۔ ڈائرکٹر صاحب نے ان کے ترجمے کو پسند فرمایا۔ اور یہ کام اُن کے سپرد کر دیا۔ چنانچہ آپ نے تھوڑی ہی مدت میں انکم ٹیکس اور تعزیرات ہند کے ترجمے کر ڈالے۔ گورنمنٹ نے ان کاموں سے خوش ہو کر آپ کو ۱۸۶۱ء میں تحصیل داری عنایت کی آپ نے اس عہدے کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ ضابطہ فوجداری اور قانون شہادت کے بھی ترجمے کر ڈالے اور ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔

گورنمنٹ سے پنشن لینے کے بعد آپ حیدر آباد طلب کئے گئے اور ایک بڑے عہدے پر مقرر ہوئے۔ یہاں کی عام رعایا سے موانست بڑھانے کے لئے آپ نے تلنگی زبان سیکھی

اور اپنے فرائض کی انجام دہی میں مشغول رہے۔ جب حیدر آباد کی ملازمت سے بھی سبک دوش ہوئے تو دلی واپس آئے اور وہیں مستقل قیام فرمایا۔ اس پیرانہ سالی میں بھی علمی ذوق و شوق کا یہ حال رہا کہ سنسکرت سی مشکل زبان حاصل کی اور تصنیفات اور لکچروں کے ساتھ ساتھ برابر طلبا کو مکان پر درس دیتے رہے۔ ۲۸ اپریل ۱۹۱۲ء کو آپ نے بعارضہ فالج انتقال کیا۔

تصانیف اور ان کا عام رنگ

علاوہ ان ترجموں کے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے آپ نے آخر میں قرآن مجید کا بھی ترجمہ فرمایا ہے، جو اس الہامی کتاب کے سب سے بہتر ترجموں میں شمار ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ "چند پند، مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، محصنات، رویائے صادقہ، ایامیٰ، الحقوق والفرائض، ابن الوقت اور موعظہ حسنہ" بھی آپ کی یادگار ہیں۔ ہمیں اس وقت مولانا کے ترجموں، مواعظ یا نظموں سے بحث نہیں وہ اس کتاب کے موضوع سے علیحدہ چیزیں ہیں۔ ہمیں اُن پر اس وقت بحیثیت ایک قصہ گو اور ناولسٹ کے نظر ڈالنی چاہیئے۔

مولانا واعظ ہیں

اس سے پہلے یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ مولانا باقاعدہ ناول نویس نہیں کہے جا سکتے ہیں اور نہ اس حیثیت سے وہ اس کتاب میں شامل کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان کا ذکر اس لئے ضروری سمجھا گیا ہے کہ اردو میں سب سے پہلے انھیں نے فطری قصوں کی طرف توجہ کی ہے اس کا سہرا انھیں کے سر ہے کہ انھوں نے پہلی مرتبہ اس امر کو محسوس کیا کہ اردو میں اس کی سخت ضرورت ہے کہ ہماری معاشرتی زندگی کے فوٹو پیش کئے جائیں اور ہم جن، پری، بھوت پریت کی کہانیوں کو ترک کر کے اپنے گردوپیش کے لوگوں اور اپنی ہی طرح کے معمولی انسانوں کے قصے بیان کریں۔ مولانا نے اس سلسلے میں یہ ضرور غلطی کی کہ وہ شروع ہی سے واعظ و ناصح بن بیٹھے، اور جتنے قصے لکھے ان میں اپنے اغراض و مقاصد کو اس طرح واضح کر دیا کہ قصے کی دلچسپی بڑی حد تک جاتی رہی پھر بھی ان کا اپنی تصانیف سے غیر فطری اجزا کا نکال ہی دینا اس امر کا بین ثبوت ہے کہ وہ فطرۃً ایک حقیقت نگار تھے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر انھوں

نے دوسری زبان کے ناولوں کا مطالعہ اپنی مولویت کے زور میں ناجائز اور غیر مستحسن نہ سمجھ لیا ہوتا تو شاید معاشرتی ناول لکھنے میں ان سے زیادہ کوئی کامیاب نہ ہوسکتا۔

پلاٹ بہت ہی مختصر ہوتے ہیں

اسی فن ناول نویسی سے ناواقفیت ہی کا یہ بھی نتیجہ ہے کہ مولانا نے جتنے پلاٹ بنائے ہیں ان کا خلاصہ ابتدا ہی کے چند ابواب دیکھنے کے بعد معلوم ہوجاتا ہے۔ انھوں نے جہاں اپنے اشخاص قصہ سے تعارف کرایا ہے وہیں پر اُن کی سیرتیں اس طرح واضح طور پر تفصیل کے ساتھ پیش کر دی ہیں کہ ناظر بہت ہی آسانی سے یہ سمجھ لیتا ہے کہ نذیر احمد کا قلم اس سیرت کا کیا حشر کرنے والا ہے۔ لیکن مولانا کی صفائی میں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ان کا مقصد ناول لکھنا نہیں تھا۔ نہ وہ ان چیزوں کو بحیثیت آرٹ کے پیش کر کے انسانی خوشی اور مسرت میں اضافہ کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ انھوں نے ہر کتاب کا تعارف کراتے وقت اس کے مقاصد بتا دئے ہیں اور اس کی غرض ظاہر کر دی ہے" مراۃ العروس" اور" بنات النعش" عورتوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق لکھی گئی ہیں "محصنات" تعدد ازدواج کی مخالفت میں ہے۔ توبۃ النصوح طاعت و اطاعت کے بارے میں۔ اور ابن الوقت انگریزی معاشرت و لباس کی مذمت میں ہے چنانچہ "محصنات" کے دیباچے میں "سر ولیم میور" لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی "یوپی" کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے اپنے اغراض یوں ظاہر فرمائے ہیں:-

"انھیں کی قدر دانی مجھے تصنیف و تالیف کے باعث ہوئی۔ یہاں تک کہ عورتوں کی تعلیم کا سلسلہ مرتب ہوگیا۔ خانہ داری میں مراۃ العروس، معلومات میں بنات النعش، خدا پرستی میں توبۃ النصوح .... انھیں دنوں مجھے یہ خیال ہوا تھا کہ مسلمانوں کی معاشرت میں عورتوں کی جہالت اور نکاح کے بارے میں مردوں کی آزادی، دو بہت بڑے نقص ہیں۔ میں نے ایک نقص کے رفع کرنے میں (جہد المقل) کوشش کی ہے تو دوسرے نقص کے دفع میں بھی کچھ کرنا ضرور ہے۔"

غرض "محصنات" اسی "جہد المقل" کا نتیجہ ہے۔ اب رہا ابن الوقت، تو وہ غالباً سرسید

کے مذہبی خیالات کی تردید ہے۔ اس لئے کہ وہی مسلمانوں کے ریفارمر تھے اور انھیں کو اس زمانے کے لوگ "نیچری، لامذہب، کرسٹان" اور خدا جانے کیا کیا کہتے تھے، مگر مولانا نے پوری کتاب میں کہیں ان کا نام نہیں لیا ہے بلکہ اپنے قصے کا ہیرو ایک ایسے شخص کو بنایا ہے جسے تقریباً اسی طرح کے واقعات پیش آئے ہیں۔ جو سرسید کے سوانح میں ملتے ہیں اور جس کے خیالات بھی بہت حدتک ان نظریوں سے ملتے جلتے ہیں۔ جن کی تبلیغ سرسید نے کی ہے۔ بہر نوع نذیر احمد کے قصوں کا یہ سب سے بڑا عیب ہے کہ ان میں سے ہر ایک کسی خاص اخلاقی و اصلاحی مقصد کو پیش نظر رکھ کے لکھے گئے ہیں اور انہیں واضح کرانے کے لئے اشخاص قصہ کی زبانی بڑی طولانی بحثیں کرانی پڑی ہیں۔ مثلاً میر متقی نے بھانجے اور بھانجی سے جو گفتگو کی ہے وہ اتنی خشک اور طولانی ہے کہ پڑھنے والے کا دم الجھنے لگتا ہے۔ نصوح نے اپنے خیالات کی وضاحت میں جہاں کہیں تقریریں کی ہیں وہ اتنی طویل اور خشک ہیں کہ معلوم ہوتا ہے نماز جمعہ کے بعد خطبہ پڑھا جا رہا ہے۔ حجتہ الاسلام اور ابن الوقت کی بحثیں دیکھئے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ باقاعدہ مناظرہ چھڑ گیا ہے، اور ایک نظریے کے پیش کئے جانے کے بعد دوسرے کے پیش کرنے کے لئے آدھ گھنٹے سے زیادہ صرف تمہیدی تقریروں میں صرف ہو رہا ہے۔ ان حصوں کے پڑھنے کے لئے بڑے استقلال اور سخت پامردی کی ضرورت ہے ان طولانی مباحث اور تقاریر کی وجہ سے عام قصے کی دلچسپی میں بے حد کمی ہو جاتی ہے۔ مگر مولانا کے نزدیک اصل چیزیں یہی تھیں اور سارا قصہ انھیں خیالات کے اظہار کے لئے لکھا گیا تھا اس لئے ان میں ترمیم یا تخفیف بالکل ناممکن تھی!

مولانا کا نظریۂ تعلیم

مولانا نے اپنی تعلیمی کتابوں میں جو نظریہ تعلیم پیش کیا ہے اس میں صحیح طرح کی تربیت، صحبت اراذل سے پرہیز، اطاعت والدین اور اطاعت خدا پر خاص طور سے زور دیا ہے۔

تربیت

چنانچہ بچوں کی تربیت کے متعلق ان کے خیالات مراۃ العروس اور توبتہ النصوح دونوں کتابوں میں واضح طور پر موجود ہیں۔ اکبری کی سیرت کی خرابی کا باعث محض

ماں اور نانی کا لاڈ پیار ہے۔ چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں :۔

"جو لڑکیاں چھٹ پن میں لاڈ پیار میں رہا کرتی ہیں اور ہنر اور سلیقہ نہیں سکھتیں، یوں اکبری کی طرح عمر بھر رنج و تکلیف اُٹھاتی ہیں۔ اکبری کی ماں اور نانی کے لاڈ نے زندگی بھر کیسی مصیبت میں رکھا"

نصوح کا بڑا لڑکا کلیم اور بڑی لڑکی سلیمہ اس لئے غیر مطیع اور خود سر بن گئے کہ اُن کے بچپنے میں ان کو صحیح طور پر تربیت نہیں دی گئی بلکہ ہمیشہ اُن کی ہر خواہش کو پورا کرنے اور ہر ہٹ کو ماننے کی کوشش کی گئی۔

صحبت اراذل سے پرہیز

اس تربیت کے سلسلہ میں صحبت کا مسئلہ بھی آجاتا ہے مولانا نذیر احمدؒ پسر نوح با بداں بنشست۔ خانداں بنوتش گم شد" سے بھی کچھ زائد ہی کے قائل تھے وہ آج کل کے زمانے والوں کی طرح مساواتی نہیں تھے، عورتوں کے لئے وہ اس کے سختی سے قائل تھے کہ انھیں شریفوں کی بہو بیٹیوں کے علاوہ چھوٹی قوم والوں سے بالکل نہ ملنا چاہیے۔ مراۃ العروس میں وہ محمد عاقل کی زبانی اکبری پر یوں طعن کرتے ہیں :۔

"محلے میں جو آدمی بازاری طور کے رہتے ہیں تم نے انھیں کی لڑکیوں کو بہن بنا رکھا ہے رات دن بھوندو بھٹیارے کی بیٹی جینیہ اور بخشو قلعی گر کی بیٹی زلفن کمو کی بیٹی راحت، مومن کنجڑے کی بیٹی سلمتی، تمھارے پاس گھسی رہا کرتی ہیں اور تم کو اس بات کا کچھ خیال نہیں کہ یہ لوگ نہ ہماری برادری میں ہیں اور نہ بھائی بند، نہ ان سے ہماری ملاقات، نہ راہ و رسم، نہ محبت۔ تمام محلے میں چرچا ہو رہا ہے کہ کیسی بہو آئی ہے۔ جب دیکھو ایسی ہی لڑکیاں اس کے پاس بیٹھی ہیں"

اصغری جب بیاہ کر آئی تو اس کے یہاں بھی ایسی ہی لڑکیوں کا ہجوم ہوا مگر اصغری نے انھیں منہ نہیں لگایا۔ بقول مولانا :۔

"محلے کے کمینوں کی لڑکیاں تو چاٹ کی آشنا ہوتی ہیں۔ جب انھوں نے دیکھا کہ نہ

تو پان پر پان ملتا ہے ، نہ سودے سلف کا ذکر ہے ۔ چھ سات دن میں بادی کی طرح جھپٹ کر الگ ہوگئیں ۔"

ماحول تربیت

چنانچہ مولانا جس طرح کے ماحول کے مخالف تھے اور جس طرح کے ماحول کے حامی ۔ دونوں کی تصویریں آپ کو توبۃ النصوح میں کلیم اور نعیمہ کی زبانی مل جائیں گی ۔ نصوح نے جب تک خواب نہ دیکھا اس کے گھر کا وہ رنگ تھا جو مولانا کسی مسلمان کے یہاں دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے بعد کا رنگ خاص مولانا کی پسند کا ہے دیکھئے نعیمہ، اپنی خالہ زاد بہن صالحہ سے اپنے گھر کی بدلی ہوئی کیفیت یوں بیان کرتی ہے ۔

"نعیمہ :۔ جب سے اس روزے نماز کا چرچا ہمارے گھر میں ہوا ۔ بھلمناہت اور شرافت سب گئی گذری ہوئی ۔ اب آئی ہو تو دو چار دن رہ کر ہر ایک کا رنگ ڈھنگ دیکھنا ، نہ وہ زمین رہی نہ آسمان ، گھر کا باوا آدم ہی کچھ بدل گیا ہے ۔ نہ وہ ہنسی ہے ، نہ وہ دل لگی ہے ۔ نہ وہ چرچے ہیں ، نہ وہ مذاق ، نہ وہ چہچہے ہیں ، گھر میں ایک اُداسی چھائی رہتی ہے ۔ ورنہ ابھی ایک مہینے کا ذکر ہے کہ محلے کی عورتیں تمام تمام دن بھری رہا کرتی تھیں ، کوئی گیت گا رہی ہے کوئی کہانی کہہ رہی ہے یہ ہمسائی اجو بہ کچھ اس طرح کی زندہ دل ہیں کہ ہر روز نئی نئی نقلیں کر کے سب کو ہنساتے لٹا لٹا دیتی تھیں ۔ اب کوئی گھر میں آکر تھوکتا بھی نہیں گھر ہے کہ کمبخت اکیلا پڑا بھائیں بھائیں کیا کرتا ہے ۔

صالحہ :۔ آخر اس کا سبب کیا ہے ؟

نعیمہ :۔ سب تمھاری خالہ جان اور حمیدہ کے ابا جان کی بدمزاجی ۔ کسی کو کیا غرض کیا مطلب ؟ کہ اپنے کام کا حرج کرے اور پرائے گھر آکر بیٹھے ۔ کیا لوگوں کے گھروں میں بیٹھنے کو جگہ نہیں ہے ۔ لوگوں کی خاطر داری ہوتی تھی محبت سے اُن کے ساتھ پیش آتی تھیں ۔ لوگ دوڑے آتے تھے ۔ اب یہ حال ہے کہ ہر وقت منہ کپے کی طرح پھولا رہتا ہے ۔ غیر آدمی کیوں برداشت کرنے لگے ۔ سب کے سب چلتے پھرتے نظر آئے ، ابا جان کے اچھے ہونے پر

ڈومنیوں نے سینکڑوں ہی پھیرے کئے ، سبھی نے کہا ، ہمسائی اجوبہ نے منتیں کیں ، ہاتھ جوڑے ایک نہ مانی ، آخر دو رت جگا تو خاک بھی نہ ہوا ۔ نگوڑے مسجدوں کے ملاؤں کو بلا کر کھلا دیا ، اب تو لو ادن رات نماز کا وظیفہ ہے ۔ وہ دیکھو تخت پر ہر وقت نماز کا چیتھڑا بچھا رہتا ہے ۔ وضو کا کلھڑا کیا مجال کہ کسی وقت پاس سے الگ ہو جائے ، کام سے فارغ ہوئیں تو یا نماز پڑھنے کھڑی ہو گئیں ، یا کتاب پڑھنے بیٹھ گئیں ، ایک حمیدہ کٹنی ان کو ایسی مل گئی ہے کہ اور اُن کو اکسایا کرتی ہے میرا بس چلے تو کٹنیا کو ایسا ماروں ۔ ایسا ماروں کہ یاد کرے ۔"

کلیم نے بھی ان ماحولوں پر دوسرے پہلو سے روشنی ڈالی ہے ۔ وہ کہتا ہے

"کل کی بات ہے کہ میری مدح ہوتی تھی اور مجھ کو ہر بات پر شاباش ملتی تھی ، دفعتاً میں ایسا بے ہنر ہو گیا کہ مجھکو سیکھنے اور تعلیم پانے کی ضرورت ہے ۔ ع ہائے ہم کیا کہیں کیا ہو گئے کیا کیا ہو کر میرا کون سا فعل ہے جو تم کو اور ابا جان کو معلوم نہیں ۔ کیا ابا جان نے میری غزلیں نہیں سنیں ؟ میں اُن کے ہاتھ کی صاد کی ہوئی دکھا سکتا ہوں ۔ ابھی پورا ایک مہینہ بھی نہیں گذرا کہ شطرنج کا ایک بڑا مشکل نقشہ ابا جان نے کسی اخبار میں دیکھا ۔ اس کو میں نے حل کیا ۔ کبوتر اُڑائے نہیں دیکھے یا پتنگوں کی لڑائی انھوں نے نہیں سنی ۔ کبھی تم نے روکا یا انھوں نے ٹوکا ؟ اب نئی بات البتہ سننے میں آتی ہے کہ نماز پڑھو ، مسجد میں معتکف بن کر بیٹھو ۔ کھیلو مت ، کسی یار و آشنا سے ملو مت ، بازار مت جاؤ ۔ میلے تماشے میں مت شریک ہو ۔ بھلا مجھ سے یہ باتیں ہونے والی ہیں ؎

جو دل قمار خانے میں بت سے لگا چکے　　وہ کعبتین چھوڑ کے کعبے کو جا چکے"

اگر ان مکالموں سے مولانا کی پسند کا ماحول واضح نہ ہو تو اس موقع کو ملاحظہ فرمائیے جب نصوح نے کلیم کے کمروں کا جائزہ لیا ہے دیکھئے کہ مولینا کے ہیرو نے آرٹ کا کس طرح خون کیا ہے ۔ ٹکڑا ذرا طول ہے مگر خالی از لطف نہیں ۔

مولانا کی آرٹ سے دشمنی

عشرت خانہ کھولا گیا تو ایک تکلف خانہ تھا کمرے کے بیچ میں چوکیوں کا فرش اس پر دری اس پر سفید چاندنی اس خوش سلیقگی کے ساتھ تنی ہوئی کہ کہیں دھبے یا سلوٹ کا نام نہیں ۔ صدر کی جانب گجرات کا نفیس قالین بچھا ہوا ، گاؤ تکیہ لگا ہوا سامنے اگالدان لب قالین بیچوں بیچ چوکیوں

کے اردگرد کرسیاں تھیں تو لکڑی کی ، لیکن آئینہ کی طرح صاف اور چمکتی ہوئی۔ چھت میں ٹپا پٹی کی گوٹ کا پنکھا لٹکا ہوا۔ ہلانے کے واسطے نہیں بلکہ دکھانے کے لئے۔ اس کے پہلوؤں میں جھاڑ جھاڑوں کے بیچ میں رنگ برنگ کی ہانڈیاں۔ چھت کیا تھی بلا مبالغہ آسمان کا نمونہ تھا جسمیں نکھیا بجائے کہکشاں کے تھا۔ جھاڑ بمنزلہ آفتاب و ماہتاب اور ہانڈیاں ہو بہو جیسے ستارے، چھت کے مناسب حالت دیواریں، تصویروں اور قطعات اور دیوارگیروں سے آراستہ تھیں نصوح اس سازو سامان کو تھوڑی دیر تک، ایک سکتے کے عالم میں کھڑا دیکھتا رہا۔ اس کے بعد ایک آہ کھینچ کر بولا کہ افسوس کتنی دولت خداداد اس بیہودہ نمائش اور تکلف اور آرائش میں ضائع کی گئی ہے۔ کیا اچھا ہوتا یہ روپیہ محتاجوں کی امداد اور غریبوں کی کاربرآری میں صرف کیا جاتا۔ اس کے بعد اس کی نگاہ مقابل صدر جا پڑی تو کیا دیکھتا ہے کہ آمنے سامنے دو میزیں لگی ہیں۔ ایک پر گنجفہ، شطرنج، چوسر، تاش، کھیل کی چیزیں اور ارگن باجے رکھے تھے۔ دوسری پر گلدان اور عطر دان وغیرہ کے علاوہ ایک نہایت عمدہ طلائی جلد کی موٹی سی کتاب، نصوح نے نہایت شوق سے اس کتاب کو کھولا تو تصویروں کا البم تھا۔ مگر تصویریں کسی عالم، حافظ، درویش خدا پرست کی نہیں، کھوا پکھاوجی، تان سن گویا، میر ناصر احمد بین نواز، صمد خان پہلوان کھلونا بھانڈ، حیدر علی قوال، نتھوا ہیجڑا، قاضی محمد علی بٹیکر، عدو جواری، اس قسم کے لوگوں کی، شیشہ الات کی وجہ سے نصوح نے دیوار والی تصویروں کو بغور نہیں دیکھا تھا، اب البم کو دیکھ کر اسے خیال آیا۔ آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے تو وہ تصویریں اور بھی بیہودہ تھیں قطعے اور طغرے اگرچہ اُن کا سوادِ خط پاکیزہ تھا۔ مگر مضمون و مطلب دین کے خلاف، مذہب کے برعکس نصوح نے وہیں سے ایک میر فرش اٹھا کر ان سب کی خبر لینی شروع کی اور بات کی بات میں کل چیزوں کو توڑ پھوڑ برابر کیا اور جو کچھ باقی رہا اس کو صحن میں رکھ آگ لگا دی اور نوکروں کو حکم دیا کہ اچھا اب خلوت خانہ کھولو، اس میں تکلف کے معمولی ساز و سامان کے علاوہ کتابوں کی ایک الماری تھی، دیکھنے میں تو اتنی جلدیں تھیں کہ انسان اُن کی فہرست لکھنا چاہے تو سارے

دن میں بھی تمام نہ ہو۔ لیکن کیا اردو کیا فارسی، سب کی سب کچھ ایک ہی طرح کی تھیں، جھوٹے قصے، بیہودہ باتیں، فحش مطلب، لچے مضمون، اخلاق سے بعید، حیا سے دور۔ نصوح ان کتابوں کی جلد کی عمدگی، خط کی پاکیزگی، کاغذ کی صفائی، عبارت کی خوبی، طرز ادا کی برجستگی پر نظر کرتا تھا۔ تو کلیم کا کتب خانہ اس کو ذخیرہ بے بہا معلوم ہوتا تھا۔ مگر معنی و مطلب کے اعتبار سے ہر ایک جلد سوختنی اور دریدنی تھی۔ اسی تردید میں اس کو دوپہر ہوگئی، کئی مرتبہ کھانے کے لئے گھر سے اس کی طلب ہوئی۔ مگر اس کو فرصت نہ تھی، بار بار کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتا تھا اور رکھ رکھ دیتا تھا آخر یہی رائے قرار پائی کہ ان کا جلا دینا ہی بہتر ہے۔ چنانچہ بھری الماری کتابیں لکڑی کنڈے کی طرح اوپر تلے رکھ آگ لگادی۔ نصوح کا یہ برتاؤ دیکھ کر اندر سے باہر تک تہلکہ اور زلزلہ پڑگیا۔ علیم دوڑا دوڑا جا اپنا "کلیات آتش" اور "دیوان شرر" اٹھالایا اور باپ سے کہا کہ جناب میرے پاس بھی یہ دو کتابیں اسی طرح کی ہیں۔ علیم نے آتش کو دہکتی آگ اور شرر کو جلتے انگاروں میں پھینک دیا۔ علیم کی دیکھا دیکھی میاں سلیم نے بھی "واسوخت امانت" لا باپ کے حوالے کی اور کہا کہ ایک دن کوئی کتاب فروش کتابیں بیچنے لایا تھا۔ بڑے بھائی جان نے فسانۂ عجائب، قصۂ گل بکاؤلی، آرائش محفل، مثنوی میر حسن، مضحکات نعمت خاں عالی، منتخب غزلیات جرکین، ہزلیات جعفر زٹلی، قصائد ہجویہ مرزا رفیع سودا، دیوان جان صاحب، بہار دانش بالتصویر، اندر سبھا، دریائے لطافت، میر انشاء اللہ خاں، کلیات رند وغیرہ بہت سی کتابیں اس سے لی تھیں، میں بھی بیٹھا ہوا تھا مجھ کو دیکھ کر بولے۔ کیوں سلیم تم بھی کوئی کتاب لوگے؟" میں: "جو آپ تجویز فرمائیں" بھائی جان: "کون سی کتاب تم کو لے دوں؟ یہ کتابیں جو میں نے لی ہیں اول تو میرے شوق کی ہیں۔ دوسرے تم کو ان کا مزا نہیں ملے گا۔ کتاب والے کی گٹھری میں سے "واسوخت" اور "دیوان نظیر اکبرآبادی" دو کتابیں انھوں نے میرے لئے نکالیں اور کہا کہ واسوخت تو خیر مگر یہ دیوان بڑی عمدہ کتاب ہے،....

میاں ہُدہُد کے اشعار آج تک کسی نے جمع نہیں کئے تھے اس کے حاشیہ پر وہ بھی ہیں چونکہ

بھائی جان نے دیوان کی بہت تعریف کی تھی۔ میں نے اس کو نہایت شوق سے کھولا تو پہلے چوہوں کا اچار نکلا۔ اس کے مضمون سے میری طبیعت کچھ ایسی کھٹی ہوئی کہ میں نے دونوں کتابیں پھیر دیں۔ مگر بھائی جان نے یہ "واسوخت" زبردستی میرے سر منڈھ دی...."

غرض فنون لطیفہ اور تفریحی سامان کے ساتھ ساتھ ادب کی بھی گت بنی اور سب تو سب آتش ونظیر اکبر آبادی بھی آگ میں جھونک دئے گئے۔ حالانکہ آتش ونظیر دونوں کے ہاں تصوف کا رنگ غالب ہے اور اخلاقی تعلیمات کا عنصر حد درجہ واضح، مگر نذیر احمد کے سے ملائے مسجدی کو یہ بھی پسند نہ تھے۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ شیخ سعدی علیہ الرحمہ کی گلستاں کے متعلق جو نصوح اور فہمیدہ کے درمیان گفتگو لکھی ہے۔ وہ اس موضوع پر یادگار چیز ہے۔ عجب نہیں کہ جب کبھی یہ ٹکڑا پڑھا یا پڑھایا جاتا ہو تو شیخ علیہ الرحمہ کی بوسیدہ ہڈیاں ان کی منہدم تربت میں کروٹیں لینے لگتی ہوں ملاحظہ ہو :۔

نصوح :۔ "کیا تم کو گلستاں پڑھنا یاد ہے؟"

فہمیدہ :۔ "ہاں یاد کیوں نہیں ہے، جس دن حمیدہ کا دودھ چھٹا ہے۔ اس کے دوسرے دن میں نے گلستاں شروع کی تھی۔"

نصوح :۔ "بھلا تم کو یہ بھی یاد ہے کہ میں تمہارے سبق سے آگے جابجا سطروں کی سطروں پر سیاہی پھیر دیا کرتا تھا؟ بعض دفعہ صفحہ کے صفحہ آپڑے ہیں کہ مجھ کو اوپر سے سادہ کاغذ لگا کر ان کی چھپانے کی ضرورت ہوئی۔"

فہمیدہ :۔ "خوب اچھی طرح یاد ہے، چوتھائی کتاب سے کم تو نہ کٹی ہوگی۔"

نصوح :۔ "تم پڑھتی تھیں تب چوتھائی بھی کٹی۔ اگر کوئی دوسری عورت یا لڑکی پڑھتی ہوتی تو آدھی کی خبر لیتا، وہ تمام بیہودہ کتابیں تھیں۔ جن کو میں کاٹتا اور چھپاتا پھرتا تھا۔"

فہمیدہ :۔ "سچ کہو، تو میں سمجھی مشکل جان کر چھڑوا دیتے ہیں۔"

نصوح :۔ بڑی مشکل یہ تھی کہ میں ان واہی اور فحش باتوں کو تمہارے روبرو بیان نہیں

کرسکتا۔ پھر یہ اس کتاب کا حال ہے جو پند و اخلاق میں ہے اور تصنیف بھی ایسے بزرگ کی ہے کہ کوئی مسلمان ایسا کم تر نکلے گا کہ ان کا نام لے اور شروع میں حضرت اور اخیر میں رحمتہ اللہ علیہ یا قدس اللہ سرہ العزیز نہ کہے۔ یعنی ان کا اعتداد اولیاء اللہ میں ہے اور جو کتابیں میں نے جلائیں۔ کتابیں کا ہے کو تھیں گالی، پھکڑ، ہزلیات، ٹر، بکواس، ہزیاں، خرافات، میں نہیں جانتا، ان میں سے کون سا نام اُن کے لئے زیادہ زیبا ہے"!

غرض مولانا کے ہاں تعلیم کے معنی ہیں قرآن اور حدیث کی مزاولت اور زندگی کے معنی ہیں ہر لمحہ قال اللہ و قال الرسول کی تکرار!

مگر مجھے خوف ہے کہ احادیث رسول اور کلام پاک میں بھی ایسے اجزا ضرور ہی نکل آئیں گے جنھیں پڑھ کر نصوح کی افراط حیا "اچھوتیوں" کی طرح شرما جائے گی اور نوعروسوں کی طرح عرق عرق نظر آئے گی! یہ نہیں معلوم کہ مولانا کی شریعت میں ایسے ٹکڑوں کا فہمیدہ کو پڑھانا اور سمجھانا جائز ہوگا۔ یا وہاں بھی کاغذ کی چیپیاں لگانا پڑیں گی!

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ ابھی ہمیں اپنے مصنف کے دوسرے نظریوں کا ذکر منظور ہے ان میں سے مخصوص چیزیں نظریۂ حق العباد، نظریہ دین، اور نظریہ تقدیر ہیں۔

حق العباد

مبتلا میں سید حاضر سے میر متقی نے جو تقریر کی ہے اس کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو اس سے حق العباد کے نظریے پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

"انسان کے ذمے دو طرح کے حقوق ہیں، حقوق اللہ اور حقوق العباد، لوگ حقوق العباد کی نسبت بڑی غلطی میں پڑے ہیں اور اُن کو آسان سمجھ لیا ہے، حالانکہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے، اگر کسی آدمی سے اللہ کے حقوق ضائع ہوں اور سبھی سے ہوتے ہیں تو بندے کا خدا سے کیا مقابلہ، حقوق الٰہی کا ضیاع اکثر سہو اور غفلت اور نادانی اور کوتاہ اندیشی کی وجہ سے ہوتا ہے اور امید ہے کہ خداوند غفور الرحیم بندوں کے ضعف پر نظر فرما کر اُن کے قصور معاف کرے اور کرے گا۔ مگر حقوق العباد کا یہ حال نہیں ہے، اب میں ایک بندہ بزور سے، ظلم سے، ہیکڑی

سے ، زبردستی سے دوسرے بندے کو ستانا ، اس کے دل کو دکھانا۔ اس کو ایذا پہنچانا ہے۔ اور اس قصور کا معاف کرنا نہ کرنا اسی بندۂ مظلوم کے اختیار میں ہے۔ مگر انصاف کرو دنیا میں کتنے لوگ اس کی پرواکرتے ہیں ، لاکھوں مظلمے ہیں جن کو بندگانِ خدا مرتے وقت اپنے سر دل پر لادکرلے جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ دین کو کھیل اور مذہب کو ہنسی سمجھ رکھا ہو۔ منہ سے کہتے ہیں کہ مرنا برحق ۔نکیرین کے ساتھ سوال وجواب کا ہونا برحق ، عذاب قبر برحق ، دوزخ برحق مرنے کے بعد زندہ ہونا برحق ، رتی رتی کا حساب دنیا برحق جنت برحق ، دوزخ برحق اور کردار حق تھو...... ء

دین مولانا نے جو دین کے معنی سمجھائے ہیں اس سے اُن کا منشاء اور زیادہ واضح ہوتا ہے وہ بھی سن لیجئے ، میر تقی مبتلا سے یوں فرماتے ہیں :۔

"ہمارے نزدیک بلکہ تمام اہل ادیان کے نزدیک دین کے معنی ہیں انسان کی اصلاح اور اس کے دو حصے ہیں۔ اصلاح معاد اور اصلاح معاش ، پس دین اور دنیا میں اگر ایک طرح کی منطقی مغائرت ہے۔ جیسے عموماً کل اور جزمیں ہوا کرتی ہے۔ اس کو تباین یا تناقض یا تنافر ، یا بے تعلقی سے تعبیر کرنا مغالطہ دہی ہے۔ کتنا ہی پڑھاؤ ، جب انسان میں دین نہیں ، حمیت نہیں مروت نہیں ، محبت نہیں ، خلاصہ یہ ہو کہ انسانیت نہیں اس پر بھی اگر وہ آدمی دنیا کے کام کا ہو تو اس دنیا کو خیرباد ہی اور اس کام کو سلام ......" ابن الوقت میں دین کی تعریف حجتہ الاسلام کی زبانی یوں کرائی ہے۔

دین حق کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہو کہ دنیا اور دنیا کے تعلقات سب ہیچ ہیں ، دنیاوی خوشیوں کو منغص نہیں بلکہ دنیاوی رنج اور خوشی دونوں کو انسان کی نظر میں حقیر اور ناچیز کر دیتا ہے جو شخص غصے کو پی جائے ، انتقام نہ لے ، جھوٹ نہ بولے ، غیبت نہ کرے ، حریص وطماع نہ ہو جابر وسخت گیر نہ ہو ، ممسک وبخیل نہ ہو ، مغرور ومتکبر نہ ہو ، کسی سے لڑے نہ جھگڑے نہ کسی کا حسد کرے ، نہ کسی کو دیکھ کر جلے ، عافیت میں شاکر ، مصیبت میں صابر ، منسکھ خلیق ، بُردبار و تحمل ، متحمل متواضع ، منکسر مستغنی ، نفس پر ضابط ، قانع ، سیرچشم ، متوکل ، ثواب ، عافیت کا امیدوار متواضع ، منکسر مستغنی نفس پر ضابطہ ، قانع ، سیرچشم ، متوکل ، ثواب عافیت کا امیدوار یعنی خلاصہ یہ کہ دین والا ہو۔"

اگر آپ ان منقول حصوں سے یہ سمجھتے ہوں کہ مولانا ہر شخص کو اپنی سیرت کے بنانے اور بگاڑتے ہیں آزاد سمجھتے تھے اور وہ انسان کو فاعل مختار مانتے تھے تو آپ بہت بڑی غلطی کریں گے۔ مولینا کے نزدیک باوجود ان تمام باتوں کے جو ابھی انھیں کے الفاظ میں بیان کی گئی ہیں انسان بالکل مجبور ہے۔ ہر امر اس کے لئے پہلے ہی سے مقدر ہے اور جو کچھ ہوتا ہے۔ وہ صرف خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ چنانچہ نظریہ تقدیر کو لیجیے:۔

نظریہ تقدیر و جبر

اصغری اپنے میاں سے گفتگو کرتے ہوئے کہتی ہے:۔

"سو بات کی ایک بات تو یہ ہے کہ نوکری تقدیر سے ملتی ہے۔ بڑے لائق نہ دیکھتے رہ جاتے ہیں، اور اگر خدا کو منظور ہوتا ہے، تو نہ وسیلہ نہ لیاقت، چھپر پھاڑ کر دیتا ہے، گھر سے بلا کر دیتا ہے۔ تقدیر سے بڑھ کر بل نہیں سکتا۔"

اور فلسفۂ جبر کے بارے میں میر تقی کی زبانی یوں روشنی ڈالی گئی ہے:۔

"بندے بھلے اور برے، امیر اور غریب، قوی اور ضعیف، حاکم اور محکوم، بادشاہ اور رعیت، یہاں تک کہ ولی اور پیغمبر سب کے سب اس قدر عاجز اور بے اختیار ہیں کہ بدون خدا کی مرضی کے ایک پتا ہلانا چاہیں تو نہیں ہلا سکتے۔ ایک ذرے کو جگہ سے سرکانا چاہیں تو نہیں سرکا سکتے۔ کسی انسان کا نفع اور ضرر نہ اس کے اختیار میں ہے نہ کسی دوسرے انسان کے اختیار میں۔ جس کسی کو جس کسی کے ساتھ کسی طرح کی محبت ہے اس کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ جس کے ساتھ محبت رکھتا ہے۔ اس کا فائدہ چاہتا ہے نہ یہ کہ اس کو فائدہ پہنچاتا ہے یا پہنچا سکتا ہے اس واسطے دنیا کی ساری محبتیں از برائے نام ہیں۔ سچی اور اصل محبت خدا کی ہے کہ ساری نعمتیں اور ساری برکتیں جو ہم کو حاصل ہیں۔ یہاں تک کہ زندگی اسی کی دی ہوئی ہے، با ایں ہمہ انسان کو اس زندگی میں ایذائیں بھی پہنچتی ہیں مگر ان میں ضرور انسان کا کوئی نہ کوئی فائدہ مضمر ہوتا ہے۔"

مولانا کے ہم عصر سر سید احمد اور مولانا حالی مرحوم کی رائیں اس کے بالکل برعکس تھیں ان کا خیال ہی نہیں بلکہ ایمان تھا کہ انسان فاعل مختار ہے۔ کامیابی و ناکامی، برائی

اور اچھائی، سب کچھ اسی کی تدبیر اور اسی کے خیال پر منحصر ہے۔ حالی نے ایک مختصر رسالہ اسی مبحث پر لکھا ہے اور اس امر کو ثابت کیا ہے کہ "مسلمانوں کے کاہل اور آپاہج ہونے کا سب سے بڑا باعث یہی نظریہ تقدیر ہے" ہم نے جس موضوع کے نقد کا ذمہ اپنے سر لیا ہے اس سے یہ بحث بہت دور ہے اور ہمیں اصولی طور پر ان چیزوں کا ذکر ہی اس کتاب میں نہ کرنا چاہئے تھا۔ لیکن چونکہ مولانا نذیر احمد کی کتابوں کا اصلی رنگ دکھانا اور ان کو ناولوں کے زمرے میں نہ شامل کرنے کا باعث بھی بتانا ضروری تھا اس لئے ان کی یہ مخصوص چیزیں مذکور ہوئیں۔

اب ہم ان چند خصوصیات پر بھی نظر ڈالنا ضروری سمجھتے ہیں جن کی وجہ سے بعض ناقدین مغالطہ میں پڑ کر مولانا نذیر احمد کو باقاعدہ ناول نویسوں میں شمار کرنے لگے ہیں۔ ان میں سب سے پہلی چیز حقیقت نگاری ہے۔

حقیقت نگاری

مولانا نے جہاں تک عورتوں کی خانگی زندگی کا تعلق ہے بہت حد تک حقیقت نگاری کی ہے ان کی آپس کی رنجشیں، چشمکیں، لین دین، رشک و حسد و غیظ بہت ہی عمدہ طرز پر پیش کیا ہے۔ کہیں کہیں پر دوسرے جذبات سے بھی بحث کی ہے مثلاً اولاد سے محبت، بھائی سے محبت، باپ سے محبت، مگر اس کے ساتھ ان کی متشرع طبیعت، رنگین محبت ہی سے نہیں، بلکہ زن و شوہر کی محبت کے نام سے بھی "لجاتی" ہے۔ اُن کی معرکتہ الآرا کتاب مراۃ العروس میں نام ہی نام کی رنگینی ہے۔ اس کی ہیروئن اصغری اس طرح کی قدسی صفات ہے کہ اس کا شوہر غالباً اسے ایک نظر دیکھنے کے لئے پہلے وضو کرنا ضروری سمجھتا ہوگا۔ نبات النعش کی چمک بھی صرف نام ہی تک محدود ہے۔ ورنہ جن مستورات کا اس میں ذکر ہے وہ دن ہو یا رات کسی وقت بھی "عریاں" ہونے والی نہیں۔ توبتہ النصوح میں تو توبہ و استغفار ہی ہے، بھلا اس کی "فہمیدہ" میں قیامت کی متانت نہ ہوگی تو کس میں ہو گی؟ رہیں مبتلا اور ابن الوقت سی تصنیفیں تو آخر الذکر کے ہیرو نے ساری عمر انگریز بننے میں صرف کر دی، اسے صنف نازک کو جنس لطیف سمجھنے کا وقت ہی نہ ملا اور اول الذکر نے گو ایک کی جگہ دو دو بیویوں کا بیک وقت تجربہ حاصل کیا

مگر نہ اس کے ہاں ان دکھیاریوں کے لئے کوئی خاص کشش پیدا ہوئی اور نہ اُن بے حیاریوں کے ہاں اس مابہ النزاع سرتاج کے لئے، ہمارے نزدیک اس لطیف ترین جذبے کے ذکر سے اغماض کی دو ہی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو مولانا ان کا ذکر ہی بے حیائی سمجھتے تھے یا انھیں اس دنیا سے کلیتہً ناواقفیت تھی ان میں سے جو بھی سبب ہو۔ مگر اس عنصر کے عدم نے مولانا کی کتابوں سے ناول کہلانے کا حق سلب کر لیا۔ اور خود انھیں حقیقت نگار کے خطاب سے محروم کر دیا۔

مکالمہ وزبان

اب رہا مکالمہ تو بے شک وشبہہ مولانا عورتوں کے مکالمے کے بادشاہ ہیں۔ صنف نازک کا تکلم، طرزِ گفتگو، نشستِ الفاظ، اور روزمرہ ومحاورہ پر جیسا انھیں عبور رہے۔ سوائے سرشار اور مرزا رسوا کے کسی کو نصیب نہیں، ان مقامات پر مولانا نے سلاست، روانی اور آمد کے دریا بہا دئے ہیں اور اتنی ٹکسالی زبان لکھی ہے کہ ہر فقرے پر جی لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔ مگر جس جگہ پر خود اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں یا مردوں کی گفتگو لکھی ہے۔ وہاں روانی کا دریا عربی کے ثقیل الفاظ کی چٹانوں سے بار بار ٹکرایا ہے۔ زور وہاں بھی بلا کا ہے۔ بہاؤ میں کمی نہیں۔ مگر ہاں یہ سبزہ زاروں سے گذرتا ہوا دریا نہیں، بلکہ کوہساروں سے الجھتی ہوئی ندی ہے۔ پھر ان مقامات کی زبان بھی دلی اور لکھنو کی ٹکسال کی پابند نہیں، اس میں جگہ جگہ پر اس کے بیّن ثبوت ملتے ہیں کہ مولانا نے مدت العمر ایک دورہ کرنے والے ڈپٹی کی زندگی بسر کی ہے اور ان کا اصلی وطن دلی کا شہر نہ تھا بلکہ یوپی کا بجنور!

امثالُ القرآن

یہ پُرمغز مقالہ جامعہ کے شعبہ دینیات کے ماتحت پڑھا گیا تھا۔ امثال القرآن جیسے اہم موضوع پر اردو زبان میں بہت کم مواد موجود ہے۔ مولانا نجم الدین صاحب نے اسی موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ امید ہے کہ قرآنی مباحث سے دلچسپی رکھنے والے حضرات غور و توجہ سے اس کا مطالعہ کریں گے۔

یہ مقالہ عنقریب کتابی صورت میں بھی شائع کیا جائے گا۔

قرآن حکیم ایک ایسی جامع اور مکمل کتاب اور دستور العمل ہے جو انسانی ترقی کے لئے تمام اصول و مبادی، قواعد و قوانین پر مشتمل ہے۔ ابتدائے نزول سے لیکر اس وقت تک کسی دور یا کسی ملک یا کسی قوم کو اس پر عمل پیرا ہو کر شاہراہِ ترقی پر گامزن ہوتے ہوئے کوئی دشواری یا رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ نوعِ انسانی کی تمام ترقیوں اور کمالات حاصل کرنے کے لئے اس میں ہدایات اور احکام موجود ہیں۔ مثلاً اگر کسی صوفی اہل اللہ کو مقامات تصوّف اور احوال نفسانی و فیوض روحانی کی جستجو آرزو دامنگیر ہو۔ تو قرآن حکیم اس کے لئے بھی مشعلِ راہ و چراغِ ہدایت کا کام دیتا ہے۔ مراتب روحانی و مقاماتِ علیا کے لئے جابجا ارشادات موجود ہیں۔ ابتدائی مراحل سے انتہا تک ارشادات موجود ہیں۔ مثلاً مقام خوف کے لئے جا بجا اس مضمون کا اعادہ فرمایا گیا۔

یدعونَ ربّھم خوفاً وطمعاً۔

رجاء کے لئے :۔

من کانَ یرجو لقاءَ اللہِ فانَّ اجل اللہ لاتٍ۔

جوع اور ترکِ شہوت کے لئے متعدد آیات میں رہنمائی فرمائی گئی :۔

وَلنبلونّکم بشیءٍ مِن الخوفِ والجوعِ.... وَبشّر الصّابرین۔

وَیُؤثِرُونَ عَلٰی اَنفُسِہِم وَلَو کَانَ بِہِم خَصَاصَہ۔

مقامِ خشوع اور تواضع کے لئے یوں ارشاد ہوا:۔

قَدْ اَفلَحَ المُؤمِنُونَ الَّذِینَ ھُم فِی صَلوٰتِہِم خَاشِعُون۔

مخالفت نفس وہوا کے لئے:۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَھَی النَّفسَ عَنِ الھَوَاءِ فَاِنَّ الجَنَّۃَ ھِیَ المَأوٰی۔

اسی طور پر ہر ایک مقام قناعت۔ صبر۔ شکر۔ توکل۔ انابت۔ فتوت۔ یقین۔ توبہ۔ مراقبہ رضاء۔ عبودیت۔ استقامت۔ اخلاص۔ وغیرہ درجات کا ذکر مختلف آیات میں پایا جاتا ہے۔ اور آیت ذیل میں بطور عموم جملہ درجاتِ تصوف کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔

وَالَّذِینَ جَاھَدُوا فِینَا لَنَھدِیَنَّھُم سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ المُحسِنِینَ۔

ایسے ہی اگر کسی بادشاہ یا خلیفہ کو ملک گیری یا ملک داری کے قوانین اساسی وضوابط ملکی وسیاسی کی ضرورت لاحق ہو تو قرآن مجید اسکی ہر ایک موقع ومحل پر پوری امداد واعانت فرما کر رہنمائی کرتا ہے۔ خصوصاً سورۂ انفال۔ توبہ اور احزاب، فتح اور بقرہ میں اس قسم کے احکام جابجا پائے جاتے ہیں۔

امور معاشرتی وخانہ داری کے سلجھانے کے لئے بھی اس نے ہر ایک پہلو کو مکمل طور پر واضح کر دیا ہے۔ سورۂ بقرہ۔ نساء۔ نور۔ احزاب۔ طلاق وتحریم میں اس کا نمایاں حصہ ذکر فرمایا گیا ہے

غیر مسلم اقوام سے عہد وپیمان کے تعلقات اور اعلان جنگ وغیرہ کے احکام پر بھی مکمل بحث کی ہے۔ سورۂ انفال۔ توبہ۔ سورۂ محمد۔ فتح میں اس کی زیادہ تشریح پائی جاتی ہے۔

فصل خصومات وضابطۂ دیوانی وفوجداری کا ایک مکمل نقشہ پیش کرتا ہے۔ سورۂ بقرہ کے آخر میں اور نساء کے بعض حصص میں اور مائدہ ونور میں بھی اس کی توضیح فرمائی گئی ہے۔

اور اس میں سپہ سالار کے لئے فوجی قواعد کی پوری تشریح موجود ہے۔ اکثر حصہ سورۂ توبہ انفال۔ فتح و محمد میں پایا جاتا ہے۔

غرضکہ جس پہلو اور جس عنوان پر نگاہ ڈالی جائے، ذی فہم انسان کے لئے ایک مکمل دستور العمل موجود ہے۔ اور آیۃ

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (نحل ع ۱۲ پارہ ۱۴)

کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ اور فرمان واجب الاذعان۔

وَاِنَّهٗ لَكِتَابٌ عَزِيْزٌ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ (سجدہ پ ۲۴ ع ۵) کا پورا یقین ہو جاتا ہے۔ آنحضرت صلعم نے اسی قرآن کریم پر عمل فرما کر ترقی کا جو نمونہ پیش فرمایا ہے اولین و آخرین اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ آنحضرت صلعم نے کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں فرمایا۔ ان کے پاس صرف یہی قرآن حکیم تھا، جس پر عمل پیرا ہو کر دنیا کو حیران و متعجب کر دیا اسی کتاب اللہ پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آنحضرت صلعم کے اسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھ کر اور اس کی روشنی میں کارفرما ہو کر جس بام عروج کو پہنچے وہ کسی سے مخفی اور پنہاں نہیں۔

آنحضرت صلعم کے زمانے سے لے کر اس وقت تک مختلف اوقات و ازمنہ میں لوگوں نے قرآن حمید کی تفسیریں لکھیں جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ ہر ایک مفسّر نے اپنے اپنے خیال و مذاق کے مطابق اس کے مطالب اخذ کرنے میں کوشش کی۔ کسی نے مسائل فقہیہ کے استنباط اور استخراج میں اپنی ساری کوشش صرف کر دی۔ تفسیر احکام القرآن ابوبکر حصاص اور احکام القرآن ابن عربی وغیرہ کا یہی مقصد، اور منتہائے مرام ہے۔ ان لوگوں نے صرف آیات احکام ہی کو اپنے فن کا موضوع قرار دے کر ہر ممکن خدمت انجام دی ہے۔

متاخرین میں سے تفسیر احمدی میں ملاں جیونؒ نے بھی اسی مقصد کو ملحوظ رکھا اگر کسی کا مذاق محدثانہ تھا تو اس نے بھی اپنے فن کا پورے طور پر پاس رکھا۔ زیر بحث آیات میں جس قدر احادیث یا اقوال سلف صالحین کا امکان تھا جمع کیا اور اس میں کسی قسم کی کمی اور خامی نہ چھوڑی۔ ابن جریر اور ابن کثیر کی تفسیروں کا عموماً یہی مذاق ہے اگرچہ فن توجیہ کو بھی انھوں نے ہاتھ سے نہیں دیا مگر یہ حصہ مغلوب اور پہلا غالب ہے جلال الدین سیوطیؒ نے بھی اپنی تفسیر در منثور میں اسی روش کو اختیار کیا ہے۔

اگر کسی عالم کا مذاق عربیت کی طرف زیادہ مائل تھا تو اس نے قرآن حکیم کے نظم و نسق سے فصاحت و بلاغت کے نکات نکالنے اور صرف و نحو کے استشہاد پیش کرنے میں ساری کوشش صرف کردی۔ علامہ زمخشری اور قاضی بیضاوی نے اسی روش کو پسند فرمایا، اگرچہ انھوں نے فن توجیہ اور اثبات اعتزال یا اس کی تردید میں بھی کافی بحث کی ہے مگر اول حصہ زیادہ نمایاں ہے۔

صاحب جلالین نے تو کوئی انتہا ہی نہ چھوڑی سوائے چند ترکیبوں کے کسی شئ کو معرض بحث قرار ہی نہیں دیا۔ اِلَّا مَاشَاءَ اللّٰه

جب کسی عالم کا توغل عقلیات و فلسفیات کے ساتھ تھا اور اسی میں اس کی مزاولت رہی تو اس نے کتاب اللہ سے تمام مسائل فلسفیہ اور دلائل عقلیہ کے طرز بیان کو اختیار کرکے اپنی پوری ہمت کا مظاہرہ کیا۔ اس صف میں علامہ فخر الدین رازیؒ سب سے پیش پیش نظر آتے ہیں۔ جب کبھی کسی آیت سے ذرا بھی گنجائش نظر آئی تو فوراً انہوں نے مصطلحات فلسفہ کو اس میں ٹھونسنے کی کوشش کی۔ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ میں انہوں نے علم ہیئت کے تمام مسائل کو بالاستیعاب ذکر کردیا۔ اسی طرح جہاں بھی خلق السمٰوات والارض یا کسی ستارے یا سورج چاند کا ذکر ہوا۔ فوراً ان کا ذہن علم ہیئت کی طرف منتقل ہوا۔ اسی طور پر جب کبھی کسی فلسفی طبعی یا الٰہی مسئلہ

کا تھوڑا سا جوڑ بھی کسی آیت سے نظر آیا تو تمام طبیعیات و الٰہیات کے دفتر کھول کر رکھ دیئے ان کی تقلید میں اور بھی کئی علماء اسی رو میں بہ نکلے۔ اگرچہ تفسیر رازی میں بہت سے مسائل متعلق تشریح و تفسیر قرآن حکیم موجود ہیں اور نکات و حکم سے وہ خالی نہیں ہیں مگر غلبہ غیر متعلق مسائل کے باعث یہ کہا گیا۔ کُلّ شیٔ فیہ الا التفسیر۔

اگر کسی اہل ذوق کو روحانیات اور عالم ملکوت سے زیادہ تعلق تھا تو اس نے انسان کے روحانی کمالات اور مدارج کے استنباط کرنے پر اپنی نظر کو محدود رکھا۔ شیخ محی الدین ابن عربی نے اپنی مشہور تفسیر میں اسی رنگ کو اختیار کیا۔ کوئی آیت ایسی نہیں چھوڑی جس کو فلسفۂ تصوف پر انھوں نے حل نہ کیا ہو۔ ان کے علاوہ صاحب روح المعانی نے بھی اپنی تفسیر میں عام متداول تفسیر کا ذکر کرنے کے بعد اس سلسلے کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اول سے لے کر آخر تک اس کو بھی ساتھ ہی ساتھ نباہتے چلے گئے غرض ہر ذی فہم صاحب ذوق نے اپنے مذاق کا مطالعہ قرآن مجید کی نظم و نسق سے فرما کر ناظرین سے خراج تحسین حاصل کیا۔ ہمارے خیال میں ہر ایک مفسر نے قرآن کریم کی خدمت کو اپنا مقصد قرار دے کر اپنے فہم کے مطابق عہدہ برائی کی۔ جزاھم اللہ عنا خیر الجزاء۔

باوجود اس قدر تفاسیر لکھے جانے اور اس خدمت کے بجالانے کے میرے ناقص خیال میں تفسیر کے بعض پہلو تا حال مکمل طور پر زیر بحث نہیں لائے گئے۔ جن پر غور و پرداخت کرنا امت پر فرض تھا اور ہے۔

(۱) اول اقسام القرآن یعنی قسموں کی تشریح اور غرض قسم اور قسم اور جواب قسم میں ربط قائم کرنا۔ اس موضوع پر مستقل اور علیحدہ مکمل بحث کرنے کی اشد ضرورت تھی مگر میری نظر سے اس وقت تک اس موضوع پر صرف دو کتابیں گزری ہیں۔ ممکن ہے کہ سلف صالحین اور متاخرین نے اس فن پر اور کتابیں بھی لکھی ہوں مگر وہ ہم تک نہیں پہنچیں۔

(۱) التبیان فی اقسام القرآن مصنفہ حافظ ابن قیمؒ۔ اس کتاب میں اگرچہ انھوں نے حسب تبحر خود بہت سے نکات تفسیریہ ذکر فرمائے ہیں. مگر اصل موضوع پر کوئی ایسی معتد بہ روشنی نہیں ڈالی جو مشتاق منتظر کے انتظار کو رفع کر سکے کہیں کہیں وہ ذکر کر جاتے ہیں کہ اقسام سے مقصود استشہاد ہوتا ہے۔ مقسم بہ کی حالت اور اس کے اطوار گرد و پیش کے حالات سے جواب قسم کا اثبات مقصود ہوتا ہے مگر جب کسی قسم کی تفسیر پر قلم اٹھاتے ہیں تو وہی پرانا قصہ مقسم بہ کی عظمت اور شان وغیرہ کے مباحث چھڑ جاتے ہیں. ایک موقع پر انھوں نے تصریح بھی فرمائی ہے۔ کہ قسم سے مقصود استشہاد ہوتا ہے. مگر عملی رنگ میں. کسی سورت میں بطور نمونہ جاری کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔ خدا جانے انھوں نے باوجود سابق تصریح کے کیوں پہلو تہی کی ۔

(۲) امعان فی اقسام القرآن مصنفہ مولانا عبد الحمید فراہی مرحوم۔ مصنف نے اس کتاب میں اس سلسلے کے لئے کچھ داغ بیل ڈالی ہے۔ مگر ان کو بھی تکمیل کی فرصت نہیں ملی۔ اگرچہ اصولی طور پہ انھوں نے بہت سے امور ذکر فرمائے ہیں جن کی مدد سے صاحب ذوقِ سلیم فائدہ اٹھا سکتا ہے اور تکمیل کا رنگ پیدا کر سکتا ہے۔ اگر خود مصنف علیہ الرحمۃ اس چیز کو مفصل لکھ جاتے تو کیا ہی اچھا ہوتا۔

(۲) دوم ربط الآیات والسوَر۔ یہ مسئلہ نہایت ہی اہم اور ضروری تھا۔ اور عین عقل کے تقاضے کے مطابق ایک سورت کی آیتوں میں ربط کا ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے اور سورتوں کا اس ترتیب پر دکھا جانا جو شان نزول کی تاریخ کے خلاف ہے ضرور کسی حکمت اور فائدے پر مبنی ہوگا۔ ورنہ ترتیب نزولی کو ہی اختیار کیا جاتا۔ ترتیب نزولی ایک طبعی اور فطرتی چیز ہے۔ اس کا خلاف اسی وقت اختیار کیا جا سکتا ہے، جب اس کے مقابل میں کوئی داعیٔ قوی موجود ہو۔ مگر مسئلہ ربط ایک ایسا پیچیدہ اور مشکل مسئلہ ہے جو عام نظروں سے مخفی اور مستتر رہا۔ اسی خفاء اور استتار کے باعث

بہت سے علماء نے سرے سے ربط کے وجود کا ہی انکار کردیا اور برملا کہہ دیا۔ نہ تو ایک سورت کی آیات میں باہم کوئی ربط ہے اور نہ ہی ایک سورۃ کا دوسری سورۃ کے ساتھ کوئی ایسا لگاؤ ہے جو اس کا یہ مقتضی ہو کہ وہ اس کے بعد ذکر کی جائے۔ اور جن لوگوں نے ربط کو مانا ہے انھوں نے بھی کوئی ایسی معتدبہ شے پیش نہیں کی جو مخالفین کی غفلت یا تساہل کو دور کرسکتی یا ہماری پیاس کو بجھاسکتی اور قرآن حکیم کی شایان شان معلوم ہوتی معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے اس مسئلہ کی طرف کوئی زیادہ توجہ مبذول نہیں فرمائی ورنہ وہ اس موضوع پر کافی روشنی ڈال سکتے تھے۔

علامہ فخر الدین رازی نے آیات میں ربط پیدا کرنے کی بہت کوشش کی، اور بالالتزام اس بحث کو عام طور پر نباہتے گئے۔ مگر انھوں نے صرف چند مقاصد کو پیش نظر رکھ کر آیات کو باہم مرتبط کردیا۔ عام طور پر انھوں نے مقاصد قرآنی کو مندرجۂ ذیل مضامین میں حصر کردیا ہے۔ توحید۔ رسالت۔ حشر نشر۔ کہیں تو توحید کا ذکر مقدم آگیا اس کے بعد رسالت۔ اس کے بعد حشر نشر اور کہیں بالعکس۔ ان تین چیزوں کی ضرورت ہر ایک شخص کے نزدیک مُسلّم ہے جو بھی پہلے آجائے اس کے بعد دوسرے کا لانا کوئی بے ربط نہیں ہوسکتا۔ یہ ربط کوئی ایسا نہیں جو اعجاز قرآنی اور شان تنزیل کے مناسب ہو کیونکہ قرآن کریم کے مقاصد نہایت ہی وسیع اور تمام ضروریات بشری کے متکفل ہیں۔ جن میں کبھی بھی تبدیلی یا ترمیم کی ضرورت نہیں پڑی اور نہ پڑے گی۔ جب ہمارے سامنے یہی دستور العمل اور قانون دائمی ہے۔ تو ہر ضرورت کے لئے اس میں بحث اور مادہ کا ہونا ضروری اور لابدی معلوم ہوتا ہے۔

علامہ فخر الدین رازی کے بعد چند دیگر مفسرین نے بھی اس مذاق کو پسند فرمایا۔ مگر بالاستیعاب ربط کو ذکر نہیں کیا گیا۔

سید علی مہائمی نے بھی اپنی تفسیر کا اعلےٰ مقصد اسی کو قرار دیکر قابل قدر سعی فرمائی۔ مگر

تا حال جن مقاصد کے استنباط کرنے کے لئے اہل ذوق کے قلوب منتظر ہیں وہ ابھی تک معرض شہود میں نہیں آسکے۔ آنحضرت صلعم کا اعلان بالکل صحیح اور مطابق واقع ہے۔ لاینقضی عجائبہٗ چیدہ چیدہ چند مفسرین نے غیر لازمی طور پر کہیں کہیں ربط قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور بعض مواقع پر انھوں نے اعلےٰ قسم کے نکات بیان فرما کر ہماری رہنمائی فرمائی ہے اور بعض مقامات پہ محض ایک معمولی بات پر قناعت کرکے آگے چل دیئے بہرحال وہ ہمارے شکریئے اور دعائے خیر کے مستوجب و مستحق ہیں۔

صاحب تفسیر بقاعی نے بھی ربط قائم کرنے کا التزام کیا ہے۔ بہت سے حضرات نے اس کی بہت توصیف بھی فرمائی۔ مجھے اس کے پورے طور پر مطالعہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اتفاق حسنہ سے ایک دفعہ ایک جلد تھوڑی دیر کے لئے میری نظر سے گذری وہ بھی کچھ زیادہ مفید معلوم نہیں ہوئی۔ جس طرح اور لوگوں نے ربط کے متعلق سعی فرمائی ہے انھوں نے بھی وہی مسلک پسند فرمایا ہے۔ شاید دوسرے حصص کے دیکھنے کے بعد رائے میں کچھ تبدیلی ہوسکے تا حال اس کی طباعت نہیں ہوئی قلمی نسخہ میرے مطالعہ سے گزرا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں جب کوئی مصنف کوئی کتاب تصنیف کرنے لگتا ہے تو مضامین میں ضرور کوئی ربط قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس ترتیب کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا اگر کسی کتاب میں کوئی مسئلہ بے محل ذکر ہو جائے تو تمام لوگوں کی نگاہیں اس بے ربطی اور بے مذاقی پر اٹھتی ہیں کہ فلاں شخص نے فلاں مقام پر یہ چیز بے ربط اور بے محل ذکر کردی ایسے ہی کوئی واعظ یا مقرر اپنے وعظ و تقریر میں کوئی جملہ یا قصہ یا حکایت بے ربط و بے ترتیب ذکر کردے تو تمام حاضرین اس کی بدمذاقی اور بے ذوقی پہ نکتہ چینی کرنے لگتے ہیں۔ جب انسانی کلام میں فطرتی طور پر ربط کا ہونا ضروری ہے تو احکم الحاکمین کے کلام قدیم میں کیونکر بے ربطی کو گوارا کیا جا سکتا ہے۔ جو کلام علےٰ رؤس الاشہاد تمام انسانوں بلکہ جن والنس کو اپنی نظیر پیش کرنے سے عاجز قرار دیتا ہے وہ کیونکر بے ربط و بے ترتیب ہوسکتا ہے۔ مانا کہ ہم

اس کی تہ تک یا حقیقت تک کماحقہ، نہیں پہنچ سکتے۔ مگر یہ انصاف نہیں کہ جو چیز ہماری سمجھ سے بالاتر ہو اس کا ہم انکار کریں۔ بلکہ ہمارا ایمان ہے کہ وفوق کل ذی علم علیم۔ عرب میں جب کوئی شاعر بزم میں رزم یا رزم میں بزم کا رنگ پیدا کرتا تھا تو فوراً اس پر گرفت شروع ہو جایا کرتی تھی۔ قرآن کریم کے نزول کے وقت صدہا شعراء و فصحاء و بلغاءِ عرب موجود تھے۔ کسی نے اس پر یہ اعتراض نہ کیا کہ یہ کلام غیر مرتبط اور غیر مناسب ہے۔ حالانکہ ان کے پاس اس قسم کے دواعی موجود تھے جو انھیں قرآن حکیم پر نکتہ چینی کرنے کے لئے مجبور کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ حکیم کے ربط کے متعلق دشمنانِ اسلام کو بھی کوئی شبہہ نہ تھا ورنہ ضرور وہ یہ اعتراض کرتے السکوتُ فی معرض البیان بیانٌ کے مقولے کے مطابق ان کا اعتراف پایا جاتا ہے کہ قرآنِ حکیم کی آیات میں ضرور ارتباط ہے۔ معلوم نہیں کہ جن لوگوں نے ربط کا انکار کیا ہے ان کا اصل مقصد کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صراطِ مستقیم کی ہدایت فرما کر اپنی رضا حاصل کرنے کی توفیق بخشے۔

(۳) تیسری بات۔ قرآن حکیم میں ایک ہی قصہ مختلف سورتوں میں مختلف ترتیب سے ذکر فرمایا جاتا ہے۔ کہیں کسی واقعہ کو ابتدا سے لے کر انتہا تک ذکر کر دیا جاتا ہے اور کہیں بالکل اجمالی طور پر کسی خاص حصے کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔ اور کہیں ایک مضمون ایک سورۃ میں مقدم ذکر کیا جاتا ہے۔ اور دوسری سورۃ میں اسی مضمون کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم لایا جاتا ہے لامحالہ کلام الحکیم لایخلو عن الحکمۃ کے مطابق ضرور اُسلوب بیان اور تفصیل و اجمال و عکسِ ترتیب میں کوئی نہ کوئی حکمت ملحوظ رکھی گئی ہو گی، جس کے سمجھنے سے ہمارے عقول و اذہان تاحال قاصر ہیں۔

(۴) چوتھی چیز امثال القرآن ہے۔ قرآن حکیم میں مختلف مضامین مختلف قسم کے حالات کو مشاہدہ و مشخص کرنے کے لئے یا اعمال کے حُسن و قبح دکھانے کے واسطے امثالاً ذکر کئے گئے ہیں۔ ان پر مفسرینؒ نے حتی الامکان بہت کچھ تحقیق و تدقیق فرمائی ہے۔ تاہم امثال کے بعض پہلو ابھی تک پورے طور پر منقح اور مشرح نہیں ہوئے جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا

غالباً وہ ان حضرات کی نگاہ میں اس قدر ضروری اور اہم نہ ہوں گے جیسے کہ ہمیں ضروری معلوم ہو رہے ہیں۔ ورنہ وہ لوگ ضرور ہی ان کو بغیر تحقیق و تشریح نہ چھوڑتے۔ آج کے مقالہ میں اس وقت صرف امثال القرآن کے متعلق کچھ عرض کیا جائے گا۔ اس موضوع پر مکمل بحث کرنے کے لئے چند امور کا جاننا ضروری ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) لفظ مثل کی تحقیق۔

(۲) اس کی تاریخی حیثیت۔

(۳) غرض مثل۔

(۴) ممثل لہٗ اور مثل کے درمیان تطبیق اور امثال کی تشریح اور ان کے نتائج مثل کی حقیقت اور اس کی فقہی حیثیت۔

(۱) لفظ مثل کی لغوی تحقیق پر علمائے لغت نے بہت کچھ لکھا ہے۔ صاحب قاموس اور اس کے شارح صاحب تاج العروس اور لسان العرب و صاحب کشاف و مبرّد وغیرہ کے حوالے میرے زیر نظر ہیں مگر سر دست میں صرف مفردات امام راغب اصفہانیؒ کا قول نقل کرتا ہوں جس کو انھوں نے غرائب القرآن میں ذکر کیا ہے۔

قال الامام الراغب الاصفہانی فی غرائب القرآن وَ المَثَلُ عبارةٌ عن قولٍ فی شئٍ یُشبِہُ قولًا فی شئٍ آخر بینھُمَا مُشابھۃٌ لِیُبَیّنَ احدھما الاٰخر ویصورہٗ نحوُ قولھم فی الصیف ضَیَّعتِ اللّبَنَ۔ فَاِنّ ھٰذا القولَ یُشبِہُ قولك اھملتِ وَقتَ الامکان امرکِ وَعلیٰ ھٰذا الوجہِ مَا ضرب اللّٰہ تعالیٰ الامثالَ فقَالَ وَ تلك الامثال نضربھا للناس لعلھم یتفکرون وفی اُخریٰ وَمَا یعقلھا الّا العَالمونَ والمثل علیٰ وجھین احدھما بمعنی المثل نحو شِبْہٍ وَشَبَہٍ وَنِقضٍ وَنَقضٍ قَالَ بَعضھم وقد یُعَبَّرُ بِھِمَا عن وَصفِ الشئِ نحو قولہ تعالیٰ مثل الجنۃ التی وعد المتقون۔

وَالثانی عبارۃٌ عن المشابهۃ لغیرہٖ فی معناً من المعانی اَیّ معناً کانَ وَھُوَاَعَمُّ الالفاظ الموضوعۃ للمشابھۃ وَذالکَ اَنَ النِدّ یقالُ فیما یُشَارِکُ فی الجوھر فقط وَشِبْہٌ یقال فیما یُشَارِکُ فی الکیفیۃ والمساوی یقالُ فیما یُشارِکُ فی الکمیۃ فقط. وَالشکل یقال فیما یشارکہٗ فی القدرِ وَالمسَاحۃِ فقط. وَالمِثلُ عامٌّ فی جمیع ذالکَ فبھذا لَمّا اراد اللّٰہ تعالےٰ نفی التشبیہ من کل وجہٍ خصّصہٗ بالذکر فقال لیس کمثلہ شئٌ. وَاَمّا الجمع بین الکاف وَالمِثل فقد قیل ذالک لتاکید النفی تنبیھاً علیٰ اَنّہٗ لَایصح استعمال المِثل وَالکاف. فنفی تلبیس الامرین جمیعاً وَقیل المِثلُ ھٰھُنَا ھو بمعنی الصّفت ومعناہُ لیس کصفتہٖ صفتہٌ تنبیھاً علیٰ اَنّہٗ وَاِنْ وُصِفَ بکثیرٍ مِمّا یُوصَفُ بہٖ البشرُ فلیس تلک الصفاتُ لَہٗ علےٰ حسب ما یُستعمل فی البشر وقولہٗ للذین لَایومنونَ بالاٰخرۃِ مَثَلُ السَوْءِ وَلِلّٰہِ المثل الاعلےٰ.

(۲) مثال کا استعمال حکما اور علما کے کلام میں ہمیشہ رہا. قدیم ترین کتاب میں جس کو ایک قوم کے خیال میں کلامِ الٰہی مانا جاتا ہے، جسے وید کہتے ہیں. جابجا امثال موجود ہیں. اشیاء کے حسن و قبح یا ترہیب و ترغیب کے لئے بہت سے اشلوکوں میں امثال کا استعمال ہوا ہے. جن میں سے بعض بعض تمثیل نہایت ہی نفیس اور قابل قدر ہیں۔

توراۃ انجیل میں بھی جابجا امثال کا ذکر آتا ہے۔ قرآن حکیم نے بھی اسی دستور العمل قدیم کو ملحوظ فرماتے ہوئے کثرت سے امثال ذکر فرمائیں۔ امام ابوالحسن الماوردیؒ نے جو شوافع کے بڑے علماء میں سے شمار ہوتے ہیں، امثال القرآن پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ مگر وہ کتاب ہماری نظر سے نہیں گزری۔ نہ معلوم کہ انھوں نے اس کتاب میں کیا کیا باتیں ذکر فرمائی ہیں۔

اگر کتب سماوی یا غیر سماوی کے امثال کا بطور نمونہ یہاں تذکرہ کیا جائے تو ایک بحث طویل شروع ہو جاتی ہے۔ جس کو ہمارے اصل موضوع کے ساتھ چنداں تعلق نہیں صرف سلسلۂ موضوع کے ارتباط کے لئے اسی قدر کافی ہے کہ امثال کا استعمال قرآن حکیم سے پیشتر بھی ہوتا رہا۔ قرآن مجید نے امثال کے ذکر کہنے سے مخاطبین کو کسی غیر مانوس چیز کے سمجھنے کی طرف متوجہ نہیں فرمایا۔

(۲) مثل کے ذکر کرنے سے بہت سے اغراض ہوا کرتے ہیں جو نہایت ہی اہم اور ضروری ہیں۔ آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات سے اس کی طرف توجہ اور تفکر اور تدبر کا ارشاد ہوا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ وَلقد ضربنا للناسِ فی ھٰذا القراٰنِ من کلِ مثل لعلھُم یتذکّرون۔ وقالَ اللہ تعالےٰ وَتلک الامثالُ نضربِھا للناس وما یعقلھا الا العالمون۔ وَقال اللہ تعالیٰ وتلک الامثال نضربھا للناس لعلھم یتفکرون۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی ایک آیات سے امثال میں تفکر کرنے اور نتائج اخذ کرنے کے لئے حکم دیا گیا ہے۔ ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ مثل کوئی معمولی چیز نہیں جسے انسان سطحی نظر سے دیکھ کر آگے چل دے۔ مذکورۂ بالا تین آیات کے فواصل میں اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ امثال کے فوائد اور نتائج کا اخذ کرنا ہر کہ ومہ کا کام نہیں۔ پہلی آیت میں لعلھم یتذکرون کا لفظ خاص ارباب ذکر کے استفادہ حاصل کرنے کی طرف مشعر ہے۔ دوسری میں وَمَا یعقلھا الا العالمون کا لفظ ارباب عقل وعلم کے مستفید ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ عقل فطرتی کے ساتھ علم اکتسابی کی بھی امثال کے سمجھنے میں ازبس ضرورت ہے۔ جن لوگوں میں عقل ہی نہیں۔ یا جو ذوق علم سے بے بہرہ ہیں وہ امثال قرآنی سے فائدہ اٹھانے کے اہل نہیں۔ ان دو شرطوں کا ہونا ازحد ضروری ہے۔ ورنہ فاقدو الشرطین کے نزدیک تو امثال غیر مفید و بے سود ہیں۔ تیسری آیت میں لعلھم یتفکرون کا لفظ ارباب فکر و

نظر کی خصوصیت پر دلالت کرتا ہے۔ امثال سے وہی لوگ فائدہ اٹھانے کے قابل ہیں جو مبادی سے مطلوب کی طرف انتقال کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اور وہی حقیقی طور پر امثال سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ احادیث میں بھی تدبر بالامثال و اعتبار بالامثال کا کئی جگہ ذکر آیا ہے۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان القرآن نزل علیٰ خمسۃ اوجہ حلال وحرام ومحکم ومتشابہ وامثال فاعملوا بالحلال واجتنبوا الحرام واتبعوا المحکم وآمنوا بالمتشابہ واعتبروا بالامثال رواہ البیھقی۔ (اتقان جلد۲ صفحہ ۱۳۱)

اس حدیث سے جو امثال کی اہمیت معلوم ہوتی ہے وہ کسی ذی فہم اور عقلمند پر مخفی نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم کے مضامین کو پانچ قسموں میں منحصر فرمایا ہے۔ پانچویں قسم امثال القرآن ہے۔ جس سے عبرت اور استنباط کرنا اہل اسلام کا فرض لازم ہے۔

امام ماوردیؒ نے امثال کے متعلق یہ لفظ ارشاد فرمایا ہے۔ من اعظم علم القرآن علم امثالہ والناس فی غفلۃ عنہ لاشتغالھم بالامثال واغفالھم عن الممثلات والمثل بلا ممثل کفرس بلا لجام والناقۃ بلا زمام۔ (اتقان جلد۲ صفحہ ۱۳۱)

امام شافعیؒ نے فرمایا کہ ہر مجتہد پر امثال کی معرفت اور ان کا علم واجب اور لازم ہے امثال کے اندر اوامر و نواہی کے بے انتہا مسائل مضمر ہیں۔ ہم مثل کو پڑھ کر بلا تفکر و تدبر آگے چل پڑتے ہیں۔ مگر جو غرض اور مقصد اصلی تھا۔ اس کی طرف ہماری توجہ بہت کم مبذول ہوتی ہے۔ شیخ عزالدین بن عبدالسلام نے فرمایا ہے۔ انما ضرب اللہ الامثال فی القرآن تذکیراً و وعظاً فما اشتمل منھا علیٰ تفاوت فی ثواب او علیٰ احباط عمل او علیٰ مدح او علیٰ ذم او نحوہ فانہ یدل علی الاحکام (اتقان جلد۲ صفحہ ۱۳۱)

دیکھو ان بڑے بڑے علماء اور مجتہدین نے امثال کو کس قدر اہم اور ضروری سمجھا ہے
ضرب الامثال سے حسب موقع بہت سے امور کا استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ کبھی تو تذکیر مقصود
ہوتی ہے۔ تذکیر کی تین قسمیں ہیں۔ کبھی تو تذکیر بآیات اللہ مقصود ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے
مظاہر قدرت کو بطور تمثیل کسی شئے کے امکان یا امتناع پر بطور دلیل پیش فرمایا کرتا ہے۔
اور کبھی تذکیر بایام اللہ مطلوب ہوتی ہے۔ امم سابقہ کے حالات تعمیری یا تخریبی بیان
فرما کر مخاطبین کو ان کے نقش قدم پر چلنے یا ان کی گمراہی سے دور رہنے کی ہدایت کی
جاتی ہے اور کسی موقع پر تذکیر بما بعد الموت مقصود ہوتی ہے۔ انسان کی اس
نشأۃ کے ختم ہونے کے بعد جو واقعات اس کو عالم برزخ میں یا قیامت کے دن پیش
آنے والے ہیں ان کو امثال کے رنگ میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ اور کبھی کبھی ضرب الامثال
سے یہ مقصود ہوتا ہے۔ کہ مخاطب کو کسی کام پر برانگیختہ کیا جائے یا کسی بری چیز سے اس
کے افعال یا عقائد و اعمال کو تشبیہہ دے کر اسے متنفر و مجتنب کیا جاتا ہے بسا اوقات
کوئی ایسا مسئلہ مخاطب کے سامنے ذکر کیا جاتا ہے جو اچھی طرح اس کے ذہن نشین نہیں
ہوتا۔ تو مثال کے ذریعے ذہن نشین کرایا جاتا ہے۔ بعض موقعوں پر انسان اپنی کوتاہ فہمی
کے باعث کسی امر کو غیر ممکن یا ممکن الوقوع کو غیر ممکن الوقوع خیال کر بیٹھتا ہے تو اس کی
غلط فہمی کے ازالہ کے لئے مثال کے ذریعے سے اس کے سامنے باطل کی تردید کی جاتی
ہے۔ اور بعض موقعوں پر کسی غیر محسوس شے کو محسوس مثال سے متقرر فی الذہن کرنا مقصود
ہوتا ہے۔ مثال سے کبھی ایک متوہم شے کو مشاہد دکھانا مطلوب ہوتا ہے۔ اور بعض مواقع
پر بذریعہ امثال کسی شے کی عظمت و فخامت یا ذلت و حقارت بیان کی جاتی ہے۔
علم بیان میں ایک ہی مضمون کو مختلف طرق و اسالیب سے ادا کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔
علم الامثال اس فن کا ایک بڑا شعبہ سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا قرآن عظیم میں علمہ البیان
کے امتنان کی تکمیل کے لئے امثال کو کثرت سے ذکر فرمایا گیا۔

اصل مقصد تو امثال سے ممثل لہٗ کی حقیقت کو واضح کرنا۔ یا دوسرے اغراض کو مکمل کرنا ہے۔ ممثل کی شان یا عظمت کا مثال کے ساتھ مطابق، یا مساوی یا اس کے شان کے شایاں ہونا ضروری اور لازمی نہیں۔ مگر بعض غلط فہم لوگوں نے یہ خیال کیا کہ مثال کو ممثل کی شان کے برابر ہونا ضروری ہے۔ ان لوگوں کی تردید کے لئے قرآن حکیم میں ارشاد ہوا اِنَّ اللّٰہَ لَا یَستحی ان یضرب مثلاً مّا بعوضۃً فما فوقہا الخ الّا الفاسقین۔ جب اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں کفار کے معبودات باطلہ کو عاجز۔ غیر مقتدر۔ غیر مفید ثابت کرنے کے لئے مندرجہ ذیل دو آیتیں نازل فرمائیں تو کفار نے یہ اعتراض کرنا شروع کر دیا کہ اس قسم کی کمزور چیزوں کا ذکر کرنا خدا کی شان کے لائق نہیں۔ ایسی چیزوں کا ذکر تو وہ کرے جو کمزور کم حیثیت ہستی کا مالک ہو۔ خدا کی ہستی کے لائق تو یہ تھا کہ بڑے بڑے عظیم الجثہ حیوانوں یا کواکب یا آسمانوں یا ملائکہ جیسی عظیم ترین ہستیوں کا ذکر فرماتا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں ان اللّٰہ لا یستحی ان یضرب کو نازل فرمایا۔ جن دو آیتوں سے ان کو شبہ پیدا ہوا تھا وہ یہ ہیں۔ ان الذین تدعون من دون اللّٰہ لن یخلقوا ذباباً ولو اجتمعوا لہٗ وان یسلبہم الذباب شیئاً لا یستنقذوہ منہُ ضعف الطالب والمطلوب وما قدروا اللّٰہ حق قدرہ انّ اللّٰہ لقوی عزیز (پارہ ۱۷ سورۂ حج)

(۲) مثل الذین اتخذوا من دون اللّٰہ اولیاء کمثل العنکبوت اتخذت بیتاً واِنّ اوھن البیوت لبیت العنکبوت (پارہ ۲۰ سورہ عنکبوت)

ان بیوقوفوں کو اس بات کی سمجھ نہ آئی کہ اللہ تعالیٰ جس شے کی مثال بیان فرما رہا ہے اس کے مطابق یہی مثال ہو سکتی ہے کیونکہ ان دو مثالوں کے بیان کرنے سے یہ مقصد ہے کہ ان کے معبودات باطلہ کسی مفید چیز کے پیدا کرنے کی قدرت نہیں رکھتے اور نہ کسی مضر چیز کو معدوم کر سکتے ہیں۔ جب مکھی جیسی کمزور چیز کو پیدا کرنے کی انہیں قدرت نہیں تو کسی بڑی چیز کے پیدا یا معدوم کرنے کی ان سے کیونکر توقع ہو سکتی ہے۔ اگر مکھی ان سے کوئی

چیز چھین کر لے جائے تو اس کمزور ہستی کے جانور سے وہ چیز واپس دلانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ خواہ وہ سب کے سب اکٹھے ہو کر اس کے پیدا کرنے یا اس سے چیز کو واپس لینے کے درپے و ساعی ہو جائیں۔ شیطان نے ان کو کس قدر جاہل اور گمراہ بنایا کہ ایسی بے حیثیت بے بس چیزوں کو انھوں نے اپنا معبود قرار دے کر حوائج و مقاصد کو پورا کرنے کے لئے ان سے التجائیں شروع کر دیں۔ اور اپنے عجز و انکسار کو ان کے سامنے اس طور پر ظاہر کرتے ہیں جیسا کہ خالق مطلق کے سامنے ہونا چاہیئے۔ مَا قدروا اللّٰہ حق قدرہٖ۔

دوسری مثال میں بھی ان کی جہالت اور حماقت کا اظہار کیا گیا ہے۔ انسان دنیا میں جب مکان اور گھر تیار کرتا ہے تو اس کے سامنے کئی مقصد ہوتے ہیں۔ مثلاً موسمی تغیرات سے بچنے کے لئے مکان مفید ہوتا ہے۔ یا دشمنوں کے حملے سے محفوظ رہنے کے لئے ممد و معاون بنتا ہے۔ مگر عنکبوت کا گھر نہ تو ہوا کے جھونکوں سے بچاتا ہے اور نہ سردی گرمی کے حملوں کو روکتا ہے اور نہ ہی دشمنوں کی زد سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اسی طرح ان کے معبوداتِ باطلہ کسی مصیبت سے بچانے یا کسی فائدہ کے پہنچانے میں کارگر ثابت نہیں ہوتے ان کے مناسب حال یہی مثال ہو سکتی تھی جس کو قرآن حکیم نے ذکر فرمایا۔ مگر ان کی عقلوں پر ایسے پتھر پڑے ہیں بجائے اس کے کہ وہ مثالوں سے ممثل لہٗ کے حالات کا موازنہ کرتے اُلٹے مثال پر اعتراض کرنا شروع کر دیا۔

(۴) مثلھم کمثل الذی استوقد نارًا فلما اضاءت ما حولہٗ ذھب اللّٰہ بنورھم وترکھم فی ظلمات لا یبصرون صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ فھم لا یرجعون او کصیبٍ من السماء فیہ ظلمات و رعدٌ و برق یجعلون اصابعھم فی اذانھم من الصواعق حذر الموت واللّٰہ محیطٌ بالکفرین یکاد البرق یخطف ابصارھم کلما اضاء لھم مشوا فیہ واذا اظلم علیھم قاموا ولو شاء اللّٰہ لذھب بسمعھم وابصارھم ان اللّٰہ علٰی کل شیءٍ قدیر۔ (پارہ اول سورہ بقرہ)

جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی کو اختیار کر لیا اور بصارت کے عوض عمی کو پسند کیا۔ ان منافقوں کے حال کے مطابق اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا آیات میں دو مثالیں ذکر فرمائیں۔ ایک ناری اور دوسری مائی۔ نار سے روشنی اور اشراق معلوم ہوتا ہے اور پانی سے زندگی اور حیوٰۃ۔ جو وحی اللہ تعالیٰ نے آسمان سے نازل فرمائی وہ بھی دو چیزوں پر مشتمل ہے۔ اول حیات قلوب۔ دوم اضاءت نفوس۔

اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کو کہیں تو کلمۂ روح سے تعبیر فرمایا۔ اور کہیں اسے نور کہا گیا۔ اس سے فائدہ اٹھانے والوں کو احیاء کہا گیا۔ اور جنھوں نے اس کو قبول نہیں کیا انکو اموات سے تعبیر کیا گیا۔ وحی الٰہی کے نزول کے بعد جو حالت ان منافقین پر طاری ہوئی اس کی مثل یہ ہے۔ جیسے کسی شخص نے آگ جلائی تاکہ اس سے روشنی اور فائدہ اٹھائے۔ منافقوں نے بھی اسلام میں داخل ہو کر اپنے قلوب کو زندہ اور روشن کرنے کا خیال ظاہر کیا۔ اور کلمہ اسلام زبان پر لائے اور مسلمانوں سے میل جول کرنا شروع کیا۔ ظاہری کلمہ گو ہونے سے ان کے جان و مال محفوظ ہو گئے اور اہل اسلام میں ان کا شمار ہونے لگا۔ ہر ایک بات میں مسلمانوں کے ساتھ مساوی حقوق کے مستحق ہو گئے۔ کلمۂ اسلام چونکہ صرف ان کی زبان پر تھا۔ نور اسلام اور چراغ ہدایت ان کے دلوں میں نہ تھا لہٰذا ان کی روشنی گل ہو گئی۔ اظہار اسلام کے بعد انھوں نے نفاق کا کام شروع کیا۔ یا ابتدا میں پکے مُسلم بنے آخر میں نفاق کو پسند کیا۔ جیسا کہ ذھب اللّٰہ بنورھم سے معلوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نور کے چلا جانے کا ذکر فرمایا ہے۔ نار کے بجھ جانے کا تذکرہ نہیں فرمایا۔ جو اس بات کی طرف مشعر ہے کہ نار سے دو فائدے ہیں۔ اضاءت اور احراق۔ نور کے چلے جانے کے بعد اضاءت کا تو نام و نشان بھی باقی نہ رہا مگر نار کی دوسری صفت کا کام بدستور ان کے حق میں باقی رہا۔ جس سے تکلیف ان کو برابر پہنچتی رہی یعنی احراق اور دخان سے وہ دو چار ہوتے رہے۔ نور کے چلے جانے کے بعد وہ ایسے مرتد اور برگشتہ از اسلام ہوئے کہ دوبارہ زمرۂ اسلام میں آنے کی توقع ہی نہیں رہی۔ جیسا کہ صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ کے ارشاد سے ظاہر ہے۔ یہ ایک منافقوں کی خاص جماعت ہے جس پر مثال

ناری منطبق ہوتی ہے۔

او کصیب من السماء الخ کو بھی عام مفسرین نے اسی قسم کے منافقین کی مثال بیان فرمائی ہے۔ حالانکہ قرآن کے الفاظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں ایک گروہ کی مثالیں نہیں ہوسکتیں کیونکہ آیت صمٌ بکمٌ عمیٌ الخ سے ان پر عدم رجوع الی الاسلام کا قطعی حکم لگایا گیا ہے۔ دوسری مثال میں صاف طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ یکاد البرق یخطف ابصارھم الخ ابھی تک ان میں بصارت کا مادہ موجود ہے۔ اور اس بات کا امکان ہے کہ وہ شاید ہدایت پر چل کر کچھ نہ کچھ فائدہ اٹھاتے رہیں جیسا کہ کلما اضاء لھم مشوا فیہ سے مفہوم ہوتا ہے۔ ان الفاظ میں غور کرنے کے بعد یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں منافقون کی دو قسموں کی دو مثالیں بیان کی گئی ہیں ایک نفاق فی الاعتقاد۔ دوسرا نفاق فی العمل۔ پہلی مثال منافقین فی الاعتقاد کی ہے اور دوسری مثال منافقین فی العمل کی۔ منافقین فی العمل کا اعتقاد اسلام کے متعلق درست ہے وہ اسلام کو سچا مذہب جانتے ہیں مگر شامت اعمال اور تکاسل کے باعث میدان عمل میں کمزوری دکھاتے ہیں۔ جیسا کہ کلما اضاء لھم الخ سے ظاہر ہے۔ اسلام کے تہدید آمیز جملے اور اوامر و نواہی کو جب سنتے ہیں تو انھیں صاعقہ کے مشابہ نظر آتے ہیں۔ اور احکام و اوامر ان کی جان پر ایسے مشکل معلوم ہوتے ہیں جیسا کہ صاعقہ کا برداشت کرنا۔ انسان کی طاقت سے بالاتر ہے۔ اسی خوف کے مارے اس کے سننے سے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونستے ہیں تاکہ نہ وہ سنیں اور نہ تکلیف شرعی کے پابند ہوں۔ مگر جب انھیں کوئی خاص مطلب یا ضرورت درپیش آتی ہے تو اس وقت پورے منقاد و مطیع ہو جاتے ہیں یا جب غنیمت اور مال مل جانے کی توقع ہوتی ہے تو پکے مومن بن جاتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ کسی جنگ یا سفر میں فتح اور کامیابی نہ ہو تو اسلام کو خیرباد کہہ دیتے ہیں۔ اور اگر پھر کسی مصیبت کو دور کرانے یا کسی حاجت کو پورا کرانے کے لئے ضرورت لاحق ہو تو پھر پورے پابند اور عامل بالشرع ہو جاتے ہیں۔ ابن الوقت کی طرح جب مطلب پورا ہو جاتا ہے

تو مذہب کو خیر باد کہہ دیتے ہیں اور اپنے مشاغل دنیاوی میں منہمک اور مستغرق نظر آتے ہیں۔ جب پھر کسی موقع پر کوئی ضرورت درپیش آئی تو راہ خدا میں جانثار ہونے کے مدعی بن جاتے ہیں۔ کُلَّمَآ کا لفظ تکرار پر دلالت کرتا ہے۔ یکاد البرق سے عدم زوال بصر کا پتہ چلتا ہے لہٰذا ان دو مثالوں کو ایک گروہ پر چسپاں کرنا عدم تدبر الفاظ قرآن پر دال ہے۔ ان منافقین کی مثال کے مناسب مدعیان اسلام میں سے اور بھی کئی خاص فرقے پائے جاتے ہیں۔ جن کے دلوں میں اگرچہ اسلام جاگزیں ہے۔ مگر بعض بعض مسائل اور معتقدات میں ان کا من وجہٍ اختلاف ہے جیسے منکرین صفاتِ الٰہی خدا کی توحید اور ذات کو پورے طور پر تسلیم کرتے ہیں مگر جب ان کے سامنے آیات صفاتِ الٰہی یا احادیث صفات الٰہی جو ان کے معتقدات باطلہ کے خلاف ہیں پڑھی جائیں، تو وہ منافقین کی طرح کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں۔ اور اس آیت کے مصداق بن جاتے ہیں۔ کَاَنَّھُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَۃٌ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَۃٍ۔ پارہ ۲۹ سورہ مدثر۔

ایسے ہی وہ لوگ جو کسی نوع کے شرک میں مبتلا اور گرفتار ہیں۔ اگر توحید خالص کی آیتیں ان پر پڑھی جائیں تو وہ بھی اس آیت شریفہ کے مصداق بن جاتے ہیں جو اللہ تعالےٰ نے ان کے حق میں نازل فرمائی ہے۔

وَاِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَحْدَہُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ وَاِذَا ذُکِرَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِہٖ اِذَا ھُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ۔ (سورہ زمر پارہ ۲۴)

ایسے ہی اعدائے صحابہؓ رفضہ یا اعدائے اہل بیتؓ خوارج کے روبرو جب صحابہؓ یا اہل بیتؓ کے فضائل کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں یا ان کی فضیلت میں احادیث نبویؐ سنائی جاتی ہیں تو انھیں نہایت ہی گراں معلوم ہوتی ہیں اور ان کے دل اس کے سننے سے بہت بیزار ہوتے ہیں۔ حفظنا اللہ تعالیٰ عما ابتلا بہ کثیرا من الناس۔

مثال مذکور میں منافقین کی غیر محسوس تکلیف کو بصورت محسوس دکھانا مقصود ہے

منافق دل ہی دل میں نہایت پریشانیوں اور مصیبتوں میں گرفتار تھے۔ اگر ان تکالیف و مصائب کو محسوس صورت میں دکھایا جائے تو بعینہ مستوقد نار یا اصحاب صیّب کی سی مصیبتوں میں گرفتار ہیں۔ ہر ایک مثال چونکہ تشبیہ مرکب کی قسم سے ہے اجزائے مثل اور ممثل لہ کا باہم منطبق ہونا ضروری نہیں صرف ایک حالت کو دوسری حالت سے تشبیہ دینا مطلوب ہے۔ جیسے قرآن حکیم نے منافقین کی دو قسمیں ذکر فرمائیں ویسے ہی مومنین اور کفار کی بھی دو قسمیں ہیں: مومنین اول السابقون المقربون جن کا ذکر سورہ واقعہ میں آیا ہے۔

(۲) انزل من السماء ماءً فسالت اودیۃٌ بقدرھا فاحتمل السیل زبداً رابیاً ومما یوقدون علیہ فی النار ابتغاء حلیۃٍ او متاعٍ زبدٌ مثلہ کذالک یضرب اللہ الحق والباطل فاما الزبد فیذھب جفاءً واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض کذالک یضرب اللہ الامثال (سورہ رعد پارہ ۱۳

یہاں بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے دو مثالیں بیان فرمائی ہیں ایک ناری اور دوسری مائی۔ جو وحی کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اتاری تاکہ مومنین کے قلوب اور قوائے نظریہ وغیرہ میں زندگی پیدا کرے اس کو اس پانی سے تشبیہ دی گئی جو آسمان سے زمین کی زندگی اور اس کے نشوونما کے واسطے اتارا جاتا ہے۔

قلوب کو وادیوں سے تشبیہ دی گئی۔ بعض قلوب وسیع ہوتے ہیں جو بہت سے علوم کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ جیسے کہ وادی کبیر میں زیادہ پانی کی گنجائش ہوتی ہے اور بعض قلوب صغیر جو اپنی بساط کے مطابق تھوڑے سے علم کی استعداد رکھتے ہیں۔ جیسا کہ وادی صغیر میں تھوڑا سا پانی سما سکتا ہے۔ جیسا کہ وادیاں اپنی گنجائش کے مطابق پانی کو اپنے اندر جگہ دیتی ہیں۔ اسی طور پر قلوب بھی علم اور ہدایت کو اپنی استعداد کے مطابق قبول کر لیا کرتے ہیں۔ جس زمین پر سیلاب گزرتا ہے اس کے خس و خاشاک اور تنکوں کو اپنے کندھے پر اٹھا لیتا ہے۔ اسی طرح علم اور ہدایت بھی جب قلوب میں جاگزیں ہوتے ہیں تو تمام شبہات۔ شہوات باطلہ قلبیہ کو باہر نکال لاتے ہیں۔

جیسے کسی مریض کو جب دوائے مسہل پلائی جائے تو وہ اسکے پیٹ سے موادردیہ واخلاط فاسدہ کو ابھار کر باہر نکالنے میں امداد دیتی ہے اس وقت اگرچہ مریض کی طبیعت میں پریشانی اور غثیان تکدر کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں مگر درصل یہ پریشانی اسکی صحت کا پیش خیمہ ہے یہ دوا اسکے بدن کو موادموذیہ واخلاط غیر طبعیہ سے پاک و صاف کردیگی۔ ایسے ہی وحی الہٰی کا پانی جب قلوب انسانی میں منجذب و مجتمع ہوتا ہے تو تمام عقائد باطلہ و شبہات شیطانیہ کے استیصال میں ممدومعاون بنتا ہے۔ باطل اور ردی مواد کے اخراج کے بعد قلوب آئینہ وار ہو کر اس قابل ہو جاتے ہیں کہ انوار وحی کا عکس قبول کرلیں۔

مثل ناری میں بھی اسی طرح حق و باطل کے امتیاز کا تذکرہ فرمایا گیا۔ سنار جب سونے چاندی وغیرہ کے فلزات معدنیہ کو کٹھالی میں ڈال کر آگ پر رکھتا ہے تو جو غل و غش اس میں ملے ہوئے ہیں انکو اعماق فلزات سے نکالکر ظاہری سطح پر نمودار کردیتا ہے اس موقع پر کھرے اور کھوٹے مفید و غیر مفید کو علحدہ کرنا نہایت ہی آسان ہو جاتا ہے۔ خالص سونا یا چاندی کٹھالی کی تہ میں منجمد و بستہ ہو کر رہ جاتا ہے جس طرح پہلی مثال میں پانی کی سطح بالا سے خس و خاشاک کا دور کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ وحی الہٰی و علوم خداوندی کا نزول جس وقت قلوب و نفوس پر ہوتا ہے تو شبہات و خواہشات نفسانی کی صورت بالکل الگ تھلگ نظر آنے لگتی ہے۔ ان حالات میں ہر ذی بصر سونے کو سونا، پانی کو پانی حق کو حق باطل کو باطل جاننے میں متردد و متحیر نہیں رہتا پانی سے ہر قسم کے منافع و فوائد حاصل کئے جاتے ہیں اور خس و خاشاک بیکار ردی سمجھے جاتے ہیں ایسے ہی زبد بیکار اور ردی شمار کی جاتی ہیں۔ علوم حقیقہ و معارف حقہ کے منافع علی الدوام ثمرات حسنہ و نتائج مفیدہ کیلئے منتج ہوتے رہتے ہیں اور شکوک و شبہات بے حقیقت ہو کر غیر ملتفت الیہ اور بے اعتنا خیال کئے جاتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں قلوب بنی آدم کی تقسیم تین قسموں پر فرمائی ہے جیسے نزول مآء من السماءِ کے وقت زمین کی تین قسمیں ذکر فرمائیں۔

(۱) زمین طیب شیریں جو پانی کو اپنے اندر جذب کر کے قوائے نامیہ و مولدہ کو مستعد و آمادہ کردیتی ہے۔ مناسب موسم و ملائم وقت پر مختلف قسم کی کھیتیاں اور پھول پھل پیدا کرتی ہے جس سے ہزارہا نفوس انسانی و حیوانی متمتع و مستفید ہوتے رہتے ہیں۔ یہ کھیتیاں اور پھول پھل خود زمین کے لئے بھی موجب حسن و خوبصورتی سمجھے جاتے ہیں اور جن لوگوں کی زندگی کا دارومدار ہی ان پر ہے انکے فوائد و عوائد کا تو ذکر ہی کیا۔

(۲) دوسری قسم کی وہ زمین ہے جو بصورت حوض پانی کو تو جمع کر لیتی ہے لیکن نہ اس میں کوئی سبزہ اُگتا ہے۔ اور نہ کوئی کھیتی باڑی پھول وپھل نشو ونما پاتے ہیں۔ لیکن ہزاروں جانوروں کی پیاس بجھانے اور سیر کرنے میں وہ ممد و کار آمد ثابت ہوتی ہے۔

(۳) تیسری قسم کی وہ زمین ہے جو چٹیل میدان کی شکل میں پائی جاتی ہے۔ نہ تو وہ خود پانی کو جذب کرتی ہے۔ اور نہ اس کی وضع ایسی بنائی گئی جو پانی کو جمع کر سکے۔ جو بوند آسمان سے اس پر گرتی ہے اسے پھسلا کر دوسری زمین کی طرف منتقل کر دیتی ہے۔

پہلی زمین کی مثال ان لوگوں کے ساتھ مشابہت رکھتی ہے۔ جنھوں نے علوم الٰہی کو اپنے دلوں میں جگہ دی اور ان سے خود بھی فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچانے میں اعانت کی۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے علوم الٰہی کو حاصل کرنے کے بعد ان پر عمل پیرا ہو کر دوسروں کو اپنی تبلیغ وپند ونصیحت سے فائدہ پہنچایا۔

دوسری زمین کی مثال ان لوگوں کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے جو بہت سے علوم حقہ پڑھ کر یاد کر لیتے ہیں۔ اور ان کی حفاظت میں بھی اپنی تمام سعی وکوشش کو صرف کر دیتے ہیں مگر خود میدان عمل میں ناکام اور غیر فائز المرام نظر آتے ہیں۔ مگر اور لوگ ان سے علوم سیکھ کر شاہراہِ ہدایت پر چل کر قرب الٰہی و رضائے خداوندی حاصل کر لیا کرتے ہیں۔ مگر وہ باوجود اس قدر علوم الٰہی اور ذخائر خداوندی کے مالک ہونے کے کمثل الحمار یحمل اسفارا کا نمونہ بن جاتے ہیں۔

(۳) تیسری قسم کی زمین ان لوگوں سے مشابہت رکھتی ہے جنھوں نے نہ تو علوم الٰہیہ کو اخذ کر کے خود فائدہ اٹھایا۔ اور نہ ان علوم و ہدایات کو جمع کر کے دوسروں تک پہنچانے میں امداد کی۔ یہ مثال مومنین کے لئے بیان کی گئی ہے۔ پہلی مثال میں بھی نار اور ماء کا ذکر کیا گیا مگر وہاں چونکہ منافقین پر اس کا چسپاں کرنا مطلوب تھا۔ تو اس کے ساتھ اس قسم کے امور کا تذکرہ کیا گیا جو منافقین کے حالات سے مناسب تھے۔ سورہ رعد میں یہ مثال ہدایت اور ضلالت کے لئے لائی گئی تھی۔ اس میں ایسے مناسبات جمع کئے گئے جو اس کے ساتھ پوری مناسبت رکھتے تھے۔

پاٹ

(ریڈیو ڈراما)

(صرف آوازیں سنائی دیتی ہیں)

مقام —— یو پی کا کوئی شہر

زمانہ —— موجودہ

کردار جس طرح سامنے آتے ہیں

شیخ جی	ایک جلاہا - جو پیشہ چھوڑ چکا ہے۔
یوسف	شیخ جی کا پوتا عمر ۶ سال نذرو کا بیٹا
شیخانی	شیخ کی بیوی
زلفن	شیخ جی کی لڑکی عمر ۱۵ سال
یوسف کی ماں	نذرو کی بیوی
بفاطن	باورچن —— آج کل بیکار ہے
رتن لال	ایک وکیل جو "اگاہی ہولی[1]" پر روپیہ بانٹتا ہے
منا	رتن لال کی بیوی
راج منی	رتن لال کی خادمہ

---

[1] ایک اگاہی دس روپیہ کی ہوتی ہے۔ ایک اگاہی لینے کے بعد عہ ماہوار سال بھر تک دینا ہوتا ہے۔

داروغہ جی ایک تھانیدار

نذرو شیخ جی کا بڑا لڑکا عمر ۲۵ سال میونسپلٹی میں ۱۵ روپیہ ماہوار کا ملازم ہے

یامین نذرو کا بڑا لڑکا۔

دوکاندار نخاس میں بیٹھنے والا ایک کباڑی

پہلا ایکٹ ——————— پہلا سین

(**نخاس** - دور پرے آوازیں آرہی ہیں

۱- کیا بولے اس میز کا —— کیا بولے —— کیا بولے اس میز کا۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

۲ " نو آنے ایک —— نو آنے دو —— نو آنے۔۔۔۔۔۔۔۔"

۳ " ہر مال ملے گا چار آنے کو —— ہر چیز ملے گی چار آنے کو" (دھن میں)

آدمیوں کے چلنے پھرنے، بولنے غل مچانے کا غوغا۔)

(ایک منٹ تک یہی غل وشور سنائی دیتا ہے۔ پھر بالکل قریب سے آواز آتی ہے)

دوکاندار۔ بڑے میاں کیا چاہتے ہو۔ آؤ —— ادھر آؤ ہم دکھائیں

شیخ جی۔ (دور سے) ذرا اس کونڈے کو دیکھ رہا تھا۔

دوکاندار۔ آئیے —— دیکھئے —— آئیے نا۔ یہ ؟

شیخ جی۔ نہیں وہ (بالکل قریب آکر) وہ ——————— اودھر۔ ہاں

دوکاندار۔ " صاحب آپ نے چیز اچھی پسند کی۔ بالکل نیا پاٹ ہے۔۔۔۔۔۔"

یوسف۔ پی۔ او۔ ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن ۔ پی۔ او۔ ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن

(POT کا تلفظ ٹھیک ادا کرتا ہے) رٹے جاتا ہے

دوکاندار۔ نہ ٹوٹا نہ پھوٹا۔ ایک ذرا ادھر ٹھیس لگ گئی ہے۔ ہاں صاحب سچ بولنا چاہئے۔

چاہے کوئی لے۔ چاہے نہ لے۔ اور سب ٹھیک ہے

یوسف۔ پی۔ او۔ ٹی پاٹ۔۔۔۔۔۔ (رٹے جاتا ہے)

دوکاندار "ہاتھ میں لے کر دیکھئے ——— ماشے اللہ سے 'شاہب جاوے' نے انگریزی خوب یاد کی ہے۔"

شیخ جی - بڑا ہسیار ہے۔ اپنے بھائی کو سن سن کر سیکھ گیا۔ ہاں اور تو سناؤ۔ وہ کیا 'سنن' معنی سورج ——۔ اور 'ہاٹھاٹ' معنی گرم

یوسف - (نعرہ مارتا ہے) پی - او - ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن - پی - او - ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن (اتنی دیر میں اس نے دھن پیدا کر لی)

شیخ جی - اور بتاؤ "سنن" بتاؤ —— "ہاٹھاٹ" بتاؤ

یوسف - پی - او - ٹی .... (بکتا ہوا دور چلا جاتا ہے)

شیخ جی - بیوقوف! دام کیا ہیں؟

دوکاندار - "جو چاہے آپ دیدیں۔ اس کا ڈھکنا کھو گیا ورنہ صاحب لوگ کہیں ایسی چیز چھوڑتا ہے 'ردیوں' میں بک جاتی۔"

شیخ جی - "بات یہ ہے کہ گھر والی نے کہا تھا کہ ایک اتنا بڑا' اور تین چھوٹے چھوٹے پاٹ (تلفظ غلط ہے کی طرح ادا کرتا ہے) لیتے آنا۔ اب اس کے خریدنے میں یہی ہے کہ ان کو پسند آئے۔ یا نہ آئے۔"

دوکاندار - "پسند نہ آئے تو واپس۔ دوکان آپ کی ہے۔ اور بڑے صاحب ایسی چیز تو گھر میں ہونا چاہیئے۔ کوئی "فیشانیبل" آجائے۔ آپ لوگوں کے یہاں تو سب طرح کے لوگ آتے ہوں گے۔"

شیخ جی - واپس کیا کرنے آئیں گے۔ بڑی دور رہتے ہیں۔ محلہ بانس گنج میں مکان ہے

دوکاندار - درست - اچھا صاحب میں ایک دام کہوں گا۔ بس کچھ کہیئے گا نہیں - میں نے خانساماں سے ۵ ر کا خریدا ہے۔ آپ کو ۶ ر کا دیدوں گا۔

شیخ جی - اتنے دام نہیں۔ کہو تو چار آنے دیدوں۔

دوکاندار۔ "اب گنزائش نہیں۔"

شیخ جی - "اچھی بات تمھاری چیز ہے۔ (دور جاکر) یوسف ادھر آ۔ (لڑکے کی آواز قریب

آجاتی ہے)۔

دوکاندار۔ "اجی جاتے کہاں ہیں۔ اچھا لیجئے۔ آپ کی بات کیا ٹالوں آپ کی صورت میرے چچا سی ملتی ہوئی ہے۔ یہ ایسی چیز ہے۔ کہ ——— اب کیا بتاؤں۔ برسوں رہے اور پرانی نہو۔ اچھا اور کیا چاہئے۔ یہ مٹی کے تیل کا چولھا لے لیجئے۔ اچھا یہ دیکھئے ایک لمپ رکھا ہے۔ شادی بیاہ ہو۔ تقریب ہو۔ کوئی آئے جائے۔ اسی سے حیثیت بن جائے گی بستا دیدوں گا اچھا اور کچھ ؟"

شیخ جی۔ چھوٹے پاٹ چاہئیں۔

دوکاندار۔ کس کام کے لئے ؟

شیخ جی۔ یہی کام کیا۔ عید قریب ہے۔ ذرا سوئیوں اویوں کے لئے ضرورت ہوگی۔

دوکاندار۔ او چھوٹے لال۔ او چھوٹے لال۔ ذرا بڑے میاں کو پیالے دکھانا۔ عمدہ قسم کے ہوں سستے دینا۔ یہ اپنے ہی ہیں ——— شیخ جی چونی تو ذرا کھراب ہے۔ دوسری بدل دیجئے۔

(بھدی آواز سے الاپتا ہے) "من کی آنکھیں کھول پیارے"

پہلا ایکٹ سین دوسرا

شیخانی۔ "یہ کہاں رہ گئے تھے"

شیخ جی۔ تمہارا سودا کچھ ایسا ویسا ہوتا ہے۔ شہر بھر گھوم کر سب سامان لایا ہوں۔ لالٹین قریب لاؤ تو دکھاؤں۔

شیخانی۔ کیا ہے ؟ جس کے لئے اتنی اچاپٹ ہو رہی ہے۔ ادھر لاؤ۔ ذرا کھولوں۔

یوسف (چلانے لگتا ہے) پی۔ او۔ ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن۔ پی۔ او۔ ٹی پاٹ

یوسف کی ماں۔ چپ۔ کیا بک بک لگائی ہے۔

یوسف کی ماں }
شخانی } ایک ساتھ { یہ کیسی کونڈالی
زلفن } { یہ کیا لائے
{ اچھو ہو

یوسف۔ (پھر چلانے لگتا ہے) پی۔ او۔ ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن۔ پی۔ او۔ ٹی پاٹ
(دور ہوتا جاتا ہے)

شخانی۔ یہ کس کام کی۔ اتنی تو بڑی ہے۔ اس سے نکالتے نہیں بنے گا۔ سوئیوں کے کام کی تو نہیں۔

شیخ۔ اتنا تو اچھا ہے۔ تم کہتی ہو کام کا نہیں۔ (ذرا تیز ہو کر) ایک روپیہ دیا تھا کہ اس میں ایک کونڈالی لاؤ۔ تین پیالے لاؤ۔ چھ چمچے لاؤ۔ ایک طرف پیدل مرو۔ دوسری طرف کا اکہ کا کرایہ اسی روپیہ سے نکالو۔ روپیہ نہوا عمر عیار کی زنبیل ہو گیا۔ خالی کونڈالی روپیہ سے کم کی نہیں ملتی تھی۔ یہ تو ذرا پرانا ہے' اس لئے مل بھی گیا۔

زلفن۔ اماں اچھی تو ہے۔ اس میں تو پکڑنے کا کنڈھا بھی لگا ہوا ہے۔ یہ اور اچھا ہے ہاتھ نہیں جلے گا۔

یوسف کی ماں۔ جیسے چار کی پیالی ہو۔ کیسی خوبصورت

شیخ جی۔ میرا لایا ہوا سودا تو کبھی ان کو بھاتا ہی نہیں۔ دو پہر سے دوڑتے دھوپتے یہ وقت آیا میرا سن اب ایسا نہیں ہے کہ تین میل پیدل چلوں۔ پھر الیسف ساتھ۔

شخانی۔ یہ ہے کتنے کی ؟

شخانی۔ اب تم ہی بتاؤ کتنے کا آنکتی ہو۔ صاحب لوگوں۔ رئیسوں کے کام کی چیز ہے۔ دوکاندار کہتا تھا اگر اس کا ڈھکنا ہوتا تو جھٹ سے روپوں میں بک جاتی۔

شخانی۔ ۸ر آنے سے زیادہ کی نہیں ہے۔

شیخ جی۔ چھ آنے کا ہے۔

شخانی ۔ سستی تو ضرور ہے ۔ مگر پرانی چیز ہے ۔
زلفن ۔ (ٹن سے آواز آتی ہے) یہ کیا ہے ؟
شیخ ۔ یوں ہی ذرا سی ٹھیس لگ گئی ہے ۔ مگر یہ ایسی چیز ہے کہ برسوں رہے، اور پرانی نہو۔
زلفن ۔ ارے یہ اور زیادہ سفید ہے ۔ دیکھو تو اماں میں نے یہاں ذرا انگلی سے رگڑا تھا کیسا سفید نکل آیا۔
یوسف کی ماں ۔ دھولا ۔ دھولا
شخانی ۔ بالکل چار کی پیالی ۔
یوسف ۔ اماں ! اماں ۔ کیا بڑے لوگوں کی چار کی پیالی بڑی ہوتی ہے ۔

(سب قہقہہ مار کر ہنستے ہیں)

یوسف کی ماں ۔ چپ پگلے ۔ کہیں بڑے آدمی ہونے سے ان کی چیزیں بھی بڑی ہو جاتی ہیں
یوسف ۔ واہ راجہ صاحب کا مکان اتنا بڑا ہے کہ کچھ کہنے کو نہیں ۔
شخانی ۔ بات یہ ہے کہ ایسی نئی نئی چیزیں بڑے گھروں میں اچھی لگتی ہیں ۔ اب جو ہمارے یہاں دیکھے گا یہی سمجھے گا کہ کہیں سے اٹھا لائے ۔
لڑکی ۔ (دور سے چلا کر) کیا اماں غریب لوگوں کے دل نہیں ہوتا ۔ اچھی چیزیں سب ہی کو اچھی لگتی ہیں ۔ جس کو میسر آئے وہی رکھے ۔ تم تو ایسی کہا کرتی ہو ۔
شیخ جی ۔ سچ ہے ۔ گھر میں دو ایک اچھی قسم کی چیزیں بھی ہونا چاہیئے ۔ دو کاندار تو ایک لمپ بھی دے رہا تھا ۔ کہتا تھا کہ آپ کے یہاں تو سب ہی طرح کے لوگ آتے ہیں ۔ میں بھی سوچتا ہوں کہ اب تھوڑا تھوڑا کر کے حیثیت کی چیزیں لے آؤں گا ۔ نذرو کے دوست ہیں جو سرکار میں نوکر ہیں ۔ وہ آتے ہیں ۔ شاید کبھی نذرو کا صاحب آ جائے ۔ ایک بار داروغہ جی آئے تھے ۔
شخانی ۔ تو کیا جو آئے گا اسی کو یہ کونڈالی دکھاتے پھروگے ؟

شیخ جی ۔ (بگڑ کر) نہیں۔ تم نے نہ جانے کیسی کھوپڑی پائی ہے ۔ اسی طرح کی چیزیں اور لاؤں گا جیسے لمپ۔

شخانی ۔ مکان ٹھیک کرانے کو روپیہ نہیں ہے ۔ لمپ لائیں گے ۔ لمپا لائیں گے ۔

شیخ جی ۔ (زیادہ بگڑ کر) لمپ میں کون چھپن ٹکے لگ جائیں گے ۔ جو میں کہتا ہوں تم ہمیشہ اس کی الٹی کہتی ہو۔

شخانی ۔ بڑے آدمی بنیں گے ۔ یہ منہ اور مسور کی دال۔

زلفن ۔ کیسی ادجلی ادجلی نکل آئی ۔ دیکھو اماں۔

یوسف کی ماں ۔ اہا ۔ اے خالہ اسے عید کے دن ضرور نکالنا۔

شیخ جی ۔ سنو دولھن ۔ تم اپنی خالہ کو بکنے دو۔ عید کو ضرور نکالنا۔ اور وہ پھولدار چدّر نکالنا۔ ساری عمر یہی ترستے رہے کہ کچھ حیثیت بنے ۔ مگر ان کی وجہ سے کچھ نہوا۔

شخانی ۔ (بگڑ کر) میری وجہ سے ؟ اپنی تقدیر کہو۔ کبھی پیسہ بھی جڑا جو حیثیت بنتی ؟ ۔ اب لڑکا پندرہ روپیہ کا نوکر ہو گیا ہے تو حیثیت بنائیں گے (چمک کر) یہ موئی چار کی پیالی کی ایسی کنڈلیا آئی ہے ۔عید کو نکالی جائے گی ۔ ایک پھولدار چدّر پڑی ہے وہ نکالی جائے گی ۔ بس ہوگئی حیثیت ۔ چدّر نہیں چدّرا نکلے گا ۔ ابھی لڑکی بیاہنے کو پڑی ہے ۔ چدّر اس کے کام آئے گی ۔ یا بڑھوتی میں ان کی حیثیت بنائے گی۔

یوسف کی ماں ۔ " خالہ کیا ہرج ہے اگر شیخ جی لمپ لے آئیں گے "

شخانی ۔ تو چپ رہ ۔ بڑی چلی ہے ۔ بیچ میں بولنے والی خصم کیا نوکر ہو گیا سمجھتی ہے کہ میں کچھ ہوگئی ۔جب تک میں زندہ ہوں تو کیا ہے ۔

یوسف کی ماں ۔ خالہ تم تو ہوا سے لڑتی ہو ۔ میں نے کب کہا میں گھر والی ہوں ۔

شخانی ۔ (آپے سے باہر ہو کر) گھر والی ۔ گھر والی ۔ گھر والی

(پاٹ جو پانی سے بھرا ہوا ہے بدھیے گر پڑتا ہے)

شیخ جی - کیا ہوا - توڑ ڈالا۔

زلفن - ارے یہ یوسف کنڈالی کب اٹھالے گیا۔

یوسف کی ماں -" ابے ادھر آحرامزادے - کمبخت - خدا تیرا ستیاناس کرے"

یوسف (دور سے) "پانی بھر کر ناؤ تیرا رہے تھے"

یوسف کی ماں - چل ناؤ کے بچے - کمبخت (آواز دور ہوتی جاتی ہے) (دھب دھب مارتی ہے)۔

یوسف (روتا ہوا) اب نہیں کریں گے - اب نہیں

شخانی - (دوڑ کر جاتی ہے) چھوکری تیرے حواس ہیں - (دھب دھب) چھوڑ۔ چھوڑ۔ آگ لگے اس کنڈالی کو۔ میرے بچے کو پیٹ کر رکھدیا - چپ رہ - چپ رہ - لا ناؤ کہاں ہے - آ۔ ابھی پانی بھر کر تیراتی ہوں۔

زلفن - ایسف رو نہیں - رو نہیں - اماں لاؤ - یہ کنڈالی مجھے دیدو - ایسف تمھارا کہا نہیں سنتا - اگر چپ نہ ہوگے تو میں لے جاؤں گی۔

یوسف - (روتا ہوا) لاؤ - لاؤ ہمارا پاٹ لاؤ - پی - او - ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن - پی - او ٹی - پاٹ پاٹ معنی برتن۔

شخانی - (قریب آکر) وہ تو میں کہتی تھی - کہ یہ بڑے گھروں کی چیزیں ہم لوگوں کو راس نہیں آسکتیں - (ٹھنڈی سانس بھر کر) "جھونپڑیں" میں رہ کر محلوں کا خواب - جس حالت میں ہو پڑے رہو۔

شیخ جی - " اب تو لے آیا ہوں"

شخانی - ہاں لے تو آئے ہو - (ذرا چپکے سے) تم کہتے ہو کسی صاحب کا مال ہے اب وہ مردہ ہو یا زندہ - مجھے تو یہی ڈر ہے کہ منحوس نہ نکلے - پرانی دھرانی چیزیں میں یہی تو برائی ہوتی ہے۔ دیکھو وہ بندا جس دن سے آیا، کیسی تباہی آئی - کھانے تک کو نہیں جڑتا تھا - اور جب سے الگ کیا گیا،

ذرا کھانے پینے کا سستا ہوا۔

زلفن ۔ اماں بہو جی کوٹھری میں گھس گئی ۔

شیخانی ۔ مجھے تیہا دکھاتی ہے ' ایسپھ ' کو دھنک کر ڈال دیا ۔ رہنے دے مردار کو وہیں (نقل کر کے) " میں کب کہتی ہوں کہ میں گھر والی ہوں " تو کہہ کب سکتی ہے ؟ میرے ہوتے ہوئے ۔ میں مالک ہوں گھر کی ۔

شیخ جی ۔ تم تو ہوا سے لڑتی ہو ۔ وہ بچاری تو سیدھی سی بات کہہ رہی تھی کہ لمپ لانے میں کیا برائی ہے ۔

شیخانی ۔ ہاں جو تمھاری ایسی کہے وہی اچھا ہے ۔

شیخ جی ۔ (ذرا تیز ہو کر) میری ایسی کیا ۔ وہ گھر بنانے والی بات کہہ رہی تھی ۔ تم نے اتنے دنوں میں ذرا سی بھی گرستی نہیں جوڑی ۔

شیخانی ۔ (تیز ہو کر) گرستی کیا جوڑتی ۔ پیٹ بھرنے کو نہیں تھا ۔ گرستی جوڑتی ، آج تو تم بڑی بڑی باتیں سیکھ کر آئے ہو ۔ اسی مردار نے کان میں ڈالی ہوں گی ۔ گرستی نہیں ہے حیثیت نہیں ہے ۔ اے خدا کا شکر بھیجو کھانے کو مل جاتا ہے ۔ ہزاروں ایسے گھومتے ہیں جن کو پیٹ بھرنے کو سوکھا ٹکڑا ۔ اور تن ڈھکنے کو چیتھڑا نہیں ۔ آدمی کو چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہیئے ۔

شیخ جی ۔ تم تو زندگی اجیرن کئے دیتی ہو ۔ اب تک تو ہم ہی تھے ، اب بیٹھے بٹھائے اس بچاری سے اُلجھ پڑیں ۔

شیخانی ۔ (کنکھار کر) تم تو بڑھاپے میں سمجھ کھو بیٹھے ۔ اگر بہو کے سامنے ایسی باتیں کرو گے تو اس کا دماغ پھر جائے گا ۔ گھر بار سمیٹ کر ہم لوگوں کو دودھ کی مکھی کی طرح الگ کر دے گی ۔ اس بڑھاپے میں کس کے دروازے جا کر پڑو گے ۔ کنڈالی رہنے دو ۔ جیسا تم چاہتے ہو ویسا ہی ہو گا عید کے دن ۔

(جوتیوں کی سڑ سڑ کی آواز دور سے آتی ہے)

بفاطن ۔ اے سکھانی کہاں ہیں ؟

شنخانی ۔ کیا ہے بفاطن ۔ چھپر کے نیچے آؤ ۔ (چپکے سے) کنڈالی کپڑے سے ڈھانک دو کنڈالی کپڑے ڈھانک دو (زور سے) کیسے آنکلیں ؟

(بفاطن جوتیاں سڑ سڑ کرتی ۔ اونگلیوں سے پیالہ بجاتی اندر آتی ہے)

بفاطن (اٹھلا اٹھلا کر کہتی ہے) ہم نے اس وقت چنے کی روٹی پکائی ہے ۔ اسے دیکھ کر منے نے ادھم جوت دیا ۔ کہ دال بھات لاؤ ۔ دال بھات لاؤ ۔ تمھارے یہاں پکا ہو تو ذرا سا لیتی جاؤں ۔ صبح پکاؤں گی تو دے جاؤں گی ۔

شنخانی ۔ دال تو ابھی لگ گئی تھی ——— لیتی جاؤ تھوڑی سی ۔

بفاطن ۔ یہ کپڑے سے ڈھانک کر کیا دھرا ہے ؟

(یوسف دور پر چلتا ہے ۔ پی ۔ او ۔ ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن پاٹ معنی برتن)

شنخانی (جلدی سے) ادھر نہ جاؤ ۔ اس میں وہ بند ہے ۔ کیا نام وہ ۔ ایسپھ کے لئے ایک چڑیا پکڑی ہے ۔

بفاطن ۔ ہونہ ۔ اے ایک پنجرا منگوالو ۔ کیا اس میں بند کیا ہے ۔ کالا کالا کیا ہے ۔ کنڈھا ۔

شنخانی ۔ ہاں منگواؤں گی ۔ ۱۵ روپیہ میں کیا کیا کروں ۔ سب تو سب مردار بندہ کہتی ہے ۔ تم گھر والی بنتی ہو ۔ (چیخ کر) میں گھر والی نہیں ، تو کیا وہ بنے گی ۔

بفاطن ۔ ایسا کہتی ہے ؟ بُرا کرتی ہے ۔ اپنا پوت پالا پوسا ۔ اب بڑا ہو کر نوکر چاکر ہوا تو ان کا ہو گیا ۔

بہو ۔ (دور سے) اے مالک ۔ جس نے ایسا کہا ہو اسی کا منہ سڑ جائے ۔ موئی کمبخت اندھی ہو جائے ۔ اس کے بدن سے کوڑھ ٹپکے ۔

شنخانی (فتحیاب ہو کر) ادھر جا کر دال لے لو ۔ بھات بھی لے لو ۔

(بفاطن پیالہ بجاتی ۔ سڑ سڑ کرتی جاتی ہے)

شخانی ۔ معنی خیز کنھکھارتی ہے۔ کچھ اپنی فتحیابی پر۔ اور کچھ زلفن کو اشارہ دینے کے لئے کہ دال چاول کم کم دے۔ دور سے برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ ہلکی ہلکی۔ یوسف کی ماں کی ہچکیوں کی آواز۔ اور بیچ بیچ میں یوسف کی پاٹ معنی برتن پاٹ معنی برتن کی صدا۔ ایک منٹ کے بعد بفاطن سڑ سڑ کرتی آتی ہے)

بفاطن ۔ لو دیکھ لو۔ اتنا لئے جاتی ہوں

شخانی ۔ لے جاؤ۔ اس میں دکھانا کیا۔

(بفاطن سڑ سڑ کرتی جاتی ہے)

شخانی (ذرا کڑک کر۔ آواز میں فتحیابی کا اثر موجود ہے) دیکھ زلفن ہاتھ روک کر چیز نکالا کر۔ اتنی ایک دال جو دیدی تو اپنے گھر میں کمی نہ پڑے گی۔ کھانا چلنا دوبھر ہو جائے گا۔

زلفن ۔ میں نے پہلے ذرا سی نکالی تھی۔ اس نے کہا تھوڑی اور دو۔

شخانی ۔ وہ کہے گھر اٹھا کر دیدے تو دیدے گی۔ ارے میں نہ دیکھوں تو یہ گھر اڑ جائے۔ کہتے ہیں تم کو گھر بنانا نہیں آتا۔ گھر بنانا نہیں آتا۔ اور اس موئی زلفن کی مت تو اڑ گئی۔ اچھا اور دیکھ یہ کنڈالی اٹھا کر کوٹھری میں دھر دے جو دیکھے گا یہی کہے گا کہیں سے اٹھا لائے ہیں۔ یا کسی مرے گڑے کا مال ہے کل جب نذرو آئے تو نکالنا۔ تب لوگوں سے یہی کہیں گے کہ نذرو کو اس کے صاحب نے دی ہے۔

شیخ جی ۔ مجھے کھانا بھی دو گی۔ لالٹین میرے منہ کے پاس سے ہٹاؤ۔

شخانی ۔ ٹھہرو ——— چولھے پاس چل کر کھا لو ———

دوسرا ایکٹ   سین پہلا

رتن لال (غصے سے بھرا ہوا) سنتی ہو اپنے پوت کے کرتوت۔ ایسے بدچلن لڑکے کو میں گھر

میں نہیں دیکھ سکتا۔

مِنا ۔ (ذرا دھیمی آواز سے) کیا ہوا ؟

رتن لال ۔ ہوتا کیا ؟ اس بدمعاش نے وہی کیا جو تم نے سکھایا ۔ اگر یہ لڑکا گھر لوٹ کر ہم دونوں کو ٹکڑوں کا محتاج نہ کردے تب کہنا ۔ میں تو مردود کو اسی بار پولیس میں دیدیتا جب ہیرالال کی گھڑی چرالایا تھا ـــــ کون گن ہیں جو اس میں نہیں ۔ اس سن میں موتی بائی کے......

مِنا (ذرا اونچی آواز سے) ارے میں سنوں تو ۔ ہوا کیا ؟

رتن ۔ ہوتا کیا ۔ پاٹ جس کے لئے میں نے نوکروں کو مفت میں مارا پیٹا یہی چرائے گیا تھا اور لے جاکر ایک کباڑی کے یہاں دس روپیہ کو بیچا (پکار کر) اجمنی دوڑ جا بیٹھکے میں ایک پاٹ رکھا ہے اٹھالا ـــــ ایسے ہی لڑکے باپ کی کمائی منٹوں میں اڑا دیتے ہیں۔

مِنا ۔ وہ کباڑی تمھارے پاس آیا تھا ؟

رتن ۔ اس کو کیا معلوم کہ وہ لڑکا میرا تھا یا کسی ڈاکٹر کا ۔ جس دلال سے ہم نے کہا تھا کہ ہمارے پاٹ کا جوڑ ڈھونڈھ لاؤ وہ یہ پاٹ لے کر آیا ہے ۔ اور کہتا ہے کہ ایک ہفتہ ہوا کباڑی نے اس کو ایک ۱۷۔ ۱۸ سال کے لڑکے سے خریدا تھا ۔

مِنا (ذرا تیکھی ہو کر) اور اس لڑکے کا نام سکھولال تھا ۔ کیوں نا ؟

رتن (جھنجھلا کر) پہلے پوری بات سنو ۔ میں نے کہا کہ پاٹ کہیں چوری کا نہو ۔ اس پر وہ کہنے لگا کہ میں نے سب پوچھ گچھ لیا ہے ۔ جو لڑکا بیچنے آیا تھا اس کی حیثیت تو ایسی نہیں معلوم ہوتی آگے بھگوان جانے ۔ بائیسکل پر بیٹھ کر آیا تھا ۔ سلک کا سوٹ پہنے تھا ۔ سونے کی عینک سونے کی گھڑی لگائے تھا ۔ کان میں سونے کا پھول ۔

مِنا ۔ تم سمجھتے ہو کہ دنیا میں اس چہرے مہرے کا اور کوئی نہیں ۔

رتن ۔ تمھاری مت نہ جانے کہاں چلی گئی ـــــ پاٹ تو دیکھو ـــــ (دوڑنے کی ہلکی سی

آواز آتی ہے۔ قریب آکر رک جاتی ہے) لو پاٹ آگیا ــــ وہی ہے یا نہیں۔

منا ۔ میں کیا جانوں۔ ایک جیسے ہزاروں ہوں گے۔ بنانے والا ایک بنا کر مر تھوڑے گیا ہوگا۔

رتن ۔ ۵ سال سے گھر میں ہے اور پہچان نہیں سکتی؟ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو۔

منا ۔ دیکھ رہی ہوں (سنجیدگی سے) یہ میرا پاٹ نہیں ہے۔

رتن ۔ تمھارا نہیں ہے تو پھر کس کا ہے۔ ابھی سکھو نے نہیں کسی اور نے چرایا ہوتا تو تمھارا ہو جاتا۔

منا (ان سنا کرکے) اس جگہ ایک گدا پڑا ہوا ہے۔ یہ ایک پتی جھڑ گئی ہے۔ یہ دیکھو کسی نے چاقو سے کھرچا ہے۔ اور میں کہتی ہوں کہ یہ کچھ چھوٹا بھی ہے۔

رتن ۔ ماں کی آنکھوں سے یہی تو دکھائی دے گا۔

منا ۔ اچھا اب تم ذرا باپ کی آنکھوں سے دیکھو۔ تمھارے پاٹ میں کہیں یہ سرخ کلیاں تھیں پتیوں پر اس طرح کے ریشے بنے تھے۔ اور یہ دیکھو ایسا پھول اس جگہ پر تھا۔ اور تو اور۔ یہ مونگھڑ کی بیل دیکھو۔ اس پاٹ کی مونگھڑ پر کہیں بیل تھی؟ یہ پاٹ وہ ہے ہی نہیں۔ کہنے کو جو چاہے وہ کہہ دو۔

(خاموشی ۱۵ سکنڈ)

کچھ تو فرق معلوم ہوتا ہے؟"

رتن (ذرا مطمئن ہو کر کہ اپنے لڑکے کے سر سے الزام ٹل گیا) میں نے کبھی اتنے غور سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ اور دیکھا بھی ہو تو یاد نہیں پھول کیسے تھے۔ اور ان پھولوں پر سرخ نقطے تھے یا ہرے' وہ نقطے گول تھے کہ چوکور ہمیں اتنی فرصت کہاں کہ ان باتوں میں وقت خرچ کریں ــــ بلکہ مجھ سے تو اگر پوچھو تو یہ بھی نہیں بتا سکتا ہوں کہ جن پیالیوں میں چا پیتا ہوں ان پر کس ڈزائن کے پھول بنے ہیں۔ یا میرے ٹیبل کلاتھ پر کیا ڈزائن بنا ہے۔

منا (سخت طعن سے) ہاں اگر جانتے ہو تو اتنا جانتے ہو کہ سکھو ہی پاٹ چرا کر لے گیا ہے۔

رتن ۔ (جھنجھلا کر) ابھی کباڑی کو بلا کر سکھو کا سامنا کراؤں۔

منا (بگڑ کر) میں کہتی ہوں تم اپنے لڑکے کی عزت آبرو کے پیچھے کیوں پڑے ہو۔ میں بتاؤں کیا کرو وہ کون داروغہ جی ہیں جو تمھارے دوست بھی ہیں۔ اور قرضدار بھی۔ بلا کر ان سے کہو کہ سکھو کو ایک دس سال کے لئے جیل بھجوا دیں۔ تمھارے کہنے کو ٹالیں گے ہرگز نہیں۔ بس۔ پھر تو تمھارا کلیجہ ٹھنڈھا ہو جائے گا۔ چین سے ٹانگیں پھیلا کر سونا۔ میں بھی دکھیا رو رو کر مر جاؤں گی۔ پھر تمھاری چیز دِلا کو۔ تمھارے روپیہ پیسے کو تباہ کرنے والا۔ میٹنے والا کوئی نہیں رہے گا۔ (ذرا ٹھٹک کر) آپ ہی میاں دربار۔ آپ ہی میاں کھیت کھلیان۔

رتن ۔ نہ الٹی مانو نہ سیدھی۔ اگر یہ پاٹ تمھارا نہیں ہے تو پھر کباڑی کو بلا کر سامنا کرانے میں کیا ہرج ہے۔

منا ۔ ہا بیچارا سکھو۔ اب غریب کا یہ حال ہو گیا کہ جب تک ایرے غیر نتھو خیرے آکر گواہی نہ دیں جرم ہٹ ہی نہیں سکتا۔ اس موئے کباڑی کا کیا بگڑتا ہے۔ بلکہ وہ تو اور خوش ہو گا کہ بڑے اشرافوں کے کرتوت کھل رہے ہیں۔ بھٹ سے کہہ دے گا یہی ہیں صاحب! میں نے تو ان کی 'تصویر' لی تھی کہو کھو گئی ورنہ ابھی دکھا دیتا۔ تب دھری رہ جائے گی وکیل صاحب کی ساری وکلاہٹ۔

رتن (جھنجھلا کر۔ ہارے ہوئے لہجے میں) تم جانتی ہو کہ بک بک سننے کی میری عادت نہیں۔ جو میں کہتا ہوں اس کا سیدھی طرح جواب دو۔ ایک جواب۔ یہ پاٹ تمھارا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو کباڑی کو بلا کر سامنا کرانے میں کیا ہرج۔

منا (بگڑ کر) سو باتوں کی ایک بات کیوں نہیں کہتے۔ سکھو کو کسی نہ کسی بہانے سے جیل بھجوانا ہے تم کو تو اس سے ایک آڑسی ہے۔ چار آم دئے تھے پانچ کیوں کھا گیا۔ چار روپیہ مہینہ دیتا ہوں پانچ کیوں خرچ کئے۔ اور تو اور بائسکل میں پنچر کیوں ہوا۔ موئے پتلون میں کھونچا کیسے لگا۔ اس کے بیٹھکے میں چار دوست آگئے چار پی لی۔ پان کھائے۔ (نقل کر کے) " مجھے یہ لچھن اچھے نہیں لگتے " جو جی چاہے اس کے ساتھ کرو۔ تم جانو وہ جانے تم باپ وہ پوت۔ اس کو کچھ ہو جائے گا میں کر ہی کیا سکتی ہوں۔ رو پیٹ کر بیٹھ رہوں گی۔ پچھلے جنم میں بھگوان جانے کون پاپ کئے تھے جو بھوگ رہی ہوں۔

رتن (اکتا کر) ان کی کھوپڑی میں کوئی بات گھستی ہی نہیں۔ میں باپ ہو کر سکھو کا برا چاہوں گا۔

کچھ تو سوچو - اندھی نہ بنو - کسی بری ڈگر لگ گیا تو تم ہی سر پکڑ کر رؤ گی - سو مرتبہ بتا چکا ہوں کہ مجھ ہم آم ۵ آم کا کچھ نہیں - مگر ہر بات ڈھنگ سے ہونا چاہئے - جو چیز خرچ ہو، ایک حساب سے خرچ ہو - سکھو کو تو کسی بات کا ڈھنگ نہیں - اس کو کیسے کیسے سوٹ بنوا دیئے - مگر کبھی کھونچا لگا چلا آرہا ہے کبھی روشنائی گر گئی ہے - تو کبھی کودنے پھاندنے میں مسک گیا ہے - تم جانتی ہو کہ سوٹ میں روپیہ لگا ہے - کچھ دنوں تو چلے - اس کو پہن کر اچکنے کودنے کی کیا پڑی ہے -

منا ہاں - اچھے سوٹ والوں کو جب کودنا ہوتا ہے تو ننگے ہو جاتے ہیں -

رتن لال - "اے بھگوان ! عورتیں بڑی گدھی ہوتی ہیں - اسی لئے تو نے ان کو سمجھ نہیں دی"

منا - کہاں جاتے ہو ؟ سکھو کو حوالات میں بند کرانے -

رتن -(دور پر) اپنا سر چھوڑنے - (وقفہ ۵ اسکنڈ)

منا (بڑبڑاتی ہے) آگ لگے بیاج کو - اس گھر سے پریم اڑ گیا - اب جو کچھ ہے روپیہ ہے - اگر سکھو کہیں چلد یا تو دیکھیں بڑھوتی ہیں ان کی کون دیکھ بھال کرتا ہے ـــــــ کیا ہے رجمنی (کنجی پھینک کر) لے جتنا جی چاہے گھی نکال لے مجھ سے "اسوخت" نہ بول -

راجمنی - بات یہ ہے کہ (کنکھار کر) دوپہر کو جھٹی پاکر میں گھر گئی تو بٹیا نے کہا کہ پانی نہیں ہے میں بہت بکی جھکی کہ تجھ کو یہ دھیان نہیں رہنا کہ تھکی مری چلی آرہی ہوگی، پانی سب اٹھا ڈالا - مگر کرنی کیا گگرا لاد کر نل پر گئی - وہاں سے کچھ دور - اتنی دور جیسے یہاں سے وہ دیوال 'شیخ جی کا لونڈا پاٹ، پاٹ بکتا پھرتا تھا - میں نے اپنے جی میں کہا پاٹ تو ہمارے گھر میں تھا جو چوری ہو گیا یہ کیا بکتا پھرتا ہے - میں نے پاس بلا کر چمکار کر پوچھا کیا بکتا ہے - وہ چلا کر اور بہت کچھ بکنے لگا - کچھ گیت سا تھا 'پی آؤ جی' - اور کیا پاٹ معنی برتن - اتنے میں بہھاطن گھڑا لئے آئی - اس دکھیا کے پاس گگرا کہاں ہے - گھڑے میں پانی بھرتی ہے - اور مجھ سے چپکے سے کہنے لگی کہ یہ جو شیخ جی ہیں ان کو کہیں سے ایک برتن مل گیا ہے جس کو یہ لوگ پاٹ کہتے ہیں - اور کہنے لگی کہ بات یہ ہے کہ آج سکھانی کے یہاں مال لینے گئی تو میں دینے گئی - انھوں نے میری صورت جو دیکھی تو فوراً پاٹ پر کپڑا ڈھانک دیا - مگر میں نے دیکھ لیا

کہ کیا ہے۔ کالا کالا چمکدار گول گول برتن تھا۔ اس میں کنڈھا بھی لگا ہوا تھا۔ میں نے سکھانی سے پوچھا کیا ہے۔ سکھانی چلی مجھے اُلّو بنانے۔ کہنے لگی۔ ایسپھ کے لئے چڑیا پکڑ کر بند کی ہے۔ میں ان کے چلتروں میں آنے والی کب۔ میں سمجھ گئی کہ کچھ دال میں کالا ہے۔ پھر مجھ سے کہنے لگی تجھے گنگا قسم کسی سے کہنا نہیں۔ (اپنے آپ سے) اے مجھے کیا گرج پڑی ہے جو ہر ایک سے کہتی پھروں۔

منا ۔ بلا تو وکیل صاحب کو وہ ذہین سمجھتی تھی کہ نہ تو یہ میرا پاٹ ہے۔ اور نہ وہ کمبخت لڑکا جو بیچنے گیا میرا اسکھو ہے۔ بلانا وکیل صاحب کو۔ یہ مرد بڑے مورکھ ہوتے ہیں جو سنتے ہیں اس پر بھروسا کر لیتے ہیں۔ کچھ سوچیں، کچھ سمجھیں۔ آن ہند ——— ذرا با ندان ادھر بڑھا۔ اور سن وکیل صاحب کو بھیج کر۔ ذرا چلی جانا، اور بفاطن کو بھی بلاتی لانا۔

راج منی ——— آ

منا نہیں نہیں تو گھبرا نہیں۔ میں اپنے ڈھنگ سے پوچھوں گی۔

ایکٹ دوسرا سین دوسرا

۔ اداب عرض ہے وکیل صاحب

۔ آئیے داروغہ صاحب۔ تشریف رکھئے آپ کے تو درشن ہی نہیں ہوتے۔

۔ مجھے آپ کا پرچہ ملا تھا۔ اور ایک ہفتہ سے اسی سوچ بچار میں تھا کہ کسی سے کچھ روپے کا بندوبست ہو جائے تو آپ کے پاس آؤں۔ خالی ہاتھ کیا آؤں۔ بات یہ ہے وکیل صاحب، آپ جانتے ہیں کہ ہم لوگوں کی آمدنی کا ..... کچھ ایسی ہے کہ ہو گئی تو ہزاروں اور نہ ہوئی تو پھر مہینوں کا کال ہے۔

۔ ال، زمانہ بہت ہو گیا تھا اس لئے آپ کو یاد دلا دیا۔ صاحب میں بیوپار میں ہر چیز صاف رکھتا ہوں۔ اسی بات پر واقف، سے جھگڑا ہوا کرتا ہے۔ ورنہ آپ تو اپنے ہیں ——— آج ایک اور بات تھی جس سے آپ کو تکلیف دی۔ بات یہ ہے کہ میرے پاس ایک اتنا بڑا پاٹ تھا جستے کا یا کلٹ کا بنا ہوا تھا۔ اس پر چاندی کی بڑی بڑی پھول پتیاں تھیں ان پر دودھ کی ایسی سفید مینا کاری تھی۔ ان پر دودھ کی ایسی سفید مینا کاری تھی۔ اسی کمرے میں رکھا رہتا تھا۔ شاید آپ نے بھی خیال کیا ہو۔ ادھر رہتا تھا۔ اچھا لگتا تھا۔ ایک ہی تھا اس میں پودا، اودا کیا لگاتا۔ تو ادھر رکھا رہتا تھا۔ میری وائف نے اس پر

داروغہ جی۔ اچھا ——— ہوں

رتن لال۔ آج میں نے ایک خبر سنی۔ یہاں پڑوس میں ایک جلاہا رہتا ہے۔ شیخ جی شیخ جی اس کو کہتے ہیں۔ اس کے یہاں اسی طرح کا ایک پاٹ ہے۔

داروغہ جی۔ شیخ جی کس حیثیت کے آدمی ہیں۔

رتن لال۔ حیثیت کیا؟ کپڑا بننا چھوڑ چکا ہے۔ اس کا ایک بیٹا ہے وہ کسی دفتر میں ۱۵ روپیہ کا نوکر ہے۔ اسی سے کام چلتا ہے۔ اس کے بیوی بچے ہیں۔ شیخ جی کے بیوی بچے ہیں۔

داروغہ جی۔ ان میں سے کوئی بدچلن تو نہیں ہے۔ یا کسی کو کوئی لت تو نہیں ہے۔

رتن لال۔ ان باتوں کی تو آپ لوگوں کو خبر ہونا چاہئیے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ نہ کوئی بدچلن ہے۔ نہ کسی کو کوئی لت ہے۔ مگر ان کے خرچ پر شک ہو سکتا ہے۔ شیخ جی کا لڑکا باہر رہتا ہے۔ اپنے ساتھ اپنے لڑکے کو رکھتا ہے جو اسکول میں پڑھتا ہے بتائیے، اتنا خرچ ۱۵ میں کیسے ہو سکتا ہے۔

داروغہ ۔ کچھ اوپر کی آمدنی بھی ہوگی۔ اچھا کسی طرح یہ پتہ چل سکتا ہے کہ شیخ جی کو ادھر روپیہ کی ضرورت تو نہیں تھی

رتن ۔ (اچھلکر) تھی تو ضرور۔ شخانی میری بیوی کے پاس آئی تھی کہ مجھے پچاس روپیہ دلا دو مکان بنانا ہے میں نے انکار کر دیا۔ ایسے کم حیثیت لوگوں کو روپیہ دینا۔ روپیہ اٹکانا ہے۔ جب آمدنی نہ ہو تو کہاں سے ادا کریں گے۔

داروغہ ۔ اچھا۔ وہ برتن آپ نے کتنے کا خریدا تھا۔

رتن ۔ کتنے کا خریدا تھا۔ یہ تو نہ پوچھئے۔ ایک دن ایک صاحب، جن کو میں پہلے سے جانتا تھا گھبرائے ہوئے آئے کہ صاحب دس روپیوں کی سخت ضرورت ہے۔ یہ برتن رکھ لیجئے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں سو دو سو سے کم کا معاملہ نہیں کرتا، کسی بنئے کے پاس جائیے۔ وہ پریشان بہت تھے آنسو بھر لائے، اور کہنے لگے کہ میں آپ کے سوا کسی کو نہیں جانتا۔ مجھے ترس آگیا، اور برتن بھی کچھ پسند آگیا۔ میں نے دس روپیہ صندوقچہ سے نکالکر دیدئے۔ اس دن سے آج تک ان کی صورت نہیں دکھائی دی۔

داروغہ جی - تو آپ کو گویا دس روپیہ کا پڑا۔

رتن - یہ تو نہ کہئے۔ ہم تو روپیہ کے تاجر ہیں۔ اگر وہ دس روپیہ نقد ہوتے، اور چلتے رہتے تو آج ۵ برس میں کم از کم ۳۰ تو ہو گئے تھے۔ اب اندازہ کر لیجئے کہ برتن کتنے کا پڑا۔

داروغہ - "وہ برتن ۲۰ - ۲۵ کی مالیت ہو سکتا ہے"۔ رتن "اس میں کیا شک"۔

داروغہ - شیخ جی۔ یا شخانی کی آپ کے یہاں آمد و رفت رہتی ہے؟

رتن - اکثر آتے جاتے رہتے ہیں۔ ابھی پچھلی بار جب روپیہ مانگنے آئی ہے تو یہ کمرہ اندر سے کھلا ہوا تھا۔ اور میں کچہری گیا تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ جاتے وقت چپکے سے اندر گھس گئی ہو اور برتن لے کر کپڑوں میں چھپا چلدی ہو۔

داروغہ - آپ تو کہتے ہیں کہ برتن کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا، اور چرانے کے بعد کسی نے اسی جگہ، اینٹ رکھدی۔ اس سے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس میں کسی گھر والے کا ہاتھ ضرور ہے۔ اچھا آپ کو پتہ کیسے چلا کہ شیخ جی کے یہاں برتن ہے۔

رتن - اس محلے میں ایک عورت بفاطن رہتی ہے۔ جو ادھر ادھر پکانے کی نوکری کرتی رہتی ہے شخانی نے اس سے کل دال مانگ بھیجی۔ جب وہ دینے گئی، اور ان لوگوں نے اس کو آتے دیکھا تو کپڑے سے برتن ڈھک دیا۔ مگر وہ کچھ کھلا رہ گیا۔ اس پر بفاطن کی نگاہ پڑ گئی اس نے پوچھا یہ کیا ہے؟ تو شخانی نے اڑن گھائیاں بتائیں۔ بفاطن نے میری مہری سے کہا۔ بفاطن، اس وقت گھر ہی میں ہے کہئے تو بلاؤں ــــــــــ (گھنٹی بجاتا ہے) ــــــــــ (کوست سے) گھر میں کہدیا تھا کہ اگر بفاطن آئے تو اس کو روک لینا۔ دیکھو اگر وہ ہو تو اسے یہاں بلا لاؤ۔

داروغہ - شیخ جی کی ایسی حیثیت نہیں کہ ان کے گھر یاٹ ہو، اور پھر شخانی نے بفاطن کو دیکھ کر اس کو ڈھک دیا یہ تو بتاتا ہے کہ ....

رتن - وہ تو میں نے آپ سے کہا تھا کہ یہ لوگ بہت چھوٹی حیثیت کے ہیں۔ پیٹ پالنے کے لئے سب کچھ کر سکتے ہیں۔ آپ ہی بتائیے اتنا بڑا خاندان ۱۵ روپیہ میں کیسے گذر کرتا ہو گا۔

داروغہ جی ۔ مکان ان کا ذاتی ہے

رتن ۔ بھگوان جانے ۔ مکان میں دھرا ہی کیا ہے ۔ ایک چھپر' ایک کوٹھریا ۔ چار دیواری بھی ایک طرف سے گر گئی ہے ۔ وہ تو جب روپیہ کا معاملہ ہونے والا تھا میں نے ان باتوں کی دیکھ بھال کی تھی۔

——— داروغہ جی' اس محلے میں دو ایک بھلے مانسوں کے علاوہ سب ٹکڑ گدے بستے ہیں ۔ جو آٹھ آنے پیسوں کے لئے جان لے لیں ۔ مجھے تو یہی ڈر لگا رہتا ہے کہ کسی دن یہ لوگ آ کر مجھے نہ لوٹ لیں ۔ وہ تو کہئے آپ لوگوں سے بڑی دوستی ہے اس لئے ذرا دبے رہتے ہیں۔

داروغہ جی ۔ آپ سول لائن میں' کوئی مکان کیوں نہیں لے لیتے ؟

رتن ۔ کئی دفعہ یہی ارادہ ہوا ۔ روپیہ کا تو کچھ خیال نہیں ۔ بس یہی ہے کہ رہتے سہتے اس مکان سے ہم لوگوں کو ایک لگاؤ سا ہو گیا ہے ۔

داروغہ ۔ اجی اس کی تو نہ کہئے ۔ جہاں رہنے لگے وہیں سے لگاؤ ہو جاتا ہے ۔ اس حصے میں تو سو برائیاں ہیں ۔ گنجان آبادی ۔ خراب راستے' ہر طرف گندہ غلیظ ۔ اگر بیماری پھیلے تو اسی طرف سے پھیلے ۔ دوسری بات یہ ہے چور' اچکے' خونی سب ایسے ٹکڑ گدوں میں تو پیدا ہوتے ہیں ۔ یہ بارہ برس پولیس میں رہ کر میں نے سیکھا ہے ۔

رتن ۔ بات تو ٹھیک ہے ۔ مگر آپ سے کیا چوری ۔ یہاں رہ کر پھر بھی ان لوگوں سے تھوڑا بہت پیسہ واپس مل جاتا ہے ۔ اگر یہاں سے ٹل جاؤں تو سب مٹی میں مل جائے ۔

(جوتیوں کے سڑ سڑ کی آواز آتی ہے)

بفاطن ۔ (اطمینان سے زبان امینٹھ کر) سلام وکیل (گھبرا کر سیدھی طرح سے' اور ذرا آہستہ سے) صاحب ۔ سلام داروغہ جی سلام ۔

داروغہ ۔ ادھر آؤ ۔ دیکھو جو کچھ کہنا سچ کہنا' اسی میں تمھاری بھلائی ہے ۔

بفاطن ۔ اے لو' میں کبھی جھوٹ بولتی ہوں جو بولوں گی ؟

داروغہ ۔ یاٹ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا ۔

بفاطن ۔نہیں صاحب ۔ پاٹ کہتے تو میں نے ایسپھ کو سنا ۔ ہاں گول گول کالے رنگ کا ایک برتن ضرور آنکھوں سے دیکھا تھا۔

داروغہ ۔ ہاں یہی مطلب

داروغہ ۔ برتن تم سے کتنی دور تھا ؟

بفاطن ۔بس جتنی ہمارے آپ کے بیچ میں دوری ہے ۔

داروغہ ۔کیا وقت ہوگا ؟

بفاطن ۔میں کوئی گھڑی دیکھ کر تھوڑے چلتی ہوں۔ مجھے کیا معلوم کیا وخت ہوگا ۔ شام ہوئے دیر ہوچکی تھی ۔ آٹھ کا "ٹیم" ہوگا

داروغہ ۔ وہ لوگ کہاں بیٹھے تھے ۔

بفاطن ۔چھپر کے نیچے

داروغہ ۔جب تم وہاں گئیں تو وہ لوگ کیا کر رہے تھے ۔

بفاطن ۔میں گئی تو چھپر کی طرف اندھیرا سا معلوم ہوا ۔ تب میں سیدھی چولھے کی طرف چلی ۔ میں نے کہا اے سکھانی کہاں ہیا ۔ تب سکھانی نے میری آواز سن لی ' اور بولی ادھر آؤ ۔ میں جو گئی تو جھٹ انھوں نے برتن پر کپڑا ڈھانک دیا ۔

داروغہ ۔جب وہاں اندھیرا تھا تو تم نے برتن کیسے دیکھ لیا ؟

بفاطن ۔اس کے پاس تو لال ٹین دھری تھی ۔

داروغہ ۔پھر وہاں اندھیرا کیسے تھا ۔

بفاطن ۔(اکتاکر) ایک تو لالٹین موئی ' چندھی چڑی ' تھی ۔ پھر دونوں ' بڑھیا بڑھوے ' بیچ میں برتن کے پاس ' لالٹین ' ٹھونسے ' بیٹھے تھے ' اندھیرا نہوتا ۔

داروغہ ۔ برتن کا رنگ کیسا تھا ۔

بفاطن ۔برتن تو ڈھکا ہوا تھا ۔ ذرا سا جو دکھائی دیتا تھا وہ تھا سفید سفید ۔ اور کنڈھا کھلا ہوا تھا

وہ تھا کالا کالا۔

داروغہ ۔ برتن پر کچھ پھول پتیاں بنی تھیں ؟

بفاطن ۔کنڈھے پر کچھ سفید سفید چمکتا ہوا تھا تو ضرور۔ کچھ پھول سا۔ چمکتا تھا جیسے تارا ۔ اور ہوں 'شایت' کچھ پتیاں بھی ہوں۔

داروغہ ۔ تم وہاں کس کام کو گئیں تھیں ۔

بفاطن ۔ میں نے کل دن کے 'وخت' چنے کی روٹی پکائی تھی میر حقو نے وہ نیل مچایا کہ میں دال بھات کھاؤں گا۔ دال بھات کھاؤں گا ۔ لاکھ جتن کئے وہ 'آگ لگا' نہ مانا تب میں نے کہا لاؤ کھانی کے یہاں سے تھوڑا سا دال بھات مانگ لاؤں ۔

داروغہ ۔ "تم نے مہری سے تو کہا تھا کہ شخانی نے دال مانگی تھی ۔ اور تم دینے گئیں تھیں"

بفاطن ۔(اپنے کو گرفت میں پاکر) کہا ہوگا ۔ (ذرا تیزی سے) اے میں نے کب کہا ۔ مہری آکر کہدے میرے سامنے ۔ میں فوراً جھٹلا دوں گی ——— کہدوں گی اس کے منہ پر کہ تو جھوٹی ہے۔ (حسرت سے) ان کا بیٹا ۱۵ روپیہ کا نوکر ہے ۔ دونوں 'وخت' گھر میں چولھا جلتا ہے ۔ وہ بھلا مجھ دکھیا سے دال مانگیں گی ۔

داروغہ ۔ اب خوب سوچ کر بتاؤ کہ برتن پر پھول بنے تھے ؟

بفاطن (کچھ سوچ کر) 'شایت' ہوں گے ۔ بڑا سا کوئی پھول ۔ سفید سفید ۔ کیا جانے کپڑا تو اوڑھا ہوا تھا ۔ بہتیرا کا حال معلوم نہیں پڑتا تھا ۔

داروغہ جی ۔ یہ تو تم کو معلوم ہے کہ وکیل صاحب کا پاٹ چوری گیا ہے ۔ اور تمھارے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہی پاٹ شیخ جی کے گھر میں ہے ۔

بفاطن ۔نہیں ——— ہاں وکیلنی مجھ سے کہہ رہی تھیں ۔ میں نے کہا کہو تو قسم کھا جاؤں جو میں کچھ بھی جانتی ہوں کہ کون موا اٹھالے گیا ۔

داروغہ ۔ اِدھر اُدھر کام نہیں بنے گا ۔ تم پھنس جاؤگی ۔۔ مدعا نہ جو میں کہوں وہ کرو۔

بفاطن میں پھنس جاؤنگی؟ ایسا اندھیر انہیں' اے میں دیکھنے بھر کی گنہگار ہوں۔ ورنہ مجھ بچاری کو اپنے وکھڑی سے کہاں چھٹی جو دوسروں کو جراچرا کر برتن دیتی پھروں ــــــ اور چراتی تو آپ رکھ لیتی۔ داروغہ جی میں انھیں صاحب کے گھر کام کر چکی ہوں ــــــ ہاں ــــــ ابھی جو کچھ ہوا تو ڈپٹیائی کے پاس چلی جاؤں گی۔

داروغہ جی (ذرا ڈپٹ کر) چپ رہ۔ بک بک مت کر۔ ابھی حوالات میں بند کر کے سڑا ڈالوں گا۔ ساری بکواس نکل جائے گی۔ جب تونے ایسی چیز شیخ جی کے یہاں دیکھی تھی تو تھانہ میں آکر رپٹ کیوں نہیں لکھائی۔ ڈپٹی صاحب ہوں کہ لاٹ صاحب قانون کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔

بفاطن (گھبرا کر، چلا کر) ائے مالک میں کیسے 'اجاب' میں پڑ گئی۔ کیوں اس گھڑی وہاں دال لینے گئی تھی۔ مرے یہ کمبخت منا۔ غارت ہوا ــــــ اے لوگوں کیسا اندھیر ہے۔

داروغہ ۔سن جو ہم کہیں وہ کر تو صاف چھوٹ جائے گی۔ ابھی جا کہ شیخ جی کے یہاں دیکھ کہ وہ برتن کس قسم کا ہے اس پر پھول پتیاں بنی ہیں یا نہیں۔ اور اگر نہیں ہیں تو کس وضع کی ہیں۔ کس رنگ کی ہیں۔

بفاطن ۔سکھانی بڑی چلتی ہوئی ہیں۔ جب انھوں نے اس دن مجھے دیکھتے ہی کپڑا ڈال دیا تو اب کیا دیکھنے دیں گی۔

داروغہ ہم یہ نہیں جانتے۔ کسی نہ کسی طرح دیکھ کر آ ــــــ خبردار ان کو نہ معلوم ہونے پائے کہ تو میری بھیجی ہوئی ہے۔ ورنہ کالے پانی بھجواؤں گا۔ کالے پانی۔ یاد رکھنا۔ اچھا جا ــــ ادھر جا کر بیٹھ جب ہم بلائیں تب آنا۔

(سڑ سڑ کرتی بڑبڑاتی ہوئی جاتی ہے)

داروغہ ۔وکیل صاحب! شبہ کی تو گنجائش ہے۔ اگر کوئی خاص بات نہ ہوتی تو شخانی برتن کپڑے سے کیوں ڈھانک دیتیں۔ مگر اس پگلی سے مخبری کا کام نہیں چل سکتا۔ سیدھی سی تو یہ ترکیب ہے کہ آپ رپٹ لکھا دیجئے کہ ایسا ایسا برتن میرے یہاں سے غائب ہو گیا ہے، اور شیخ جی پر شبہ کیا جا سکتا ہے میں ابھی تلاشی کرا تا ہوں۔

(خاموشی ۵ اسکنڈ)

رتن (ٹہلتا ہے۔ آواز دھیمی، اور پھر تیز ہوتی رہتی ہے) کچھ ایسی باتیں ہیں کہ رپٹ لکھانا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ میرا پڑوسی غریب ہو یا امیر میں سب کو بھائی سمجھتا ہوں۔ ان کی عزت اپنی عزت سمجھتا ہوں۔ جب تک یقین نہو جائے کہ وہ پاٹ میرا ہی ہے۔ میں اس طرح ان لوگوں کے گھر کی تلاشی کرا کے، ان کو دوسروں کی نظروں میں گرانا نہیں چاہتا۔ اور دوسری بات یہ ہے (ذرا سنبھل سنبھلکر لہجہ بناتا ہے کہ اصل بات یہی ہے) ایک کباڑی نے ایک برتن اسی قسم کا خریدا ہے۔ میں نے تو پہچان لیا کہ وہ میرا نہیں ہے۔ مگر میری بیوی ——— آپ تو جانتے ہیں کہ عورتیں ہر چیز کو سرسری دیکھا کرتی ہیں ——— میری بیوی کو شک ہوتا ہے کہ وہ پاٹ میرا ہی ہے۔ تو روپیہ میں ایک آنہ ایسا ہو سکتا ہے کہ وہی کباڑی والا پاٹ میرا ہو جائے۔ اس لئے اس طرف سے بےفکر نہونا چاہئے اور وہ کباڑی کہتا ہے کہ ——— وہ کباڑی جو ہے ——— وہ میرے باپ کے وقت سے آتا جاتا رہتا ہے وہ ذرا پھنس جائے گا۔

داروغہ ۔ رپٹ لکھانے کے یہ معنی تھوڑے ہیں کہ ہمارے آپ کے بس کی بات نہیں رہے گی۔

وکیل صاحب ۔ نہیں نہیں رپٹ جانے ہی دیجئے۔ آپ اپنی ہی طرف سے کچھ کارروائی کر لیجئے۔ نہیں تو جانے دیجئے پاٹ کو۔ ایک وجہ ذرا اور ہے ——— آپ تو جانتے ہیں کہ سکھ لال ۱۷-۱۸ برس کا ہے۔ مگر ہے ابھی بچہ ہی۔ اور آپ بھی کہتے ہیں کہ کسی گھر کے آدمی کا ہاتھ ہو سکتا ہے اور وہ ہے بھی ذرا شریر ——— یعنی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ یوں ہی پتہ چلانے کی کوشش کیجئے۔ شیخ جی کو ڈرائیے دھمکائیے۔ اگر بلا رپٹ لکھائے تلاشی ہو سکے تو تلاشی بھی کرا لیجئے۔

داروغہ اچھی بات ہے۔ کوشش کروں گا۔ ذرا بفاطن کو ادھر بھیجدیجئے۔ دیکھئے اگر اس پگلی سی سکھا پڑھا کر کام نہ نکالا تو کچھ نہیں کیا۔

ایکٹ دوسرا سین تیسرا

زلفن ۔ اماں دیکھو پیجامہ کتنا سفید ہوگیا ۔ پاٹ سے ملاکر دیکھوں ؟

شخانی ۔ چل گدھی ۔ وہ ولایت کا بنا ہوا ہے ۔ تیرا پیجامہ گھر کا دھلا ۔ اس کی کیا برابری کریگا۔

——— ارے یامین آگیا ۔ نذرو کہاں رہ گیا۔

یامین ۔ (۱۴ برس کا سن) ابا مزدور کے سر پہ سامان لارہے ہیں ۔ ہم آگے آگے بھاگ آئے

سلام ۔ سلام ۔ سلام ۔ سلام

شیخ جی جیتے رہو

شخانی جیتے رہو

یامین کی ماں خوش رہو

زلفن اچھے رہو

یوسف ۔ پی ۔ او ۔ ٹی پاٹ پاٹ یعنی برتن ۔ پی ۔ او ٹی پاٹ پاٹ یعنی برتن

یامین ۔ ہا ہا ہا ۔ انھوں نے انگریزی شروع کی ہے۔

زلفن ۔ انگریزی کیا شروع کی ہے ۔ واوا ایک پاٹ لائے ہیں ۔ کل عید ہے ۔ جاجم بچھی گی اس پہ پاٹ دھرا جائے گا ۔ اس میں سوئیاں ہوں گی ۔ پیالوں میں نکال نکال کر دی جائے گی سب چمچوں سے کھائیں گے۔

یامین ۔ کیسا پاٹ

زلفن ۔ اتنی بڑی کنڈالی ہے ۔ معلوم ہوتا ہے جیسے چار کی پیالی

یوسف کی ماں (بے حد خوش ہوکر) ایسف کہہ رہا تھا کہ اماں کیا بڑے لوگ بڑی پیالیوں میں چار پیتے ہیں (سب قہقہہ لگاتے ہیں) (یوسف کو آواز سے پیار کرتی ہے) یہ بڑا سیانا ہوگا خوب کمائی کئے جائے گا۔

یوسف ۔پی۔او۔ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن۔ پی۔ او ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن۔

شیخ جی (دور سے) پاٹ لاکر تو دکھاؤ ۔ایک جگہ ذرا ٹھیس لگ گئی ہے۔ ورنہ روپوں کا مال ہے (چرچر جوتوں کی آواز آتی ہے۔ کوئی آکر کھٹ سے صندوق رکھتا ہے۔ پھر باہر جاتا ہے اور بستر لاکر بھو سے ڈالتا ہے)

نذرو ۔ بے یامین جاکر پیسے دے آ ۔ آداب ۔ آداب

شخانی ۔ جیو

شیخ جی ۔ جیو

زلفن ۔ سلام

نذرو ۔ یوسف تجھے سلام کرنا نہیں آتا ۔

یوسف ۔ (چپکے چپکے) پی ۔ او ۔ ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن

نذرو ۔ اچھا ۔ انگریزی یاد کی ہے ۔ یہ تو بڑا شوکین نکلا ۔ واہ وا

شیخ جی ۔ ابھی ٹھہرو ۔ ایک چیز تو دیکھو ۔ جلفن کہاں ہے ؟ پاٹ لا ———— ہم ایک پاٹ نخاس سے خرید کر لائے ہیں ۔ کیا عمدہ چیز ہے ! ۔ پانی اس میں رکھو ۔ کپڑا اس میں رنگو ۔ ابھی عید کے دن ۔ اس میں سوئیاں نکال کر رکھی جائیں گی ۔ یہ گنوار پنا ہے کہ پتیلی سے نکال نکال کر دے رہے ہیں ۔ ہم نے شیخ مدارو کے گھر دیکھا ۔ بڑی سی لگن میں سوئیاں تھیں ۔ اور بھاوج بیٹھی سب کو نکال نکال کر دے رہی تھیں ۔ آدمی کی حیثیت بنائے سے بنتی ہے ۔ تب چار آدمی عزت بھی کرتے ہیں ۔

نذرو ۔ (تعجب سے) یہی پاٹ ہے !

شیخ
زلفن } ساتھ ہی { ہوں / جی

نذرو ۔ یہ ! ۔ معلوم ہے کہ صاحب لوگ اسے کس کام میں لاتے ہیں ؟

شیخ ۔ کس کام میں ؟

ندرو ۔ یہ کونڈے کے کام میں آتا ہے

شیخ جی ۔ (جلدی) اسی لئے تو میں لایا ہوں

ندرو ۔ گول گونڈا ؟ جو بڑے لوگوں کی چوکی کے نیچے رکھا جاتا ہے (وقفہ ۵ سکنڈ)

شیخ جی ۔ پا ——— یخا ———

ندرو ۔ ہاں (کھینچ کر)

(وقفہ ۲۰ سکنڈ)

شیخانی ۔ (ذرا آہستہ سے ۔ لہجہ ایسا ہے گویا اپنے اوپر طعن کر رہی ہے) بناؤ اب حیثیت ۔ ایک رہی سہی لگوڑی ذات تھی وہ بھی گئی ۔

زلفن ۔ اب کیا ہوگا ؟

شیخ جی ۔ ہوگا کیا ۔ بھلا کہیں ممکن ہے کہ ایسی عمدہ نفیس چیز ایسے برے کام میں آتی ہو (بگڑ کر) یہ لونڈے جہاں کسی قابل ہوئے چلے اپنے بڑوں کو "وہ" بنانے ۔ میں دنیا دیکھ چکا ہوں ۔

ندرو ۔ ابا تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو ۔ میں اور اتنی چھوٹی سی بات نہ جانوں ۔ صاحب لوگوں کے ساتھ رہتا ہوں ۔ سب طور طریق دیکھے ہوئے ہوں ۔ دو ایک بار خانساماں جی سے کہہ کر خود باٹ پر گیا بھی ہوں ۔

شیخ جی (کھسیانہ غصہ) بس چپ رہ ۔ چلا بڑا 'لقاطوں' بننے ۔ صاحب بہت سمجھ دار ہوتا ہے ۔ (زور سے گویا قائل کرنے والی دلیل مل گئی) وہ یہ کبھی نہیں کر سکتا کہ روپوں کی چیز خریدے اور اس میں پھینک دے ۔ (سمجھا کر) یہ اور بات ہے کہ جو ذرا ٹوٹا پھوٹا ہوتا ہوگا ۔ اسی کام آجاتا ہوگا ۔ چلے ہیں ہم کو بنانے ۔

یامین ۔ نہیں دادا ۔ ہم نے بھی اسکول میں دیکھا ہے ۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کے لئے جو چوکی ہے اس کے نیچے رکھا رہتا ہے ۔

شیخ جی - چپ کمبخت تیری بھی اب یہ توفیق (بہت بھرپور تلفظ) ہو کہ مجھے وہ کہے - ماروں گا ایک لپڑ منہ ادھر سے ادھر ہو جائے گا۔

شخانی - میں بھی کہتی ہوں کہ ایسی اچھی چیز اس طرح کون ناس کرے گا۔

نذرو - اماں تم تو جانتی نہیں ہو۔ صاحب لوگ صفائی کو بہت پسند کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ گندے پن سے بیماری پھیلتی ہے۔ اگر تم کبھی وہ جگہ دیکھ لو جہاں یہ بات اور سب سامان لگا ہوتا ہے تو تم کہو گی کہ یہ بہشت ہے کہ کوئی چیز ہے کیا ہے۔ قرآن قسم ہم جب کبھی خانساماں سے کہہ سن کر وہاں گئے تو بس آنے کا جی نہیں چاہتا تھا روز صابن سے تو وہ جگہ ' ووش ' کی جاتی ہے۔

شخانی - یہی سے وہ لوگ ایسے موٹے تازے ہوتے ہیں۔ بدن سے خون ٹپکا پڑتا ہے۔

نذرو - وہاں دن بھر صفائی ہوتی رہتی ہے۔ صاحب میم کے ایک جوڑے کے لئے چار چار بیرا ہوتا ہے وہ بھی صاف رہتا ہے۔ یہی سب باتیں ہیں جس کی وجہ سے وہ بادشاہت کرتے ہیں۔

یاملین (ذرا جوش سے) ابا ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب بھی تو اسی طرح رہتے ہیں۔ ایک اور ماسٹر صاحب ہیں ان کے پاس بھی بیرے ہیں۔

شیخ جی - پھر یہ بولا۔ اس کو تو نذرو نے پاس رکھ کر اور چوپٹ کر دیا۔ چلا ہے تیرا ہیڈ ماسٹر کا بچہ بننے

نذرو - ابا تم تو جب سے سٹھیا گئے۔ کچھ خیال نہ ' دیال ' کہ کیا کہہ رہے ہو۔ کیا نہیں۔

شخانی - سٹھیا نہ جائے تو یہ موا کونڈا اٹھا لاتے ——— توبہ ——— چچی ——— وہ تو کہو اس میں کچھ کھایا پیا نہیں (ٹھنک کر) حیثیت بنائیں گے۔ حیثیت بنائیں گے۔۔۔ اگر یہی خدا کو ' منظور ' ہوتا تو صاحب لوگ نہ بناؤ تھا۔ وہ تو کہہ خدا نے کیا لڑکا ۱۵ روپیہ سے لگ گیا نہیں تو اپنے بھائی کی طرح در در کی ٹھوکریں کھاتے گھومتے۔

شیخ جی (بڑا افروختہ ہو کر) میرے بھائی کو تو کہتی ہے۔ اور اپنے گھرانے کو نہیں ملاحظہ (ملاحظہ کرتیں جن کو ڈلیا ڈھونے کو نہیں ملتی۔ ابھی دس روز کی بات ہے کہ دو روپیہ مانگنے آئے تھے۔

شخانی (بات کاٹ کر تیزی سے) ان کو کیوں کہو رہے۔ وہ کیا حیثیت بناتے پھرتے ہیں بے گور کا

میلا سمیٹنے کا برتن نخاس سے اٹھا لاتے ہیں۔ مزدوری سینکڑوں کو نہیں ملتی۔ لاکھوں بچارے ہیں جوان سے بھی 'جیادہ محتاز' ہیں۔ ارے مرا تو وہ گھر ہے۔ جہاں روپیہ برسا ہے روپیہ۔ بچپن میں اس بندی نے پوّوں ملائی کھا ڈالی۔ یہ تو تمھارا گھر ہے کہ مہینوں دال روٹی کھائے بیت جاتے ہیں۔ وہ بھی میرا لڑکا جب سے سرکار میں نوکر ہوا۔ تب سے یہ بھی جڑنے لگا۔ ورنہ وہی تھا اس کا سودا لائے تو کچھ مل گیا اس کے سودے سے کچھ نکال لیا۔ اس کے دام کاٹے۔ اس کو ٹھگا۔ ارے ہاں یہی تو تھا جو اتنے دنوں کام چلا۔ آگ لگے اس گھر کو۔ ذرا عیش (ثقیل تلفظ) نہ جڑا

شیخ جی (طعن سے) وہ بھول گئیں جو کا مدانی کا دوپٹہ اوڑھا تھا۔ کھیریں کھایا کرتی تھیں۔

شخانی (آپے سے باہر ہوکر) لے مالک۔ ایک دفعہ کا مدانی کا دوپٹہ کیا اوڑھ لیا جنم بھر کو ٹھیکہ ہو گیا۔ ارے میں بھی 'جوان جہان' تھی۔ اتنی ارمان بھی نہ نکالتی (چٹک کر) ارے وہ تو کہو میری کوئی اور بندی ہوتی تو وہ تگنی کا ناچ نچاتی۔ دوپٹہ اوڑھا تھا۔ کھیریں کھایا کرتی تھی۔ دودھ میں چاول گھونٹ کر پکالئے کہ منہ میں چھالے ہیں کچھ نگل لوں' وہ کھیر ہو گئی ——

نذرو ۔ اے اماں خدا کے لئے چپ رہو۔ پڑوس کے لوگ کیا کہیں گے۔ ہائے اللہ میرا بھی کیا نصیب ہے گھر آیا تھا کہ ذرا خوشی میسر ہو۔ آتے ہی یہ طوفان مچ گیا۔

شیخ جی ۔(بے تکی اونچی آواز سے) بالکل جھوٹ۔ یہ تم دونوں ماں بیٹیوں کی کارستانی ہے یہ پاٹ' وہ کونڈا نہیں ہو سکتا۔ زلفن ادھر لا میرا پاٹ

یوسف ۔ پی۔ او ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن۔ پی۔ اُو

شیخ جی (حد سے زیادہ اونچی آواز سے) چپ

شخانی } ایک ساتھ { چپ ۔ چپ
یوسف کی ماں } ایک ساتھ { چپ ۔ چپ

یوسف رونے لگتا ہے

شخانی ۔ اچھی ہو بلی۔ ساس بیٹھی ہوتی ہے۔ اور خصم کے سامنے ٹر ٹر کرتی ہے —— تو

کیوں روتا ہے یوسف۔

شیخ جی (ڈانٹ کر) چپ چپ

نذرو ۔ چپ یوسف (یوسف کی ماں یوسف کو دھب دھب مارتی ہے) ہائیں ہائیں۔ ارے مارتی کیوں ہے، ارے مارتی کیوں ہے؟

(شخانی دوڑ کر جاتی ہے)

چھوڑ۔ مردار۔ چھوڑ۔ یہ بہو بھی ایسی ملی کہ ہمیشہ معصوم بچے پر چھا نچھ اتارتی ہے آگ لگے اس بات پر۔ جب آیا تو یہی تھکا فضیتی ہوئی۔ اور آج جو موئے کی وہ ——— کھلی تو یہی ——— ارے یہ تو ہم لوگوں کے نصیب میں لکھا ہے۔ حیثیت حیثیت جو یہ بگھار رہے تھے تو خدا کو برا لگا کہ ہم کو پیدا کیا کیچڑ میں اور یہ چاہیں ہیں کہ بیٹھیں جا جم پر

شیخ جی (ہاری مانتے ہوئے) اور وہ جو تم کہتی تھیں کہ لڑکی کی کہیں سے اچھی بات نہیں آتی جب تک اپنی حیثیت نہ ہو اچھی بات کیسے آئے گی۔ میں نے تو تمھارے بھلے کی سوچی تھی (ذرا زور پکڑ کر) اور اب بھی پیسہ ہو تو جا کر لمپ لے آؤں۔ (یوسف رونا بند کر دیتا ہے)

شخانی (اس جگہ پہنچتی ہے) اس کے نصیب میں ہو گا۔ چھپر پھاڑ کر اچھی بات آئے گی۔ ہونا ہی ہے۔ اگلے زمانے میں بادشاہوں نے غریبوں کے گھر شادیاں کیں تو کیسے کیں۔

نذرو ۔ اماں خدا کے لئے۔ اس جھک جھک بک بک کو ختم کرو۔ ہائے اللہ اس سے تو اچھا تھا کہ میں نہ آتا۔

یامین ۔ چلو ابا چلیں

شیخ جی ۔ پھر بولا۔ اس کا تو بولنا مجھے زہر لگتا ہے۔

نذرو ۔ (تراق سے تھپڑ دیتا ہے) ملعون!

شخانی ۔ اے لو۔ اور لو بیوی نے ایک کو مارا تھا۔ تو میاں اپنی لیاقت (نقیل) کیوں نہ بگھاریں

نذرو ۔ یا اللہ میرا تو جی ہے کہ نکل جاؤں۔ یا کچھ کھا کے سو رہوں۔ دفتر میں چپراسیوں کی خوشامد کرو

بابوؤں کی جھڑکیاں سہو۔ وہاں سے مرتے ہوتے آؤ اور کھانا پکاؤ۔ تب دوزخ پٹے۔ اوپر سے بڑی مصیبت بنیئے کا تقاضا۔ نہ موقع دیکھے نہ محل۔ سر پر کھڑا ہوا ہے منشی جی لاؤ روپیہ لاؤ۔ اوپر کی آمدنی جو دو ایک روپیہ ہو جاتی تھی وہ الگ بند۔ کیا زندگی ہے۔ اس سے تو بہتر تھا کہ مزدور ہوتا شام کو ڈلیا ڈھو کر آتا۔ اور مزے سے ٹانگیں پسار کر پڑ رہتا۔

شخانی۔ تو یہ آج کھلا اوپر کی آمدنی بھی تھی۔ جو سینت سینت کر اپنی چھبیلی کو لا کر دیتے ہوگے۔

نذرو۔ بچتا کیا ہے جو اس کمبخت کو دوں۔ دو دو آدمیوں کا کھانا۔ ارے ہاں اب یامین بھی برابر کا کھانے والا ہو گیا ہے۔ ایک روپیہ مہینہ کمرے کا دینا ہوتا ہے۔ یامین کی آدھی فیس پر کتابیں خریدنا ہوتی ہیں۔ اے اماں ذرا سمجھو تو اگر کچھ بچتا تو بنیئے کا قرضہ کیوں رکھتا جس نے زندگی اجیرن کر دی ہے

شخانی (بڑبڑاتی ہے) باپ بیٹے دونوں کی ایک بناوٹ ہے

شیخ جی (ذرا شیر ہو کر) ہاں ہم دونوں کی تو ایک بناوٹ ہے۔ سب 'منحوسیت' تو تمھاری ہے تمھاری منحوسیت سے اچھا خاصا 'پاٹ' کونڈا نکل گیا۔

نذرو۔ لے ابا ہاتھ جوڑوں۔ پیر پڑوں' اب اس کمبخت کا ذکر جانے دو۔ یہ بھی سمجھ لو کہ اگر برادری میں بات نکل گئی تو بیٹھے بٹھائے حقہ پانی بند ہو جائے گا۔ خوشامد درآمد کر کے اگر پنچوں نے 'جرمانے' ہی پر بات ختم کر دی تو بھی اتنا بھی تو نہیں ہے کہ دس روپیہ کہیں سے لا کر دوں۔ اگر ہوتے تو گھر کی مرمت نہ ہو جاتی ——— یامین صندوق تو اٹھا لانا۔ ابا ——— دیکھو تم لوگوں کے لئے چپّیاں لایا ہوں۔

(صندوق کھلنے کی آواز آتی ہے۔ چپّیوں کی کھڑ کھڑ سنائی دیتی ہے۔ خاموشی ایک منٹ)

نذرو۔ اب دیکھ لو کون کس کے پاؤں میں ٹھیک آتی ہے۔

شیخ جی (ایک چپّی پہن کر کھٹ کھٹ چلتے ہیں) بالکل ٹھیک' بالکل ٹھیک۔ معلوم ہوتا ہے ہمارے ہی پاؤں کے لئے لیں تھیں۔ (کھٹ کھٹ)

زلفن۔ یہ میرے پاؤں میں ٹھیک ہوگی۔

شخانی - ابھی نہیں - پہلے ان چاروں کو لے جا کر اپنی بھابی کو دکھا - ان کو کون پسند ہے -

(زلفن کھٹ کھٹ کرتی جاتی ہے)

شخانی (اونچی آواز سے) ارے ابھی ان کو جھوٹی نہ کر - پہلے بہو کو دکھالے -

شیخ جی (بدستور ٹہلتے ہوئے) بڑا آرام ملتا ہے - ہمارے جوتوں سے اچھی ہیں - اب یہی پہن کر بزار جایا کروں گا (وقفہ ۵ اسکنڈ) یوسف ایک چٹی پہننے کو دے رہا ہے اور بہت خوشی میں گا رہا ہے

پی - او - ٹی - پاٹ - پاٹ معنی "برتن")

شخانی - یہ ہمارے "لائخ" ہے -

زلفن (کھٹ کھٹ کرتی آتی ہے) بھابی کو یہ رنگ برنگی پٹی والی اچھی لگتی ہے -

(چپکے سے) اماں یہ تو ہم لیتے

شخانی - نخ -

(سٹر سٹر کی آواز آتی ہے - اور بفاطن آتی ہے)

بفاطن - اے سلام - سلام - سلام - سلام - اے میاں کب آئے ——— اچھے رہے ——— توبہ (گھبرا کر) میں کہتی کہ یہی بات ہے جس کے لئے ایسا ادھم جوت رکھا ہے -

بذرو (چوکنا ہو کر) کیسا ادھم؟

شیخ - ادھم کیسا باتیں کر رہے تھے - اپنے گھر میں بھی زور زور باتیں نہ کریں -

شخانی - ٹھہرو - بات تو سمجھنے دو - کیا بات ہے بھاطن - بیٹھ تو جاؤ -

بفاطن - اے کیا بتاؤں سکھانی - کہنے والی بات ہو تو کہوں - توبہ ——— میں تو کہتی ہوں کہ بات نہ بات - سوا ہاتھ ——— کیا بتاؤں یہ جو نہیں ہیں - وکیل صاحب - اے وکلائن کے میاں بیاج پر روپیہ چلتا ہے - پیسہ والے ہیں - انھوں نے آج درگہ جی کو بلایا اور کمرے میں بیٹھ کر ان سے خوب باتیں کیں -

شخانی - کیا باتیں کیں -

بفاطن ۔ وہ دروگہ جی مجھے بلاکر لگے ڈرانے دھمکانے ۔ میں نے کہا میں کیا جانوں کیسا پاٹ اور کون لے گیا ۔ میں نے نہ تمھارا پاٹ دیکھا، اور نہ سیکھ جی کا ۔

نذرو (گھبراکر) کیا مطلب ؟

بفاطن ۔ لے وہی ان کے یہاں کوئی پاٹ تھا ۔ وہ کوئی اٹھالے گیا ۔ کاہے کا ر ـــــ لوہے کا کہ جستے کا کالا کالا بنا ہوا ۔ کہتے ہیں اس پر چاندی کے پھول پتیاں تھیں ۔ اس پر چونے کا ایسا سفید رنگ پھرا تھا ۔ کہاں یہ پاٹ، اور کہاں وہ

شخانی ۔ ہائے کمبخت لکھا ۔ تو اب اس پاٹ کے کارن ہم پر چوری لگے گی ۔

بفاطن ۔ وہ تو میں پہلے ہی سمجھی تھی ۔ دروگہ جی نے ایسا ڈرایا دھمکایا کہ نچاؤں گی تو یہ (چٹکلے سے) کروں گا ۔ وہ کروں گا ۔

شخانی (تلملاکر) تو تم کچہری کرنے آئی ہو ؟ کچہری ؟ مروتم ۔ اور تمھارے وکیل اور وکلائن اور دروگہ جی ۔ حرامزادی ۔ ہم کو چور بنائے گی ۔ اب ہم ایسے گئے گذرے ہوئے کہ تیرے میرے گھر کے میلا اٹھانے کے کونڈے چراتے پھریں گے ۔ ارے وہ تو اگر ہیرے ٹکے ہوں تو بھی ایسی گھنونی چیز میں ہاتھ نہ لگاؤں ۔ بڑی بنی ہیں وکیلن اور وکیل ۔ ان کی عزت آبرو ہے ہماری عزت آبرو ہی نہیں ۔ ہم لوگ بھنگی ٹھہرے ۔ اے لوگوں پیسہ پاکر لوگوں کا کیسا سر پھر جاتا ہے ۔ بہاج کھانے والے ۔ قصائی کہیں کے ۔ آگ لگے ان کے گھر میں ۔ ستیاناس ہو جائیں وہ ـــــــ اور تو حرامزادی ـــ نکل ابھی گھر سے ۔ ابھی نکل ۔ اور لے جا یہ 'میلے کا کونڈا' ان دونوں کے سر پر پٹک دینا (دھڑسے پاٹ پھینک دیتی ہے) چل مردار ۔ ابھی لے جا کر ان 'کیڑے پڑوں' کو دکھا ۔ نہیں تو ابھی مار کر دفن کر دوں گی ـــــ اٹھاتی ہے ؟

(بفاطن جلدی جلدی سڑ سڑ کرتی جاتی ہے)

شخانی (بڑبڑاتی ہے) کیا آگ لگا کونڈا آیا تھا ـــــــ چھ آنے کا نقصان ہوا ۔

نذرو ۔ پہلے تو میں سمجھا کہ بچوں کو ۔ ــ

شیخ جی (بات کاٹ کر) چار آنے کا۔ (چھچکے سے) روزے میں پیدل مرتے ہوئے کیسے جاتے ——— وہ کون ساعت تھی جو میں نے اس پاٹ کو دیکھا تھا۔

یوسف (چھچکے چھچکے) پی - او - ٹی - پاٹ پاٹ معنی ——————

ڈراپ

غزل

شاعرِ فطرت ہوں میں جب فکر فرماتا ہوں میں
روح بن کر ذرے ذرے میں سما جاتا ہوں میں

آ کہ تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

جس قدر افسانۂ ہستی کو دہراتا ہوں میں
اور بھی بیگانۂ ہستی ہوا جاتا ہوں میں

تاکجا ضبطِ محبت تاکجا دردِ فراق
رحم کر مجھ پر کہ تیرا راز کہلاتا ہوں میں

میری ہمت دیکھنا میری طبیعت دیکھنا
جو سلجھ جاتی ہے گتھی پھر سے الجھاتا ہوں میں

یادِ ایامے کہ ہر ہر سانس تھا لبریزِ عشق
اب تو نامِ آرزو بھی سن کے تھراتا ہوں میں

میں نہیں رہتا ہوں میں جب پاس آتا ہے وہ شوخ
دل نہیں رہتا ہے دل جب سامنے جاتا ہوں میں

یا کسی کے قہر پر بھی مسکرا دیتا تھا دل
یا نگاہِ لطف سے بھی آہ شرماتا ہوں میں

میری ہستی شوقِ پیہم میری فطرت اضطراب
کوئی منزل ہو مگر گذرا چلا جاتا ہوں میں

تیری محفل تیرے جلوے پھر تقاضا کیا ضرور
لے اٹھا جاتا ہوں ظالم لے چلا جاتا ہوں میں

ہائے ری مجبوریاں ترکِ محبت کے لئے
مجھ کو سمجھاتے ہیں وہ اور ان کو سمجھاتا ہوں میں

تیرے اِک آنکھوں کا ساغر تیرے اِک رُخ کی بہار
یہ میسر ہوں تو ہر جنت کو ٹھکراتا ہوں میں

دل مجسم شعر و نغمہ وہ سراپا رنگ و بو
کیا فضائیں ہیں کہ جن میں حل ہوا جاتا ہوں میں

ایک دل ہے اور طوفانِ حوادث اے جگر
ایک شیشہ ہے کہ ہر پتھر سے ٹکراتا ہوں میں

ترکِ مے کو مدتیں گذریں مگر اب تک جگر
دیکھ کر جامِ تہی کچھ اشک بھر لاتا ہوں میں

احسن الکلام

کروں کیا مجھ سے تیرا سنگِ در چھوڑا نہیں جاتا
اٹھاتا ہوں قدم لیکن دلِ شیدا نہیں جاتا

خوشی کیا آج کی ہو جب غمِ فردا نہیں جاتا
جئیں کیا بے خلش، جب موت کا کھٹکا نہیں جاتا

مریضِ عشق رہتا ہے جہانِ کس مپرسی میں
جسے پوچھا نہیں جاتا جسے دیکھا نہیں جاتا

یہ محویت ہے دل کی یا تری محفل کی دلچسپی
یہاں ہم بیٹھ جاتے ہیں تو پھر اُٹھا نہیں جاتا

خطا پر جو نہ ہو نادم، عطا کا مستحق کیا ہو
جسے لینا نہیں آتا اُسے بخشا نہیں جاتا

ترے جلوے کو ہم اے جلوہ گر سمجھیں نہ کیوں پردہ
دکھایا جا رہا ہے وہ مگر دیکھا نہیں جاتا

وہاں لب پر کبھی آتا نہیں ذکرِ دلِ محزوں
یہاں دل سے خیالِ حسنِ بے پروا نہیں جاتا

ملو جب تک نہ تم کیونکر مریضِ ہجر ہو اچھا
دوا جس کی نہیں ہوتی مرض اُس کا نہیں جاتا

شکستِ عہد پر ہر وقت وہ آمادہ رہتے ہیں
مگر ٹوٹے ہوئے دل کو کبھی جوڑا نہیں جاتا

جب آیا اُن کا پیکاں لے گیا تاب و تواں دل کی
یہ مہماں میزباں کے پاس سے تنہا نہیں جاتا

سمجھ لیتی جو عقل اُس کو تو یوں عاجز نہ ہو جاتی
کہ وہ سمجھا رہی ہے اور سمجھایا نہیں جاتا

جنونِ عشقِ صادق جانِ عاشق بن کے رہتا ہے
قضا جب تک نہیں آتی ہے یہ سودا نہیں جاتا

وہ احسن جس کا عالم آشنا تھا عشق سے پہلے
اسے دیکھے تو اب کوئی کہ پہچانا نہیں جاتا

(احسن مارہروی)

کلام آزاد

اب نہ وہ ارباب الفت کا لحاظ
اب نہ وہ مہر و محبت کا لحاظ

اب نہ وہ باہم وگر ملت کی شرم
اب نہ وہ صاحب سلامت کا لحاظ

کچھ مرے حقہائے الفت پر نظر
کچھ مری دیرینہ خدمت کا لحاظ

اب نڈر قصد گنہ آساں نہیں
دل سے اور اس کی ہیبت کا لحاظ

اب نہ وہ دن رات شغل ناؤ نوش
اب نہ وہ اوقات فرصت کا لحاظ

اب نہ وہ شوق طرب کا احترام
اب نہ وہ ذوق طبیعت کا لحاظ

اب نہ وہ ارماں صحبت کا ادب
اب نہ وہ سودائے عشرت کا لحاظ

اب نہ ظاہر پر نہ باطن پر نظر
اب نہ صورت کا نہ سیرت کا لحاظ

اب نہ تنگی کا نہ وسعت کا خیال
اب نہ کثرت کا نہ قلت کا لحاظ

جائیے بس شیخ صاحب جائیے
ہو چکا حضرت سلامت کا لحاظ

تم کو اپنے حلقۂ بیعت کی شرم
ہم کو اپنے اہل صحبت کا لحاظ

حضرت آزاد آخر تا کجا
ایک یار بے مروت کا لحاظ

کچھ آثار رخ سے عیاں اور بھی ہیں
کچھ اسرار دل میں نہاں اور بھی ہیں

فقط وجہ قرب خدا ہی نہ سمجھو
مفادات عشق بتاں اور بھی ہیں

حرم میں پناہیں نہ پاسکنے والو!
مقامات امن و اماں اور بھی ہیں

ابھی ظرف قابل ہی جانچا گیا ہے
ابھی سیکڑوں امتحاں اور بھی ہیں

وہ اپنی وفا کو وفا ہی نہ سمجھیں — کہ ان کی وفا پر گماں اور بھی ہیں
زباں گرم اظہارِ الفت ہے لیکن — نظر سے ارادے عیاں اور بھی ہیں
سن اے یار اندازہ دانِ وفا سن — وفا کے کچھ اندازہ داں اور بھی ہیں
بتوں ہی سے ان بن کا خطرہ نہیں ہے — سجودِ خدا میں زیاں اور بھی ہیں
جو اہلِ حرم درپئے دشمنی ہیں — تو پروا نہیں آستاں اور بھی ہیں
کبھی مے کبھی دُردِ مے کے علاوہ — مراعاتِ پیرِ مغاں اور بھی ہیں
نڈر قتلِ عالم روا رکھنے والو — تدابیرِ فتحِ جہاں اور بھی ہیں

غلامانہ خو اتفاقی ہے ورنہ
روایاتِ ہندوستاں اور بھی ہیں

شکوۂ غم بجا نہیں نہ سہی — حکم چون و چرا نہیں نہ سہی
انتہائے جفا نہیں نہ سہی — رحم کھانا روا نہیں نہ سہی
سیکڑوں خوبیوں کے مالک ہو — ایک صاحب وفا نہیں نہ سہی
آپ نے دردِ سن لیا ہوتا — درد کی کچھ دوا نہیں نہ سہی
دل ازل سے ترا شناسا ہے — آنکھ شکل آشنا نہیں نہ سہی
میں بھی سرکار ہی کا بندہ ہوں — لائقِ اعتنا نہیں نہ سہی
تو ہو اور تیری زلف ہائے رسا — میری قسمت رسا نہیں نہ سہی
الفت معنوی بھی کیا کم ہے — پرسش برملا نہیں نہ سہی
باطنی قرب اصل عزت ہے — ظاہری واسطا نہیں نہ سہی
دولت دردِ دل تو حاصل ہے — دولت دوسرا نہیں نہ سہی
آپ کا تو پتہ لگا ہی لیا — اب جو میرا پتہ نہیں نہ سہی
شکرِ غم پر ملال کا کیا کام — قدرِ نعمت بجا نہیں نہ سہی

تم کہ دردِ جہاں کے درماں ہو — میرے دکھ کی دوا نہیں نہ سہی
آپ حکم سزا سنا بھی دیں — قصد عفو خطا نہیں نہ سہی
صبر کی تاب تو عطا فرما — جبر کی انتہا نہیں نہ سہی
میں تو اظہار درد کرتا ہوں — کوئی درد آشنا نہیں نہ سہی
ترک حاجت بھی ممکنات سے ہے — کوئی حاجت روا نہیں نہ سہی

رند ہوں اور رندِ پاک نہاد
متقی پارسا نہیں نہ سہی

صحافت کے ذریعے سے

ہندوستانی ذہنیت میں زبردست انقلاب پیدا کرنے کی اردو زبان میں پہلی کوشش

کلیم دہلی

زیرادارت شاعرِ انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی

ہر صاحب عقل ہندوستانی کو جو اس دور کے رجحانات سے واقف ہے اس امر کا شدید احساس ہے کہ ہندوستان کو اس وقت ذہنی انقلاب کی فوری ضرورت ہے۔ اگر آپ کو اس مقصد عظیم سے ہمدردی ہے تو کلیم کی خریداری منظور فرما کر ملک کے ارباب فکر کا ہاتھ بٹائیے۔ اور سنجیدہ علمی اور ادبی مضامین کے دوش بدوش "کلیم" میں وہ سب کچھ بھی ہوگا جسے رومان اور رنگینی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں شاعر انقلاب کا تازہ بتازہ کلام بھی ہر ماہ بالالتزام شائع ہوتا ہے۔ عمدہ تصاویر سے مزین، کتابت و طباعت دیدہ زیب، رنگین سرورق

سالانہ چندہ چھ روپے   ششماہی تین روپے آٹھ آنے

نمونے کے پرچے کے لئے ۹ کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں

منیجر کلیم، اکبر منزل، اجمل روڈ قرولباغ، دہلی

ندیم بک بائنڈنگ اسٹورز

کچہری روڈ۔ گیا

صوبہ بہار میں جلدسازی کا کوئی ایسا کارخانہ نہیں ہے جہاں اعلیٰ معیار پر فینسی، بہترین ڈیزائن، پائیدار اور مستحکم جلد بندی کا کام ہوتا ہو۔ مصنفین، معززین شہر، وکلا اور اہل علم حضرات اس کی سخت کمی محسوس کر رہے تھے۔ نیز ندیم آفس میں جس کثرت سے قابل قدر و قیمتی کتابیں، رسالے اخبارات آتے رہتے ہیں ان سب کا لحاظ کرتے ہوئے اعلیٰ معیار پر جلدسازی کا ایک کارخانہ میں نے اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ء میں کھولا ہے جس کا نام "ندیم بک بائنڈنگ اسٹورز" رکھا گیا ہے۔ اس کارخانہ کی امتیازی شان یہ ہے کہ یہاں جلدسازی کا کام نہایت ہی پسندیدہ و حسب دلخواہ، اعلیٰ پیمانہ پر ہوتا ہے وقت کی پابندی کا خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ اپنی انھیں خوبیوں کی وجہ سے صرف چند ہی ماہ کے عرصہ میں اس قدر مقبول و مشہور ہوا کہ بار لائبریری، کلبس، معززین شہر اور وکلا کے کثرت سے کام ملنے لگے۔ ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ اس دوکان سے زیادہ پائیدار اور ساتھ ہی ارزاں جلدسازی کا کام دوسری جگہ نہیں ہو سکتا۔ ایک مرتبہ تشریف لاکر ضرور آزمائیے۔

جلدسازی کے کام کے علاوہ رجسٹر، نوٹ بک، فائل، فلیٹ فائل، پیڈ، رائٹنگ پیڈ کاپی، بہی وغیرہ بھی تیار کئے جاتے ہیں۔

"طنزیات مانپوری" کی جلدسازی بھی اسی کارخانہ میں ہو رہی ہے۔ یہ مجلد مجموعہ عنقریب ہی ناظرین ندیم کی خدمت میں پہنچے گا۔

پروپرائیٹر

محمد یعقوب پریمی

منیجر ندیم گیا

خانۂ کعبہ کے موجودہ محافظ کی سرگذشت

یعنی

سوانح حیات سلطان ابن سعود

جس میں پہلی سعودی حکومت کے محیر العقول کارنامے۔ عرب میں ترکی اور مصری حکومتوں کے اُلجھے ہوئے حالات خاندان ابن رشید کی المناک سرگذشت۔ تحریک وہابیت کی تبلیغ و اشاعت۔ وہابیوں کا جزر و مد تحریک اخوان کی بنا و تاسیس۔ سلطان ابن سعود کے عہد بعہد کے حالات و کوائف اور درخشندہ فتوحات فتح حجاز کے مفصل واقعات۔ دستور ملکی کا قیام و نفاذ۔ انتظامات ملکی کی اصلاحات علوم و فنون کی ترویج و تشویق۔ امنیت و مدنیت کے لئے گرانقدر مساعی۔ نجدی معیشت و معاشرت مغربی حکومتوں سے تعلقات اور متعدد معاہدات وغیرہ وغیرہ پوری شرح و بسط سے درج ہیں۔

کتاب مستند معلومات کا بے نظیر ذخیرہ ہے۔ طباعت دیدہ زیب۔ کاغذ نہایت اعلیٰ۔ ضخامت ۲۰×۲۶/۸ ۲۷۶ صفحے۔ قیمت صرف دو روپے

ملنے کا پتہ

مینیجر سلسلہ "مشاہیر اسلام" نمبر ۱۵ جالندھر شہر (پنجاب)

مکتبہ جامعہ کی نئی کتابیں

المدنیۃ والاسلام یہ کتاب علامہ مصر محمد فرید وجدی کی مشہور تصنیف ہے۔ از مولوی رشید احمد صاحب انصاری مرحوم، اب مکتبہ جامعہ نے اس کے تمام نسخے مجلد کرا کے نہایت نفیس گرد پوشش (DUST COVER) کے باوجود قیمت صرف دو روپے ۲/ کر دی ہے۔ المدنیۃ والاسلام میں ثابت کیا گیا ہے کہ اسلامی تمدن اور اصول و قوانین انسانی ترقی کے لئے ایک مفید چیز ہیں۔ قیمت دو روپے ۲/

میری کہانی پنڈت جواہر لال نہرو کی آپ بیتی کا اردو ترجمہ ہے۔ انگریزی میں یہ کتاب شائع ہوتے ہی ساٹھ ہزار فروخت ہو گئی، اردو ترجمہ نہایت سلیس اور شگفتہ ہے۔ کتاب ایک ہزار صفحات سے زیادہ دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ قیمت مکمل مجلد چار روپے ۴/

شعلہ و شبنم حضرت جوش ملیح آبادی کی پر جوش اور بیباک ... اسلامی شان و حریت کے خون کھولا دینے والے واقعات، بادۂ سرجوش کی سرمستیوں اور جمالیات فطرت کے روح پرور نغموں سے لطف اندوز ہونے کا موقع دے گا۔ شاعر انقلاب کا یہ لافانی شاہکار غیر مطبوعہ کلام سے مرصع ہے۔ کتاب مجلد ہے۔ اور نہایت خوشنما گرد پوشش سے آراستہ ہے۔ قیمت صرف تین روپے ۳/

تاریخ فلسفۂ اسلام مشہور جرمن فلسفی ٹی، جے، دی بوئر کی مستند تصنیف کا اردو ترجمہ از جناب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے، پی ایچ، ڈی۔ یہ کتاب اب کچھ ترمیم و اضافے اور نظر ثانی کے بعد چھوٹے سائز پر نہایت خوشنما جلد کے ساتھ شائع کی گئی ہے اس میں اسلامی فلسفے کی نشو و نما، یونانی عربی علوم، فلسفہ فطرت، یونانی و اسلامی حکما، مشرق میں فلسفے کا انحطاط وغیرہ پر کار آمد مباحث۔ قیمت دو روپے

پستالوزی از ڈاکٹر قاضی عبد الحمید صاحب بی اے (جامعہ)، ایم اے، پی ایچ، ڈی، برلن۔ پستالوزی نے تعلیم کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ اس کتاب میں پستالوزی کی زندگی اس کے فلسفۂ تمدن اس کے تعلیمی نظریے اور تعلیمی کارنامے اور ان کی تفصیل سلیس زبان اور دلکش انداز بیان میں ملاحظہ فرمائیے ؎

درس ادب اگر بود زمزمۂ محبتے ٭ جمعہ بہ مکتب آورد طفل گریز پائے را

قیمت مجلد عہ

مکتبہ جامعہ، قرولباغ، نئی دہلی

تاریخ الامت

ابتدائے رسالت سے آخر زمانۂ خلافت عثمانیہ تک تمام ضروری معلومات اور مسلمانوں کے کارناموں کا ذکر نہایت سلیس اور دلچسپ عبارت میں کیا گیا ہے۔

اسلامی تاریخ کا یہ سلسلہ مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری نے بڑی جانفشانی اور تحقیق سے مرتب فرمایا ہے ملک کی متعدد یونیورسٹیوں اور کالجوں میں داخل نصاب ہے۔ بالخصوص ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے طلبار کے لئے نہایت مفید ہے طباعت وکتابت نہایت عمدہ۔

حصہ اول	سیرة الرسولؐ	قیمت	عہ	مجلد	عہ
حصہ دوم	خلافت راشدہ	قیمت	عار	"	عاہ
حصہ سوم	خلافت بنی امیہ	قیمت	عہ	"	عہ
حصہ چہارم	خلافت عباسیہ	قیمت	عا	"	عاہ
حصہ پنجم	عباسیہ بغداد	قیمت	عار	"	عاہ
حصہ ششم	عباسیہ مصر	قیمت	عار	"	عاہ
حصہ ہفتم	خلافت عثمانیہ	قیمت	عہ	"	عہ

نوٹ۔ جو صاحب یہ مکمل سلسلہ بہ یک وقت طلب فرمائیں گے ان کو پورا سٹ مجلد پیش کیا جائے گا۔ اور قیمت غیر مجلد کی لی جائے گی۔ جلدیں نہایت اہتمام کے ساتھ اچھے مضبوط کپڑے کی تیار کرائی گئی ہیں جس پر کتاب اور مکتبہ جامعہ کا نام بلاک سے چھپوایا گیا ہے۔ جلد پر ایک خوشنما کاغذ کا کور ہے۔ اس کی طباعت بھی بلاکوں سے کی گئی ہے۔

حصص اول و دوم طلبار کی ضروریات کے خیال سے چھوٹے سائز پر بھی شائع کئے ہیں اور ان کی قیمت ہر ایک کی ایک ایک روپیہ ہے۔

جامعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

بسم اللہ

جامعہ

زیر ادارت۔ ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

جلد ۲۷	مارچ ۱۹۳۷ء	نمبر ۳

فہرست مضامین

۱	ابن الوقت	جناب علی عباس حسینی صاحب لکھنؤ	۱۷۱
۲	اقبال کا فلسفۂ حیات	جناب برکت علی صاحب فراق متعلم سندی جامعہ	۱۹۱
۳	امثال القرآن	جناب مولانا نجم الدین صاحب	۲۱۹
۴	پولینڈ	پروفیسر محمد مجیب صاحب استاد جامعہ	۲۵۱

قیمت سالانہ صـہ		فی پرچہ ۸؍

پروفیسر محمد مجیب۔ بی۔ اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے محبوب المطابع برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا

*

ہماری متعدد فہرستیں

مکتبہ جامعہ نے اپنے زبردست ذخیرے کی فہرستیں ایک خاص نوعیت سے علیحدہ علیحدہ شایع کی ہیں، جو حضرات جس خاص مضمون یا شعبے سے دلچسپی رکھتے ہوں ازراہ کرم مطلع فرمائیں مطبوعہ فہرست فوراً حاضر کی جائے گی۔ چند فہرستوں کے نام درج ذیل ہیں

(۱) **مطبوعات جامعہ**۔ جامعہ کی شایع کردہ اور سول ایجنسی کی کتابوں کی مکمل فہرست۔

(۲) **ناشرین اُردو**۔ جامعہ کے علاوہ اُردو کتابوں کے تمام ناشرین کی فہرستوں کا مجموعہ۔

(۳) **مصنفین اُردو**۔ مشہور مصنفین، مترجمین و مولفین اُردو کی کتابوں کی فہرست۔

(۴) **بچوں کی کتابیں**۔ بچوں کے لئے اُردو کی کتابوں کی فہرست۔

(۵) **عورتوں کی کتابیں**۔ عورتوں اور بچیوں کے لئے پسندیدہ کتابوں کی فہرست۔

(۶) **مختصر فہرست کتب**۔ کتب اُردو کی تقریباً ایک ہزار مشہور کتابوں کی فہرست۔

(۷) **ادبی کتابیں**۔ تاریخ و تنقید ادب، مقالات و انشاء، ناول، افسانہ، نظم، ڈرامہ، مکاتیب، ظرافت وغیرہ پر اُردو کتابوں کی مکمل فہرست۔

(۸) **مذہبی کتابیں**۔ ڈھائی سو منتخب مذہبی کتابوں کی فہرست۔

(۹) **تاریخی کتابیں**۔ پانچسو منتخب تاریخی کتابوں کی فہرست۔

(۱۰) اجتماعیات، سیاسیات، معاشیات، تعلیم، فلسفہ، منطق، نفسیات، اخلاقیات، طبیعات، کیمیا، طب، حفظان صحت، زراعت اور صنعت و حرفت پر اُردو کی تمام کتابوں کی مکمل فہرست زیر طبع ہے، عنقریب شایع ہوگی۔

مکتبہ جامعہ دہلی

امثال القرآن

گذشتہ سے پیوستہ

الم تر کیف ضرب اللہ مثلاً کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت وفرعھا فی السماء تؤتی اکلھا کل حین باذن ربھا ویضرب اللہ الامثال للناس لعلھم یتذکرون۔ (سورہ ابراہیم پارہ ۱۳)

تم نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کس طرح پاک کلمہ کی مثال بیان کرتا ہے؟ اس کی مثال اس پاک درخت کی سی ہے جس کی جڑ مضبوط و پائدار ہو اور اسکی شاخیں آسمان تک پھیلی ہوئی ہیں وہ اپنے رب کے حکم سے ہر وقت پھل دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسی طرح لوگوں کیلئے مثالیں بیان کرتا ہے کہ وہ عبرت و نصیحت حاصل کریں

آیہ مذکورہ بالا میں حق سبحانہ وتعالیٰ نے کلمہ طیبہ کو شجرہ طیبہ کے ساتھ تشبیہ دی جیسے شجرہ طیبہ سے ثمرات نافعہ پیدا ہوتے ہیں اسی طرح کلمہ طیبہ سے اعمال صالحہ کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ کلمہ طیبہ جب کسی انسان کے دل میں متمکن و جاگزیں ہو جاتا ہے تو اس کے اعمال صالحہ کو بھی بارگاہ الٰہی میں درجہ قبولیت و منظوری حاصل ہوتا ہے۔ اگر کلمہ طیبہ پر اعتقاد و یقین نہ ہو تو کسی عمل صالحہ کو بھی درجہ قبولیت حاصل نہیں ہو سکتا۔ ایمان ایک شجرہ کی مثل ہے۔ اخلاص اور للہیت نے اس کی جڑوں کو قلب مومن میں راسخ اور مضبوط کر دیا ہے۔ اس کی شاخیں توحید۔ رضا۔ تسلیم۔ صبر و شکر وغیرہ ثمرات آسمان تک پہنچ رہے ہیں۔ انسانی عقائد چونکہ یکساں درجے پر نہیں ہوتے جب قوت وضعف ایمان ومشاہدہ براہین و دلائل سے ان میں تفاوت ہونا ازبس ضروری ہے۔ اس تفاوت اعتقادی کے باعث اعمال بنی آدم بھی متفاوت ہوں گے۔ اسی تفاوت کے باعث بروز قیامت اور دنیا میں اہل ایمان متفاوت درجے پر نمودار ہوتے ہیں اور ہوں گے جیسے درخت کی تکمیل کے لئے جڑوں۔ تنے۔ شاخوں۔ پتوں۔ پھولوں اور پھلوں کی ضرورت ہے۔ ایسے ہی

ایمان کے لئے بھی ان سب چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایمان کی جڑ علم۔ معرفت اور یقین ہے اور اس کا تنا اخلاص وللّٰہیت اور اس کی شاخیں اور فروع اعمال صالحہ ہیں اور اس کے ثمرات وہ اخلاقِ حسنہ اور صفات حمیدہ ہیں جو علم اخلاق میں مفصل طور پر ذکر کئے گئے ہیں۔ جیسے شجرہ کے بقا کے لئے ایسے مادے کی ضرورت ہے جو اس کے تغذیہ اور تنمیہ میں ممد ہو۔ ایسے ہی شجرۂ ایمان کے لئے بھی علم نافع عمل صالح اور ذکر و فکر کی دائماً ضرورت ہوتی ہے۔

شجر ایمان کے شیریں ثمر | اگر درخت سے اس کے ممد حیات مادہ تنمیہ اور تغذیہ کو ہٹا دیا جائے تو وہ درخت کسی نہ کسی وقت خشک اور مردہ ہو جایا کرتا ہے۔ اگرچہ اس کی شکل بظاہر درختوں سی نظر آتی ہے مگر جن عوائد و فوائد کی اس سے توقع رکھی جاتی تھی وہ سب کے سب نیست و نابود ہو گئے۔ ایسا درخت سوا جلانے اور بھاڑ میں جھونکنے کے کسی کام میں نہیں لایا جا سکتا۔ شجرۂ اسلام سے اگر علم نافع کی تجدید اور عمل صالح کی تعمیل اور ذکر اور فکر کا مشغلہ ہٹا دیا جائے تو وہ شجرۂ ایمان بالکل اس مردہ درخت کی طرح بے سود ہو جائے گا۔ مسند امام احمد حنبلؒ میں حضرت ابوہریرہؓ سے ایک روایت مروی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول ہے ان الایمان یخلق فی القلب کما یخلق الثوب فجددوا ایمانکم۔ باغبان اور کھیتی والا اپنی کھیتی کی حفاظت اور نگہبانی نہ کرے تو وہ آفات ارضیہ وسماویہ سے تباہ و برباد ہو جائیں گی۔ مومن قانت کے لئے بھی ضروری ہے کہ ہمیشہ اپنے ایمان اور اسلام کے درخت کو آفات موذیہ اور مفسدہ سے بچاتا رہے۔ جب کوئی باغیچہ لگایا جاتا ہے، یا کھیتی نافع کو بویا جاتا ہے تو عادت اللہ کے مطابق بہت سے گھاس پات اور غیر مفید بوٹیاں اور درخت اس کے ارد گرد اس سے غذا بانٹنے کے لئے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر باغبان اور زمیندار کھیتی کی نگرانی اور صفائی نہ کرے گا اور غیر ضروری بوٹیوں اور درختوں کو نہ کاٹے گا تو غیر مفید درختوں اور گھاسوں کا غلبہ ہو جائے گا اور اس کا شجرۂ مقصود اور زرع مطلوب کمزور کالعدم یا بالکل ہی معدوم ہو جائے گا جیسا کہ کھیتی اور باغیچہ کی حفاظت اور بقا کے لئے دونوں چیزوں کی ضرورت ہے۔ کہ ان تک ان کے مادۂ حیات کو

پہنچایا جائے اور اجنبی درختوں اور گھاس پات کو نکال کر زمین کو صاف کیا جائے اسی طرح ایمان اور اسلام کے شجرہ کے گرد اگرد قلب مومن کی زمین میں مختلف قسم کی خواہشات اور گوناگوں گناہوں اور قسم قسم کے وساوس اور شبہات بھی پیدا ہو جایا کرتے ہیں۔ مومن کے لئے ازبس ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ اس قسم کے خیالات باطلہ و فاسدہ کے قلع قمع میں ساعی اور کوشاں رہے تاکہ یہ چیزیں اسکے ایمان کو نقصان پہنچا کر برباد نہ کر دیں۔

ایمان کے نتائج | جس قدر زمین زیادہ صاف ہوتی ہے اور اس کو زیادہ نرم کیا جاتا ہے اور بہترین پانی سے اس کو سیراب کر کے اچھا تخم بویا جاتا ہے۔ اسی قدر پھل اور فصل عمدہ حاصل ہوتے ہیں۔ اسی طرح قلب مومن کی حالت ہے کہ وہ ہمیشہ امداد اعمال اور تدبر و تفکر کے استمرار کرنے سے اعلیٰ ثمرات ایمانی و منافع اسلامی حاصل کرتا رہتا ہے۔ اور اس پر کوئی ایسا وقت نہیں گزرتا کہ جس میں اس شجرۂ ایمان پر ثمرات مفیدہ نمودار نہ ہوتے ہوں۔ صحابہ کرامؓ کی سیرت اور ان کے حالات کو جب پڑھا جاتا ہے تو ان کے ایمان کی تکمیل ثمرات و نتائج سے بخوبی روشن و ہویدا ہو جاتی ہے۔ وہ لوگ بدعات اور وساوس و خطرات نفسانی سے کس قدر گریز و نفرت کیا کرتے تھے۔ جن چیزوں کو آج ہم معمولی خیال کرتے ہیں اور ہماری توجہ بھی ان کی اصلاح کی طرف منعطف نہیں ہوتی، انھوں نے ایسی چیزوں پر اس شد و مد سے انکار کیا۔ جیسا آج کل کفر پر بھی کوئی اس درجہ انکار نہیں کرتا۔ انہیں شجرۂ ایمانی کی حفاظت اور اثرات مخالفہ سے اس کو بچانا ازحد مطلوب تھا۔ تاکہ حقیقی ایمان اور اسلام کے ساتھ متصف رہیں۔ مگر رفتہ رفتہ زمانے کی نیرنگی نے یہ وقت دکھایا کہ جب ہم اپنے شجرۂ ایمانی کی طرف نظر کرتے ہیں۔ تو بعض اوقات اجزا ہی سرے سے مفقود نظر آتے ہیں گویا اصلها ثابتٌ ہی نہیں رہا۔ محض ظاہر داری اور نمائش پر کام چلائے جاتے ہیں۔ فرعها فی السماء کا بھی کہیں پتہ نہیں۔ کیونکہ اعمال صالحہ کا نباہنا اور اس کی پابندی ہمارے لئے باعث تکلیف و کسرشان ہے۔ تؤتی اکلها کل حین کا تو ذکر ہی کیا۔ مدت العمر ہم صورت اعمال کی مشق اور ورزش کرتے رہتے ہیں اور جن منافع کی ان اعمال سے توقع کی جاتی تھی انکا

کوئی بھی اثر ہم میں نمودار نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہم نے ایمان کو ایسا اہم اور ضروری نہیں سمجھا جیسا کہ سمجھنا چاہیئے تھا۔ اندریں حالات نہ تو ہماری نمازوں میں وہ رنگ رہا جو ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر میں مذکور ہے اور نہ ہمارے حج و زکوٰۃ و روزے میں وہ کیفیت رہی جو کیوم ولدتہ امہ کا مصداق ٹھہرے۔ علیٰ ہذا القیاس دوسرے اعمال کو بھی بے نتیجہ و بے ثمر دیکھتے رہتے ہیں۔ بھلا جس عمل کو ہم اپنی خواہش و ہوس کے مطابق ادا کریں اسپر کوئی شرعی اثر کیونکر مرتب ہوگا۔

کلمۂ خبیثہ سے مُراد | ازاں بعد اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے کلمۂ خبیثہ کا ذکر فرمایا جس کو شجرۂ خبیثہ کے ساتھ تشبیہ دی گئی۔ جس کی جڑ نہ تو زمین میں قائم ہے نہ تنا نہ شاخیں نہ سایہ نہ ثمر ایسا ہی کلمۂ خبیثہ شرک۔ بدعت بداعمالیوں کا حال ہے۔ نہ تو اس پر کوئی اثرِ مفید مرتب ہوتا ہے اور نہ کسی بھلی بات کی طرف وہ رہنمائی کرتا ہے اور نہ ہی اس سے کسی خیر و منفعت و برکت کی امید کی جا سکتی ہے۔

کلمۂ خبیثہ سے مراد یہاں شرک ہے جس کو شجرۂ خبیثہ کے ساتھ تشبیہ دی گئی۔ شرک کے لئے کوئی دلیل نہیں۔ تمام عالم میں نظر دوڑائیے۔ زمین آسمان کا مطالعہ کیجئے۔ بر و بحر کے حالات کو دیکھئے۔ سورج چاند ستاروں کی حرکتوں کو ملاحظہ کیجئے۔ اختلاف لیل و نہار کا معائنہ کیجئے کیفیات ترقی حیوانات و نباتات کا غور سے مطالعہ کیجئے غرضکہ جس طرف بھی آپ دھیان یا توجہ کریں، بزبان حال لا الٰہ الا اللہ کی شہادت کا نقارہ بج رہا ہے پھر شرک کی دلیل ہو ہی کیسے سکتی ہے جو اسے جائز و صحیح قرار دے۔ مشرکین کے اعمال پر کوئی صحیح نتیجہ مرتب نہ ہوگا۔

وَقَدِمْنَا اِلیٰ مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰہُ ھَبَآءً مَّنْثُوْرًا۔ مشرک کا کوئی بھی عمل صالح مابعد الموت اس کے لئے مفید و ممد نہ ہوگا۔ من کان یرید الحیوٰۃ الدنیا و زینتھا نوف الیھم اعمالھم فیھا وھم فیھا لا یبخسون۔ اولٰئک الذین لیس لھم فی الاٰخرۃ الا النار وحبط ما صنعوا فیھا وباطل ما کانوا یعملون کے مطابق انکے

سارے اعمال آخرت میں بیکار ثابت ہوں گے۔

شرک کے لئے عقلی دلیل تو ہو ہی نہیں سکتی۔ نقلاً بھی شرک کا ثبوت کہیں نہیں ملتا۔ تمام انبیاءؑ کی طرف توحید کی وحی کی گئی۔ وَلقد اوحیَ الیک والی الذین من قبلک لئن اشرکت لَیَحبطنَّ عملُکَ وَلتکونن من الخاسرین۔ اس پر شاہد ناطق ہے۔

(۵) اللّٰہ نور السمٰوات والارض مثل نورہ کمشکوٰۃ فیھا مصباح المصباح فی الزجاجۃ الزجاجۃ کانّھا کوکب دریٌّ یوقد من شجرۃٍ مبارکۃٍ زیتونۃٍ لاشرقیۃٍ وَلاغربیۃٍ یکاد زیتھا یضیٓءُ وَلولم تمسسہُ نار۔ نورٌ علیٰ نور یھدی اللّٰہ وَلنورہٖ من یشاۤء وَلیضرب اللّٰہ الامثال للناس وَاللّٰہ بکل شیٍٔ علیم

اس مثل کی تشریح میں لوگوں نے از حد کوشش کی اور اپنے اپنے خیال کے مطابق جو کچھ کسی کی سمجھ میں آیا لکھ دیا۔ بہت سے لوگوں نے تو اُسے تشبیہ مرکب کے ذیل میں درج کیا اور بعض نے تشبیہ مفرد میں داخل کیا۔ جس قدر تفاسیر میری نظر سے گذری ہیں کسی میں کوئی ایسی معتدبہ ومفید شے نظر نہیں آئی جس پر طبیعتِ متجسّس قانع ہوسکے۔ بڑے بڑے ائمہ جب اس مثل کی تشریح پر پہنچتے ہیں۔ تو اپنے قلم کو روک لیتے ہیں۔ اس کے ساتھ کی تمثیلات کی پوری تشریح کے کرنے کے باوجود اس مثل کو ادھورا ہی چھوڑ کر کوئی دوسرا مضمون شروع کر دیتے ہیں۔ ان کے اقوال کو اگر یہاں بالاستیعاب ذکر کیا جائے تو ایک پوری کتاب کی شکل بن جائے گی، لہٰذا جو کچھ میرے ناقص فہم میں آتا ہے عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر غلط ہو تو ارباب فضل وکمال سے اس کی تصحیح کی امید کی جاتی ہے۔

قرآن حکیم میں دو ایسی سورتیں پائی جاتی ہیں جن کا نہایت ہی جبروت وسطوت کے عنوان سے آغاز ہوا ہے۔ اول سورہ نور سورۃٌ انزلناھا وفرضناھا۔ دوسری سورہ توبہ۔ براءۃ من اللّٰہ ورسولہ الخ

اس شان جلالی وہیبت الٰہی کو دیکھتے ہوئے انسان کو خوف اور ڈر طاری ہو جاتا ہے

کہ نہایت ہی شاہی شان سے حکم دیا گیا ہے۔ جس کا طرز دوسری سورتوں سے بالکل ہی جداگانہ و نرالا ہے۔ اس شانِ جلالی کو شانِ جمالی سے آمیزش کرنے کی غرض سے واللہ اعلم بالصواب ہر دو سورہ میں ایک ایسی آیت نازل فرمائی گئی ہے جو اس ہیبت اور خوف کو کچھ کم کردے۔ اور بشارت کا ایک اعلیٰ نمونہ دکھا کر جلال کے ساتھ جمال کو بھی ملا دے۔ توبہ میں لقد جآءکم رسول من انفسکم الخ کو لایا گیا۔ نور میں اللہ نور السموٰات والارض الخ کو نازل فرمایا گیا۔ انسان جب اپنے اخلاق و اعمال کو درست اور مہذب کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا نور اور تجلیات الٰہی اس کے سامنے نہایت ہی ہویدا اور آشکارا طور پر متجلی اور جلوہ افروز ہونے لگتی ہیں۔ اس کے نور کی دنیا کے اندر کوئی نظیر یا مثال حقیقی طور پر پیش نہیں کی جا سکتی۔ مگر بغرض افہام و تقریب الی العقل کے لئے چند اشارے پیش کئے جاتے ہیں۔ یعنی اگر ایک طاقچہ فرض کیا جائے جس میں ایک بتی رکھی جائے بتی شیشے کے اندر ہو اور شیشہ خود ہی ایسا روشن اور منور اور صاف ہو جیسے آسمان کا روشن ستارہ اور اس بتی کو زیتون کے اس درخت کے تیل سے جلایا جائے جو نہ پہاڑ سے مشرقی جانب ہو اور نہ مغربی جانب۔ کیونکہ مغربی جانب والے کو صبح کے وقت سورج کی گرمی نہیں پہنچ سکتی اس لئے اس کے پھل ناقص اور ناتمام رہتے ہیں اور مشرقی جانب والے کو بعد از دوپہر سایہ آجاتا ہے۔ سایہ کے باعث اس کے پھلوں کو پورے طور پر نشو و نما اور پختگی حاصل نہیں ہوتی۔ جب عین پہاڑ کے وسط میں کوئی زیتون کا درخت ہو گا۔ تو تمام دن اسے باقاعدہ سورج کی گرمی اور مناسب ہوا پہنچتی رہے گی اور پہاڑ سے جانب شرق و غرب ہونے کے باعث جو حرارت کی حدت و شدت زمین کے اجزاء کی آمیزش کی وجہ سے اسکو پہنچا کرتی تھی اس سے بھی وہ محفوظ رہے گا۔ ایسے درخت کا جب تیل نکالا جائے گا تو بغیر اس کے کہ اسے آگ سے سلگایا جائے خود بخود ہی روشنی کرنے پر آمادہ اور قابل ہوتا ہے۔ اگر اس کو آگ سے سلگایا جائے تو نور علیٰ نور کا کام دے گا جیسا منور چراغ ہر ذی البصر کو راہ دکھانے میں مدد دیتا ہے اور بھولنے بھٹکنے سے بچاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا نور اور اس کی تجلیات دنیا

کو رہنمائی اور ہدایت کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ اجزائے مثل کو ممثل بہ کے اجزاء سے تطبیق دینے کی ضرورت نہیں اسے بطور تمثیل مرکب سمجھنا چاہیئے۔ جن لوگوں نے اس تکلیف میں پڑ کر قسم قسم کی توجیہیں اور تاویلیں کیں ان کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ہر ایک مثال کے لئے ممثل بہ مخصوص کی تلاش کرنا بے سود ہے۔ غرض مثل کی طرف توجہ کرنے کی از بس ضرورت ہے بعض اوقات انسان اس الجھن میں پڑ کر اصلی مقصد سے دور ہو جاتا ہے۔ اہل تصوّف نے اس کی تشریح میں اپنے مسائل صوفیانہ کو کام میں لیا اور فلاسفہ نے مراتب نفس ناطقہ کی تشریح کو اس آیت سے ثابت کیا۔ جو غالباً کلام الٰہی کا مقتضاء اور منشاء نہ ہوگا۔ نورٌ علیٰ نور۔ کی تفسیر میں قرآن اور ایمان کا جو ذکر کیا گیا ہے اگرچہ وہ واقعہ کے بالکل موافق اور مطابق ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ نورٌ علیٰ نور۔ میں یہی مراد ہو۔ بہرحال اس کے اختلاف اور اشکال میں کسی کو کلام نہیں۔ ہر کسی نے اپنے فہم کے مطابق جو کچھ سمجھ میں آیا بیان کر دیا۔ ہر شخص ہماری دعا اور ذکر بالخیر کا مستوجب و مستحق ہے۔

(۶) والذین کفروا اعمالھم کسراب بقیعۃ یحسبہ الظمآن ماءً حتّٰی اذا جاءہٗ لم یجدہ شیئاً و وجد اللہ عندہٗ فوفاہ حسابہٗ واللہ سریع الحساب او کظلمات فی بحرٍ لجیّ یغشاہ موج من فوقہ موج من فوقہ سحاب بعضھا فوق بعض اذا اخرج یدہٗ لم یکد یراھا ومن لم یجعل اللہ لہٗ نوراً فما لہٗ من نور۔

مذکورہ بالا آیات میں حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے کافروں کے اعمال کے لئے دو مثالیں بیان فرمائیں ایک مثال بالسراب اور دوسری مثال ظلمات المتراکمہ۔ کیونکہ جو کافر ہدایت اور صراط مستقیم سے رد گرداں ہوتے ہیں۔ ان کی دو قسمیں ہیں۔ اول وہ جو اس خیال میں مبتلا ہیں کہ ہم ایک صحیح راستہ پر چل رہے ہیں۔ اور جو ہمارا مسلک ہے یہی مقصد تک موصل ہوگا لیکن جب حقیقت الامر کا انکشاف ہوتا ہے اور اشیا اپنے اصلی رنگ میں نمایاں ہونے لگتی ہیں تو

انھیں معلوم ہو جاتا ہے کہ ہم ایک غیر صحیح راستہ پر چل رہے تھے جو ہمارے مقصد اور غرض تک پہنچانے میں ہمیں مغالطہ میں ڈال رہا تھا جیسے کہ آجکل عام طور پر یہی حال ہے۔ اصحاب بدعت اور ہوا پرست لوگ اسی خیال میں مبتلا ہیں کہ ہم علم اور ہدایت کے طریق پر جادہ پیما ہیں مگر حقیقت کے انکشاف کے وقت انھیں یقیناً معلوم ہو جائے گا کہ وہ کسی صحیح راستہ پر نہیں تھے اور ان کے اعمال و عقائد کی بعینہ یہی حالت ہو گی جیسے کسی چٹیل میدان میں کوئی پیاسا سَراب کو دیکھ کر پانی خیال کرتا ہے اور اسی کو اپنا مادہ حیات اور زندگی تصور کرتا ہے۔ اور اسی تک پہنچنے کی سعی بلیغ کرتا ہے۔ مگر فی الحقیقت یہ خیال غلط اور بالکل غیر مطابق واقعہ ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اسی طرح جو اعمال لغیر اللہ یا علیٰ غیر اللہ کئے جاتے ہیں عامل کے خیال میں وہ نافع اور مفید معلوم ہوتے ہیں حالانکہ وہ ایسے نہیں۔ ایسے ہی اعمال کے متعلق اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔

وَقَدِمْنَا اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا

عمل کی قبولیت کے لئے دو شرطیں ہیں

(۱) اخلاص یعنی جو کام کیا جائے اس سے محض رضامندی و خوشنودی خداوندی مقصود ہو۔ ریا و سمعہ مقصود نہ ہو۔ غیر اللہ کی رضامندی وغیرہ کا خیال نہ ہو۔

(۲) وہ کام مطابق لامر اللہ و موافق شرع شریف ہو اہل بدعۃ و الجھل نے جو اعمال اپنے خیال ناقص میں صحیح سمجھے اور ان پر عمل پیرا ہوئے وہ رضائے الٰہی اور شریعت حقہ کے ماتحت نہ آسکے۔ لہٰذا ان کی وہ ہی مثال ہوئی جیسے کسی پیاسے نے سَراب کو پانی تصوّر کر لیا۔ کفار دنیا میں اپنے مذاق کے مطابق عمل کر کے اس بات کے متوقع رہتے ہیں کہ ہمیں بعد از مرگ اپنے اعمال کی جزائے حسن ملے گی۔ مگر قیامت کے دن یا عالم برزخ میں نتیجہ بالکل اس کے برعکس برآمد ہوگا۔ ایک حدیث میں وارد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جہنم کو مخلوق کے سامنے لایا جائے گا۔ اس کی شکل بالکل سراب سی ہوگی۔ یہودیوں کے لئے کہا جائے گا۔ تم کس چیز کی پرستش کیا کرتے تھے وہ کہیں گے ہم عزیر ابن اللہ کی پوجا کیا کرتے تھے۔

جناب باری تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوگا تم جھوٹ بولتے ہو اللہ کے لئے نہ کوئی بیوی ہے نہ کوئی اولاد ہے۔ پھر تم کیا چاہتے ہو وہ کہیں گے ہیں پانی پلاؤ۔ پھر انھیں کہا جائے گا کہ پانی پی لو، تو وہ سب کے سب جہنم میں پانی کے خیال سے کود پڑیں گے۔ یہی حال عیسائیوں کے ساتھ بھی ہوگا۔ بعینہ اہل باطل کے اعمال بھی انھیں عین موقع پر دھوکا دے جائیں گے۔ جب اپنے اعمال کی پاداش کی انھیں اشد ضرورت ہوگی۔

(۳) دوسری مثال میں کفار کے اعمال کو ظلمات متراکمہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے حق اور ہدایت کو پہچانا۔ صحیح اور غلط راستے میں امتیاز کیا۔ باوجود واقفیت اور معرفت کے باطل راستے کو اختیار کیا۔ اس پر کئی قسم کے ظلمات چھا گئے۔ ظلمت طبع ظلمت جہل ظلمت نفوس۔ ظلمت رسوم چاروں طرف سے انھیں تاریکیوں نے آکر گھیر لیا اور ہدایت کے راستے ان پر مسدود و بند کر دیئے گئے۔ جیسے کوئی شخص ایسے سمندر کی گہرائی میں ہو جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ اور اوپر سے اسے آکر موجوں نے دبوچا ہو۔ اور پھر علاوہ اس کے اوپر سے بادلوں نے بھی تاریکی کے اضافہ کرنے میں امداد دی ہو۔ یہی حال ان کفار کا ہے جو جان بوجھ کر راہ خدا کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔ اور انھوں نے راہ ضلالت پر چل کر جو کام کیا وہ بغیر سرمایۂ حیات کے باطل کرنے کے کچھ فائدہ مند ثابت نہ ہوگا۔ کفار کی سابقہ دو قسموں سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص اپنے اعمال کو جان بوجھ کر غیر صحیح طریق پر کرتا ہے یا بطور جہالت غیر صحیح اعمال کا مرتکب ہوتا ہے۔ اسکے اعمال اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچائینگے۔

سورہ نور میں اللہ تعالیٰ نے گذشتہ مثال میں اپنے نور سے مستفیض ہونے کے لئے اصلاح اخلاق کا ایک نمونہ پیش فرمایا ہے۔ انسان بے انتہا اور بے پایاں کمالات اور اخلاق کا منبع اور مخزن ہے اس کے اخلاق سے ایک خلق عفت بھی ہے اس خلق کی تکمیل کے لئے سورہ نور میں تمام قوانین اور ضوابط بیان فرمائے ہیں جن مواقع سے انسان کی عفت کو نقصان یا صدمہ پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ بطریق کمال ان کی بندش کر دی گئی۔ جیسا اس خلق کی تکمیل بطور نمونہ بیان

کی گئی ہے۔ اسی طرح جب انسان اپنے تمام اخلاق کو مکمل کر لیتا ہے۔ تو وہ اس قابل اور لائق ہو جاتا ہے کہ اب وہ نورِ الٰہی کے ساتھ اپنے تعلقات کو استوار کرے۔ خدا کے نور کی مثال اللہ نور السمٰوات والارض الخ میں مومنین کے استبشار کے لئے پیش کی گئی ہے۔ جب نورِ الٰہی سے تعلق قائم ہو جاتا ہے تو اس وقت انسان میں یہ قابلیت پائی جاتی ہے کہ اسے خلافتِ الٰہیہ سے سرفراز کیا جائے۔ اسی مناسبت کے باعث اللہ تعالیٰ نے اسی سورہ نور میں فرمایا ہے

وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنہم فی الارض کما استخلف الذین من قبلہم ولیمکنن لہم دینہم الذی ارتضی لہم ولیبدلنہم من بعد خوفہم امنا یعبدوننی لا یشرکون بی شیئا ومن کفر بعد ذالک فاولٰئک ہم الفاسقون۔

موجودہ حالات میں مسلمانوں نے اپنے اخلاق کی درستی اور تکمیل سے جب بے اعتنائی کی خصوصاً خلق عفت اور اس کی حفاظت کو خیرباد کہہ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی نعمت عظما، خلافت ارضی کو ان سے چھین لیا۔ باوجود اس مصیبت غلامی کے مسلمانوں کو تاحال اس کا انتباہ بھی نہیں ہوا۔ کہ وہ اپنے اخلاق کی درستی کی طرف متوجہ ہوں۔ وہ الٹا آزادی کی رو میں بہ کر یورپ کے عادات واطوار میں اندھا دھند حصہ لے رہے ہیں جو دن بدن ان کو شاہراہ ترقی سے ہٹا کر قعر مذلت وغلامی کی زنجیروں میں جکڑ رہا ہے۔ اگر مسلمان صرف سورۂ نور ہی کے احکام اوامر ونواہی کے پابند ہو جاتے تو اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ پورا فرما کر انھیں خلیفۃ اللہ فی الارض سے سرفراز فرماتا۔ افسوس کہ ہمیں اپنی کھوئی ہوئی عظمت واقتدار کا احساس بھی نہیں رہا اور نہ اس ذلت کے اسبابوں میں ہم نے کبھی غور کیا۔ جب مریض اپنے مرض سے تکلیف کو محسوس نہیں کرتا اور اسبابِ مرض کے زائل کرنے کا اسے خیال نہیں پیدا ہوتا۔ یا کسی ڈاکٹر وحکیم سے تشخیص مرض کے بعد نسخہ مناسبہ نہیں لیتا تو ایسے مریض کی صحت کا خدا ہی حافظ ہے۔ دنیا کے عقلمند ایسے نادان مریض کو کیا کہیں گے اور اسے کس لقب سے پکاریں گے۔ ہمارے پاس بھی

ایک نسخہ کیمیائی موجود ہے جس کو استعمال کر کے ہمارے اسلاف نے صحت کاملہ اور شفائے عاجلہ حاصل کر کے منازل ترقی کے ذروہ اعلیٰ پر پہنچ کر اقوام عالم کو حیران و متعجب کر دیا۔ ایک ہم ہیں کہ وہی نسخہ ہمارے پاس موجود ہے اس کا استعمال کرنا تو بجائے خود رہا۔ اس کے پڑھنے سے بھی جی چراتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرما کر ہمیں اپنے عیوب پر متنبہ فرما کر اصلاح کی توفیق بخشے۔

(۷) یاایہا الذین اٰمنوا اجتنبوا کثیراً من الظن ان بعض الظن اثم وّ لا تجسسوا ولا یغتب بعضکم بعضاً ایحب احدکم ان یاکل لحم اخیہ میتاً فکرھتموہ واتقوا اللہ ان اللہ تواب الرحیم۔ (سورہ حجرات پارہ ۲۶)

قیاس تمثیلی کی یہ بہترین مثال ہے۔ جو شخص اپنے بھائی کی ہتک عزت کر رہا ہے اور اس کی غیر حاضری میں اس کے متعلق ناپسندیدہ باتیں کر رہا ہے اور اس کے بھائی کو اس کا علم بھی نہیں کہ میرے بارے میں کیا کیا کہا گیا۔ اور وہ اپنی عزت بچانے کے لئے کوئی تدبیر کام میں نہیں لا سکتا۔ اس کی بعینہ یہی مثال ہے۔ جیسا کہ کوئی شخص اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا شروع کر دے۔ میت کو نہ تو اپنے اجزاء کے کاٹے جانے کی خبر ہوتی ہے اور اگر بالفرض اسے علم بھی ہو تو وہ مدافعت پر قادر نہیں۔

اَخ کا لفظ بظاہر ترحم و مہربانی کو چاہتا ہے مگر گلہ کرنے والے نے اخوت کے مفہوم کو نہ سمجھا اور بے تحاشا درندوں کی طرح اپنے عزیز ترین رشتہ دار کو کاٹنا شروع کر دیا۔

لحم کے لفظ سے خاص بات کی طرف اشارہ ہے۔ عربوں کو لحم کے ساتھ بہ نسبت دوسری قوموں کے زیادہ محبت ہے۔ چنانچہ سَیِّد الطعام اللحم کا مقولہ اس پر شاہد ناطق ہے۔ مغتاب بھی غیبت کو نہایت ہی لذیذ اور دل پسند سمجھ کر اس کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے اس کے منہ میں کوئی لذیذ اور شیریں چیز ڈال دی ہے۔ جو آجوں غیبت میں بڑھتا جاتا ہے توں توں وہ گھل گھل کر اس کے پیٹ میں جاتی ہے۔

اور اس کی زبان اس سے چاشنی لیتی ہے۔ اگر مغتاب کو غیبت سے روکا جائے تو ایسا ہی اس کو بُرا معلوم ہوتا ہے جیسا کہ کوئی شخص رنگارنگ کے مزے دار کھانوں سے ایسے وقت اٹھا دیا جائے جبکہ وہ اس کھانے سے سیر نہ ہوا ہو اور ابھی اس کی اشتہا باقی ہو۔ اس مثال میں غیبت کی کراہیت کو سامعین کے ذہن میں بٹھانا مقصود ہے۔ ایک محسوس مکروہ شے کو مشبہ بہ قرار دے کر غیر محسوس مُبصر کی کراہت کو ثابت کیا گیا۔ مشبہ بہ عام طور پر مسلم بین المتکلم والمخاطب ہوا کرتا ہے۔ یہاں پر بھی مردہ بھائی کا گوشت کھانا ایسا کریہہ اور ناپسندیدہ ہے جس میں کسی ذی فہم کو اختلاف نہ ہوگا۔

چونکہ غیبت ایک معمولی چیز سمجھی جاتی ہے۔ لوگ اسے کچھ بھی بُرا نہیں جانتے اگر روکا جائے تو کہہ دیتے ہیں کہ جو بات ہم فلاں شخص کی بابت کہہ رہے ہیں وہ واقعی اس میں موجود ہے وہ غیبت کا مصداق نہیں بن سکتی حالانکہ غیبت تو یہی ہے۔ اَنْ تَذْکُرَ اَخَاكَ وراء الظھر وھو یکرھہٗ۔

اگر وہ شے اس میں نہ پائی جائے تو اس کو شریعت میں بہتان کہا جاتا ہے جیسا کہ حدیث شریف میں اس کی تصریح موجود ہے۔ اس عام غلطی کے ازالے کے لئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس مثل کو ذکر فرمایا کہ اس کی کراہیت بھی مخاطبین کے ذہن میں بیٹھ جاوے۔

مُردہ بھائی کا گوشت کھانے کا مسئلہ اگرچہ بظاہر غیبت کے رنگ میں ایک تمثیل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا مگر ارباب بصیرت کے نزدیک تو یہ خود گوشت کی شکل میں حقیقتہً متشکل ہو جایا کرتا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں وارد ہے کہ آنحضرتؐ کے پاس دو عورتیں آئیں آپؐ نے فرمایا کہ تم سے گوشت کی بو آرہی ہے۔ انھوں نے عرض کیا کہ ہم روزہ دار ہیں ہم نے گوشت نہیں کھایا۔ آپؐ نے جواب میں فرمایا کہ تم نے ضرور گوشت کھایا ہے۔ آپؐ نے اُن سے جب قے کروائی تو ان کے پیٹ سے گوشت کی بوٹیاں نکلیں۔ بغرض مُسلم کو جب انھوں نے تناول کیا تو وہ باتیں عالم مثال میں بصورت لحم متشکل ہو گئیں۔

جب کسی کے پاس صرف یہ تمثیل پیش کی جائے۔ تو اس کی غیبت کی کراہیت کا اعتقاد ہو جاتا ہے اگر کسی کو اس کا بھی یقین ہو جائے کہ عالم مثال میں یہ صورت تب تمہی اختیار کریگی تو وہ اعتقاد بالضرور حق الیقین کے درجہ کو پہنچ جاتا ہے۔

(۸) ضرب اللہ مثلاً للذین کفروا امرأۃ نوح وامرأۃ لوط کانتا تحت عبدین من عبادنا صالحین فخانتاھما فلم یغنیا عنہما من اللہ شیئاً وقیل ادخلا النار مع الداخلین وضرب اللہ مثلاً للذین آمنوا امرأۃ فرعون اذ قالت رب ابن لی عندک بیتاً فی الجنۃ ونجنی من فرعون وعملہ ونجنی من القوم الظلمین ومریم ابنۃ عمران التی احصنت فرجہا فنفخنا فیہ من روحنا وصدقت بکلمات ربہا وکتبہ وکانت من القانتین۔ (سورہ تحریم پارہ ۲۸)

کافروں کے لئے اللہ تعالیٰ نوح اور لوط (علیہما السلام) کی عورتوں کی مثال بیان کرتا ہے۔ یہ دونوں، ہمارے دو نیک بندوں کے تحت میں تھیں پس انھوں نے خیانت کی اور کسی چیز نے ان کو اللہ کی گرفت سے نہ بچایا اور ان سے کہا گیا کہ آگ میں داخل ہونے والوں کے ساتھ تم بھی داخل ہو جاؤ۔ اسی طرح ایمان والوں کے لئے بھی اللہ تعالیٰ فرعون کی عورت کی مثال بیان کرتا ہے کہ اس نے کہا اے میرے پروردگار! تو اپنے فضل سے جنت میں میرا گھر بنادے اور مجھے فرعون اور اس کی بدکرداریوں سے نجات دے اور ظالموں سے مجھے بچا۔ اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی عصمت کو محفوظ رکھا پس ہم نے اس کو اپنی روح عنایت کی اور اس نے اپنے رب کے کلمات اور کتابوں کی تصدیق کی اور وہ اطاعت گزاروں میں سے تھی۔

آیات مذکورۂ بالا میں تین مثالیں ذکر فرمائی گئی ہیں۔ ایک کفار کے لئے اور دو مومنین کے لئے۔ کفار کی مثال سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ کفار تو اپنے کفر باللہ و بالرسول اور اس کے دوستوں سے عداوت رکھنے کے باعث بہر حال معذب اور سزایاب ہوں گے۔ انکا مومنین کے ساتھ اگر کوئی رشتہ یا پیوند یا ناطہ داری کا کوئی تعلق ہو تو وہ بروز قیامت کوئی فائدہ نہ دیگا۔

اگر رشتے ناطے کے تعلقات یا نکاح کا پیوند باوجود عدم ایمان مفید ہوتا تو نوح علیہ السلام، اور لوط علیہ السلام کی بیویوں کو ضرور نفع پہنچتا۔ جب ان اولوالعزم نبیوں کے ساتھ تعلق ہوتے ہوئے انھیں کوئی نفع نہ پہنچ سکا تو کسی دوسرے کو کیا توقع ہو سکتی ہے کہ وہ کسی بزرگ یا کسی رشتہ دار کے نیک ہونے پر اعتماد کر کے اپنی اصلاح اور بہبودی کو فراموش کر دے کہ مجھے اعمال صالحہ یا اصلاح کی ضرورت نہیں کیونکہ میرے اسلاف اور متعلقین خیرات مبرات یا اعمال صالح کے بہت سے ذخائر پیش کر چکے ہیں۔ ان حالات میں اپنی رشتہ داری کے تعلقات کے باعث مجھے نجات دلائے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مثال سے اس امید خام کو غلط اور غیر درست قرار دیا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی آنکھوں سے اس کو غرق ہوتے دیکھا شفقت پدری کے باعث جذبۂ فطرتی سے متاثر ہو کر اللہ سبحانہ تعالیٰ سے سوال بھی کیا مگر وہاں سے صاف جواب ملا اِنَّہٗ لیس من اھلك اِنَّہٗ عَمَلٌ غَیرُ صَالِحٍ متعدد آیات میں مضمون فرمایا گیا۔

لن تنفعکم ارحامکم ولا اولادکم الی یوم القیامۃ یفصل بینکم یوم لا تملك نفس لنفس شیئا واتقوا یوما لا تجزی نفس عن نفس شیئا واخشو یوما لا یجزی والدٌ عن ولدہ ولا مولود ھو جازٍ عن والدہٖ شیئا

مومنین کے لئے دو مثالیں | ان تمام مذکورہ بالا آیات نے مشرکین کی ان باطل طمعوں کا قلع قمع کر دیا جو ہمیشہ ان کے دلوں میں موجزن رہا کرتی تھیں، کہ ہم بزرگوں کی اولاد ہیں ان کی شفاعت دین و دنیا و آخرت میں نجات دلا دے گی جس طرح ان مشرکین میں وہ طمع پائی جاتی تھی کہ ہمارے اسلاف ہمیں نجات دلا دیں گے اسی طرح موجودہ زمانے میں سادات اور بزرگوں کی اولادیں اس قسم کے زعم باطل پائے جاتے ہیں۔ قرآن حکیم میں انبیاء سابقین کے قصے بیان فرما کر ہمیں متنبہ فرمایا کہ اس قسم کے بیہودہ خیالات اور اعتقادات سے اپنے دل و دماغ کو پاک صاف رکھو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لخت جگر فاطمہ زہراؓ کو ارشاد فرمایا اعنی عنك من اللہ شیئا انقذی نفسك من النار۔

مومنین کے لئے بھی دو مثالیں ذکر فرمائی گئیں۔ پہلی امرأۃ فرعون کی جس میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا کہ مومن کا اتصال بالکافر اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا بشرطیکہ وہ اس کے کفر اور عمل غیر صالح سے لاتعلق اور مفارق رہے۔ دوسرے کے گناہ سے آخرت میں کوئی

مضرت اور نقصان نہ پائے گا۔ اور مثل ثانوی میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر کسی عورت کا شوہر نہ ہو۔ نہ مسلم نہ غیر مسلم۔ تو اندریں حالات وہ خود نیک اور پارسا ہو تو اسے عدم تعلق کوئی مضر نہیں ہوتا۔ عقلی طور پر عورتوں کی چار قسمیں بن سکتی ہیں۔

اوّل عورت مسلمہ اور شوہر کافر جیسے کہ امرأۃ فرعون۔ اور فرعون کے اس تعلق سے بصورت افتراق و بیزاری عورت کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔

دوم عورت غیر مسلمہ اور مرد صالح پارسا بلکہ نبی جیسے امرأۃ نوح اور امرأۃ لوط۔ عدم اسلام کی صورت میں اس تعلق نے ان کو کوئی نفع نہ پہنچایا۔

سوم۔ عورت ایم غیر ذات زوج۔ عدم تعلق زوجیت نے اسے اپنی صلاحیت کی صورت میں کوئی نقصان نہ دیا جیسے مریمؑ بنت عمران۔

چہارم۔ عورت مسلمہ قانتہ اور مرد بھی مسلم اس کے کامیاب اور فائز المرام ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ امرأۃ نوح و لوط علیہما السلام کی مثال ذکر کرنے سے واللہ اعلم بالصواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ازواج مطہرات کو تنبیہ مقصود ہے کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تظاہر نہ کریں۔ اور اس خیال میں نہ پڑ جائیں کہ ہمارا تعلق سیّد الاولین والآخرین خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ قائم ہے۔ ہمیں کوئی فرو گزاشت نقصان نہ پہنچا ئیگی بطور اشارہ تنبیہ کی گئی کہ امرأۃ نوح و لوط علیہما السلام سے عبرت حاصل کرو۔

مثل کی حقیقت اور فقہی حیثیت تب منکشف ہو سکتی ہے۔ جب قیاس کے معنی اور حجت کی تشریح اور استدلال کے اقسام پورے طور پر بیان کئے جائیں۔ کیونکہ جس قدر بھی امثال ہیں ساری کی ساری قیاسات عقلیہ میں داخل ہیں۔ قرآن حکیم میں پچاس کے قریب امثال ذکر کی گئی ہیں سب میں یہ امر مشترک پایا جاتا ہے کہ ایک شے کو اس کی نظیر کے ساتھ تشبیہ دے کر دونوں پر ایک حکم لگایا گیا ہے جو وصف علۃ للحکم ایک شے میں پائی جاتی تھی۔ وہی وصف موجب للحکم دوسری شے میں بھی موجود ہے۔ اب دونوں کا حکم ایک ہو گا۔ یا دو چیزوں میں کسی

مثل کے ذریعے فرق ظاہر کیا جاتا ہے۔ اور دونوں کے حکم میں بھی اختلاف دکھایا جاتا ہے جو وصف علۃ للحکم ایک میں موجود تھی جب وہ دوسری میں منتفی ہے تو اتحادِ حکم کیونکر متصوّر ہو سکتا ہے عقلاً محال سمجھا جاتا ہے۔ کہ دو متضاد چیزیں ایک حکم کی مقتضی ہوں اسی بنا پر ارشاد ہوا۔

وتلک الامثال نضربہا للناس وما یعقلہا الا العالمون۔

امثال کے مفید منتج ہونے پر تمام امم کا اتفاق ہے۔ کسی فرقہ اسلامی نے مثل کے فائدے یا صحت سے انکار نہیں کیا۔ مثل درحقیقت ایک قسم کا قیاس ہے۔ تو لازمی طور پر قیاس کو دلیل شرعی ماننا پڑے گا۔ ہاں شرائط وغیرہ میں اگر علمائے مجتہدین کا باہم کوئی اختلاف ہو تو اس سے قیاس کے علم ہونے میں کوئی شبہ پیدا نہیں ہوتا۔ قیاس کے دلیل شرعی ہونے پر قریباً تمام صحابہ کا اجماع واتفاق تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے اس مکتوب گرامی سے جو انھوں نے ابوموسےٰ اشعریؓ کے نام روانہ فرمایا تھا، یہی مفہوم ہوتا ہے۔

خط کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

ثم الفہم الفہم فیما ادلی الیک مما ورد علیک مما لیس فی قراٰنٍ ولا سُنّۃٍ ثمّ قایس بین الامور عند ذالک واعرف الامثال ثم اعمد فیما تری الیٰ احبہا الی اللہ واشبہہا بالحق۔

اس خط پر کسی صحابی سے انکار یا اختلاف منقول نہیں۔ اصول شرعیہ میں سے قیاس بھی ایک بھاری اصل ہے۔ کوئی فقیہ اس سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے اسے جا بجا استعمال فرمایا ہے اور بطور حجت خصم پر پیش کیا ہے۔ منکرین احکام پر تمثیلات اور قیاسات سے ان کے شبہات کا ازالہ کرنا صراحۃً اس امر پر دال ہے کہ قیاس ایک حجت مسلمہ اور اصل شرعی ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ ان کے اعذار کو امثال وادلہ کے ذریعے زائل کرنے کی تکلیف گوارا نہ فرماتا۔ بطور تمثیل چند آیات پیش کی جاتی ہیں۔ جن میں مخالفین کو بذریعہ قیاس قائل کرنا مقصود ہے۔ جو لوگ موجودہ زندگی کے قائل ہیں اور نشأۃ ثانیہ کے منکر ہیں، اُن پر

امکان اور وقوع زندگی اول سے امکانِ حیاتِ ثانیہ پر بطور حجت پیش کیا گیا ہے۔ قیاس میں درحقیقت چار چیزیں ہونی ضروری ہیں۔

اول مقیس۔ دوم مقیس علیہ۔ سوم وصف موثر۔ چہارم حکم۔

زندگی اول مقیس علیہ نشأۃ ثانیہ مقیس۔ امکان وصف موثر۔ وجود تحقق حکم۔

آیت ذیل میں نشأۃ اولیٰ پر نشأۃ ثانیہ کو قیاس کیا گیا ہے۔ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولَىٰ فَلَوْلَا تَذَكَّرُونَ۔ اور کسی جگہ حیات بعد الموت کو یقظہ بعد النوم پر قیاس کیا گیا ہے کیونکہ نیند اور موت دونوں کو لفظ توفی کے ساتھ قرآن کریم میں تعبیر کیا گیا ہے۔ هُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُمْ بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ سے مراد نوم ہے۔ اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا سے مراد اختتام زندگی ہے اور کسی موقع پر خلق السموات والارض کو ذکر فرما کر سمجھایا گیا کہ جس طرح زمین آسمان جیسی بڑی ہستی کو پیدا کرنے پر اللہ تعالیٰ کو قدرت ہے اسی طرح مردوں کو زندہ کرنے پر بھی وہ قادر ہے اور کہیں احیاءِ موتیٰ کے ثبوت کے لئے زمین مردہ کے زندہ کرنے کو بطور دلیل پیش کیا گیا۔ إِنَّ الَّذِي أَحْيَاهَا لَمُحْيِي الْمَوْتَىٰ إِنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ وَأَحْيَيْنَا بِهِ بَلْدَةً مَيْتًا كَذَٰلِكَ الْخُرُوجُ۔

اس قسم کی جتنی مثالیں قرآن حکیم میں مذکور ہیں یا احادیث صحیحہ میں مروی ہیں تمام قیاسات عقلیہ کی مثالیں ہیں۔ سب کا خلاصہ اور لب لباب یہی معلوم ہوتا ہے کہ دو چیزوں میں ایک وصف مشترک پایا جاتا ہے جس پر حکم کا مدار ہے اور اسے علت للحکم کہنا جائز ہے وہی وصف موجب للحکم جب کسی دوسری شے میں پایا جاتا ہے تو لامحالہ دونوں کا حکم ایک ہی ہوگا۔

یا دو چیزوں میں اشتراک وصف موثر فی الحکم نہیں پایا جاتا تو ان کے احکام میں بھی اختلاف ہوگا۔ تو اب استدلال کا مدار تسویہ بین المتماثلین وفرق بین المختلفین پر ہوا۔ کوئی دانشمند اس بات کو قبول نہیں کرسکتا کہ علت مشترکہ پائے جانے کے باوجود اتحادِ حکم نہ ہو یا اختلافِ اوصاف موثرہ کے ہوتے ہوئے حکم کا اتحاد ہو۔ استدلال کی کئی قسمیں ہوسکتی ہیں یا تو ایک معین شے سے دوسری

معین شے پر دلیل پیش کی جاتی ہے۔ یا معین سے عام پر دلیل قائم کی جاتی ہے۔ یا عام سے معین پر دلیل قائم کی جاتی ہے۔ یا عام سے دوسرے عام پر دلیل قائم کی جاتی ہے۔

استدلال بالمعین علے المعین کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ استدلال بوجود الملزوم علے وجود اللازم۔ اس لئے کہ ہر ملزوم اپنے لازم کے وجود کے لئے دلیل ہوا کرتا ہے۔ اگر تلازم جانبین سے ہو تو ہر ایک دونوں میں سے دلیل اور مدلول بننے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اقسام ثلاثہ یہ ہیں :-

(۱) استدلال بالمؤثر علے الاثر۔

(۲) استدلال بالاثر علے المؤثر۔

(۳) استدلال باحد الاثرین علے الآخر۔

پہلے کی مثال جیسے آگ سے جلانے پر دلیل قائم کی جائے۔ دوسری کی مثال جیسے جلانے کو آگ پر دلیل بنایا جائے۔ تیسری جیسے جلانے سے دھوئیں وغیرہ آثار نار پر دلیل قائم کی جائے۔

اگر اس سلسلۂ استدلال کا انکار کیا جائے تو کسی شے کے وجود پر کوئی دلیل قائم نہیں ہو سکتی۔ مدار استدلال تلازم اور تسویہ بین المتماثلین پر ہے۔ جیسے کہ ایک اثر سے دوسرے اثر پر دلیل قائم کی جائے۔ یا قیاس فرق پایا جائے۔ جس کی مدار ایک اثر کے انتفاء سے دوسرے کے انتفاء پر استدلال کیا جائے۔ یا انتفاء لازم سے انتفاء ملزوم پر حجت قائم کی جائے۔

استدلال بالمعین علے العام اسی صورت میں ہو سکتا ہے، جب ہر دو متماثلین میں مساوات مانی جائے۔ ورنہ معین کا عام پر دلیل ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ قرآن حکیم میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ جہاں معین سے عام پر استدلال کیا گیا ہے۔ سورۂ قمر میں امم سابقہ کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا گیا۔ أكفاركم خيرٌ من أولئكم أم لكم براءةٌ في الزبر۔

اس آیت سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جس علت کے باعث امم سابقہ کو سزا

دی گئی۔ وہی علت اگر کسی دوسرے گروہ یا جماعت میں پائی جائے گی تو وہ بھی لامحالہ اسی سزا کی مستوجب و مستحق ہوگی اسی طرح سورۂ احقاف میں قوم عاد کا تذکرہ فرمایا گیا کہ انھیں باد صرصر سے تباہ کیا گیا۔ فقالوا ھذا عارض ممطرنا بل ھو ما استعجلتم بہ ریح فیھا عذاب الیم تدمر کل شیٔ بامر ربھا فاصبحوا لا یریٰ الا مساکنھم کذالک نجزی القوم المجرمین ولقد مکنھم فیما ان مکنکم فیہ وجعلنا لھم سمعاً و ابصاراً و افئدہ فما اغنیٰ عنھم سمعھم ولا ابصارھم ولا افئدتھم من شیٔ اذ کانوا یجحدون بآیات اللہ وحاق بھم ما کانوا بہ یستھزؤن۔

آیت مسطورہ بالا میں غور کرنے کے بعد صاف معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا اور ان کا حکم ایک ہے۔ انھوں نے انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کی۔ سامان تعیش کی فراوانی اور کثرت نے انھیں خدائی عذاب سے بچانے میں کسی قسم کی امداد نہ دی۔ اگر تم بھی سامان عیش و عشرت کے بہم پہنچنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف رہوگے تو تم بھی ویسے ہی سزا کے مستوجب ہوگے جیسے کہ وہ تھے۔ قرآن کریم میں متعدد آیات میں سیروا فی الارض کا حکم دیا گیا اور ان کی توجہ مکذبین کے انجام کو سوچنے کی طرف منعطف کرائی گئی۔ جس کا مقتضا یہ ہے کہ ہم ان کی تباہی و بربادی کو دیکھ کر عبرت و نصیحت حاصل کریں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم بھی انھیں کی روش کو اختیار کرنے کے بعد سزا کے مستوجب بنیں جیسے کہ وہ سزایاب ہوئے۔ سیر سے مراد صرف سیر علی الاقدام ہی نہیں بلکہ سیر قدمی اور سیر فکری و اعتبار معنوی کو بھی شامل ہے اگر ایک نظیر کا حکم دوسری نظیر جیسا نہ ہوتا تو عقلمندوں کو سیر فی الارض پر نتائج اخذ کرنے کا حکم نہ دیا جاتا۔ جیسے تسویہ بین المتماثلین کا حکم دیا گیا ویسے ہی تفریق بین المختلفین کے لئے بھی ہدایت فرمائی گئی۔ فطرت انسانی ہرگز اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں کہ باوجود اختلاف اوصاف موثرہ دونوں چیزوں پر ایک حکم کیا جائے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

افنجعل المسلمین کالمجرمین مالکم کیف تحکمون۔ (سورہ ن پارہ ۲۹)

سورہ جاثیہ میں بھی اسی مضمون کو زیادہ توضیح سے بیان فرمایا گیا۔ ام حسب الذین اجترحوا السیات ان نجعلھم کالذین اٰمنوا وعملوا الصالحات سواءً محیاھم ومماتھم ساء ما یحکمون۔

اور سورہ صٓ میں ارشاد ہوا ہے۔ ام نجعل الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجار۔

ہر سہ مذکورہ بالا آیات سے اللہ تعالیٰ نے عقلمندوں کو متنبہ فرمایا کہ شے اور اسکے مخالف کا حکم ایک نہیں ہوتا۔ مجرموں کی سزا کی بنا جرم پر بھی مسلم۔ مومن متقی میں چونکہ جرم کا فقدان تھا۔ اب وہ مجرم یا مفسد کی سزا کے کیونکر مستوجب ہو سکتے ہیں۔ اسی کا نام میزان ہے جیسے کہ میزان حسی موزونات مادیہ میں مساوات یا عدم مساوات کو ظاہر کرتی ہے۔ ویسا ہی میزان قیاسی متماثلین میں اتحاد و مساوات فی الحکم کا اظہار کرتی ہے اور مختلفین فی الاوصاف میں اختلاف فی الاحکام کو بیان کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جیسے کتاب نازل فرمائی ویسے ہی اس کے ساتھ میزان کو بھی نازل فرمایا۔ جیسا سورہ شوریٰ کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے اللہ الذی انزل الکتٰب بالحق والمیزان۔ اور سورہ حدید کی آیت مندرجہ ذیل میں اس کو زیادہ واضح کیا گیا ہے۔ لقد ارسلنا رسلنا بالبینٰت وانزلنا معھم الکتٰب والمیزان لیقوم الناس بالقسط۔

سورہ رحمٰن کے آغاز میں الرحمٰن علم القراٰن کا ذکر فرمانے کے بعد والسماء رفعھا ووضع المیزان کا بھی امتنان فرمایا۔ میزان سے مراد انصاف اور وہ ترازو ہے جس کے ذریعے انصاف اور ظلم میں تمیز کی جا سکے۔ قیاس صحیح اور میزان کا مفہوم دراصل ایک ہی ہے بجائے قیاس کے اگر میزان کا لفظ استعمال کیا جائے تو زیادہ موزوں ہے۔ کیونکہ میزان ہر جگہ پر ممدوح سمجھا گیا ہے اور قابل ستائش موقع پر اس کا استعمال ہوا ہے۔ مذکورۂ بالا ہر دو آیات میں کتاب کی تنزیل کے ساتھ میزان کے نازل کرنے کا بھی امتنان ظاہر فرمایا گیا ہے اور

قیاس کسی جگہ صحیح اور کسی جگہ فاسد بھی ہوتا ہے۔ صحیح کو تو لفظ میزان شامل ہے اور قیاس فاسد کی اللہ تعالیٰ نے متعدد جگہوں پر مذمت فرمائی۔ چنانچہ کفار نے جب انما البیع مثل الربوٰا کہا تو اللہ تعالیٰ نے احل اللہ البیع وحرم الربوٰا یمحق اللہ الربوٰا و یربی الصدقٰت فرما کر ان کے خیال باطل کی تردید فرمائی۔ ایسا ہی کفار نے میتہ اور مذبوحہ کو یکساں قرار دیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی بھی تردید فرمائی۔ حرمت علیکم المیتۃ الخ ولا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ نازل فرما کر ان کی تردید کی۔

سلف صالحین سے جن لوگوں نے قیاس کی مذمت یا برائی بیان فرمائی ہے ان کا ہرگز یہ مدعا نہ تھا کہ وہ قیاس صحیح کو غلط قرار دیں بلکہ انھوں نے غلط قیاس کے مذموم ہونے کے وجوہات بیان کئے اور اس کے استعمال سے لوگوں کو منع کیا۔ صحیح قیاس کی تردید کسی عقلمند یا اہل علم سے متصور نہیں ہو سکتی۔ فطرت انسانی و وجدان نفسانی و آیات قرآنی و احادیث نبویہ علےٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ اس کے ثبوت کے لئے لا تعد ولا تحصےٰ موجود ہیں۔ اندریں حالات کسی اہل علم یا عقلمند سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اس کی تردید کرے جن لوگوں کی طرف قیاس کی تردید منسوب کی جاتی ہے وہ خود اپنی تصنیفات میں قیاس کا استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے یا تو اس قیاس کی تردید کی ہے، جو نص کے مقابلے میں پیش کیا جاتا ہے، یا مورد نص میں قیاس کے غیر مفید یا غیر معتد بہ ہونے کا ذکر کیا ہوگا، ورنہ صحیح قیاس کی کون تردید کر سکتا ہے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قیاس کی قسمیں ذکر کر کے صحیح اور غیر صحیح کا امتیاز کر دیا جائے۔ عموماً قیاس کا استعمال تین طرح پہ آیا کرتا ہے۔

(۱) قیاس علت (۲) قیاس دلالت (۳) قیاس شبہ

ان ہر سہ اقسام کا ذکر قرآن حکیم میں فرمایا گیا۔ خواہ وہ صحیح ہوں، یا غلط تفصیل آئندہ سے پتہ چل جائے گا۔ قیاس علت کو قرآن حکیم میں کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ قیاس صحیح کا مدار چار چیزوں پہ ہے۔

اصل[1] . فرع[2] . علت مشترکہ[3] و حکم[4]

مثال میں جاری کرنے کے بعد اس کی پوری حقیقت ذہن نشین ہو سکے گی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اِنَّ مَثَلَ عِیسٰی عِندَ اللہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَہٗ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُن فَیَکُونُ۔ (سورہ آل عمران پارہ سوم)

عیسیٰ ع کو اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم ع کے بطن سے بلا اَب پیدا کیا۔ ان کی انوکھی پیدائش کے باعث بعض جہال کو ان کی الوہیت یا ثالث ثلاثہ ہونے کا گمان ہوا۔ ان کی تعظیم میں انھوں نے غلو سے کام لیا۔ ان کے مقابل میں ایک دوسری جماعت خلاف معتاد پیدائش پر نکتہ چینی کرنے لگی۔ حضرت مریم ع صدیقہ کے شان میں انھوں نے افترا پردازی تک نوبت پہنچائی۔ ہر دو فریقین کی تردید کے لئے اللہ تعالیٰ نے آیت بالا نازل فرما کر عیسے ع کی حقیقت کو اور حضرت مریم ع کی پاک دامنی کو واضح کر دیا۔ آدم ع کو جب اللہ تعالیٰ بلا اَب و اُم پیدا کرنے پر قادر ہے تو عیسے ع کو بلا اَب پیدا کرنے میں کونسی دشواری اور استحالہ پیش آتا ہے۔ مٹی میں نہ تو حیات تھی، نہ حس و حرکت اس سے آدم ع کی پیدائش کو مان کر عیسے ع کی پیدائش پر بیہودہ نکتہ چینی کرنے کا کونسا موقع ہے۔ آدم ع مقیس علیہ۔ عیسے مقیس اور امکان اور مشیئت الٰہی کے احاطہ کے اندر ہونا وصف مشترک اب جو حکم مقیس علیہ کا ہوگا وہی مقیس کے لئے ماننا پڑے گا۔ یہ تو تفریط والوں کی تردید ہوئی اور جن لوگوں نے افراط و غلو کیا تھا ان کی تردید اگرچہ ہمارے موضوع مقالہ سے من وجہ خارج ہے مگر من وجہ اصل مقصود کے ساتھ اس کا ارتباط پیدا ہو سکتا ہے چند الفاظ اس کے متعلق بھی لکھے جاتے ہیں۔ عیسیٰ ع کی خلاف قانون پیدائش کی بنا پر تم ان کی الوہیت یا ثالث ثلاثہ ہونے کے قائل ہو گئے۔ اگر خرق عادت کی پیدائش اس منصب کے لئے مقتضی ہے تو آدم ع کو بطریق اولےٰ یہ درجہ ملنا چاہیئے تھا۔ جب خارق در خارق میں الوہیت کا شائبہ نہیں تو خلاف عادت مخلوق کو کیونکر اِلٰہ کہہ سکتے ہو۔ معلوم ہوا کہ وہ معبود یا اِلٰہ نہیں۔ یہاں بھی قیاس بعلت اسی طرح جاری ہو سکتا ہے۔

قد خلت من قبلکم سنن فسیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبة المکذبین. (آل عمران پارہ چہارم)

تم سے پہلے تمہارے جیسی کئی امتیں دنیا میں گزریں۔ ان کے برے انجام کی طرف توجہ کرو اور سوچو کہ ان کی ہلاکت و تباہی کا سبب کیا تھا۔ انھوں نے آیات الٰہی کی تکذیب کی ۔ اور رسولوں کو جھٹلایا۔ یہاں پر بھی وہی چاروں چیزیں پائی جاتی ہیں جن پر قیاس علت کا مدار تھا امم سابقہ اصل مخاطبین فرع علت جامع تکذیب اور حکم ہلاکت۔ علت موثرہ ایک جگہ جب موجب للحکم بن چکی ہے تو لامحالہ جہاں کہیں بھی وہ پائی جائے گی حکم کا ترتب اس پر لازمی و ضروری ہوگا۔ ورنہ علت علت نہ رہے گی۔ اذا وجدت العلة وجد المعلول۔ جب امم سابقہ کو تکذیب کے بعد برے نتائج اور انتقام الٰہی سے نجات نہ ملی تو تم موجودہ اشخاص یا اقوام باوجود تکذیب بآیات اللہ و رسلہ انتقام الٰہی سے کیونکر بچ سکو گے۔ اکفارکم خیر من اولٰئکم ام لکم براءة فی الزبر۔

ایک اور موقع پر یوں ارشاد ہوتا ہے الم یروا کم اھلکنا من قبلھم من قرن مکنا ھم فی الارض مالم نمکن لکم وارسلنا السماء علیھم مدرارا وجعلنا الانھار تجری من تحتھم فاھلکنا ھم بذنوبھم وانشأنا من بعد ھم قرنا اخرین۔ (سورہ انعام پارہ ۷)

جناب باری تعالیٰ نے قرون سابقہ کے اہلاک کا ذکر فرمایا اور اس کی علت بھی ذکر فرمائی کہ وہ گناہگار تھے۔ امم سابقہ کو اصل سمجھو اور مخاطبین کو فرع اور ذنوب علت جامع اور اہلاک حکم قیاس کی تکمیل تو اتنی بات سے ہو جاتی تھی مگر مزید تاکید و استحکام قیاس کے لئے ایک اور اضافہ کر دیا گیا کہ امم سابقہ تم سے زیادہ قوی اور توانا تھیں۔ انکی قوت اور زور آوری نے علت ہلاکت کے موجود ہونے کے وقت عذاب کے ٹالنے میں انھیں کچھ امداد نہ دی باوجودیکہ وہ کہا کرتے تھے من اشد منا قوة ایسے توانا و قوی لوگ جب نہنگ ہلاکت کا لقمہ بن چکے

تو ہمارے جیسے کمزوروں کی کیا بساط کہ ہم اس سے محفوظ رہ سکیں۔

اسی عنوان کے ماتحت آیت ذیل بھی پیش کی جا سکتی ہے۔ کالذین من قبلکم کانوا اشد منکم قوۃً واکثر اموالاً واولاداً فاستمتعوا بخلاقھم فاستمتعتم بخلاقکم کما استمتع الذین من قبلکم بخلاقھم وخضتم کالذی خاضوا اولئک حبطت اعمالھم فی الدنیا والآخرۃ واولئک ھم الخاسرون۔ (سورہ توبہ پارہ ۱۰)

امم سابقہ کو اصل اور مخاطبین کو فرع علت حکم استمتاع بالنصیب والحظ اور حکم حبط اعمال وخسارہ فی الدارین۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو جو قوائے فطرتی یا ملکات اکتسابی عطا فرمائے تھے انھوں نے اُنسے حسب مقسوم فائدہ اٹھایا۔ یہی قوائے وملکات اگر وہ حصول آخرت کے لیئے استعمال کرتے۔ تو فائز فی الدنیا والآخرہ ہوجاتے۔ مگر ان کی بدنصیبی و بدبختی نے انھیں ہوا وہوس کا پیرو بنا کر اکتساب دنیا اور منفعت حیات عاجلہ کی طرف لگا دیا۔ مفاد اُخروی سے وہ بالکل محروم ہوگئے۔ ان کی قوت کی زیادتی اور اموال و اولاد کی کثرت نے انھیں کوئی نفع نہ پہنچایا بلکہ بحکم آیہ شریفہ فلا تعجبک اموالھم ولا اولادھم انما یرید اللہ لیعذبھم بھا فی الحیوٰۃ الدنیا وتزھق انفسھم وھم کٰفرون (سورہ توبہ پارہ ۱۰)

بجائے اس کے کہ یہ اموال و اولاد ان کو مفید پڑتے الٹے ان کو دنیا کی الجھن میں پھنسا کر خدا سے غافل کردیا اور آخرت کی بہتری کو وہ فراموش کر بیٹھے۔ اسی طور پر جو لوگ اس قسم کے سامان معیشت و کثرت تعداد پر غرہ ہوکر اللہ تعالیٰ کو بھول جاتے ہیں اور آخرت کی تیاری کے واسطے کوئی کوشش نہیں کرتے تمامتر ہی خواہشات نفسانی میں منہمک ہوجاتے ہیں وہ بھی عذاب الٰہی کی زد سے بچ نہیں سکتے۔ ان ھالکین میں دو امر موجب تباہی تھے (۱) استمتاع بالخلاق (۲) خوض بالباطل۔ ہمیشہ یہی دو امر موجب ہلاکت ہوا کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان میں دو قوتیں ودیعت فرمائی ہیں۔ (۱) قوت علمی۔ (۲) قوت عملی۔

استمتاع بالخلاق سے انھوں نے اپنی قوت عملی کو غیر موزوں طریق و موقع پر استعمال کیا اور خوض بالباطل سے قوت علمی کو بھی برباد کر دیا۔ انسان جب اپنی تمام مایۂ حیات کو غیر مفید موقع پر صرف کر دے تو وہ ہلاکت سے کب نجات پا سکتا ہے۔ یہ اسباب جہاں کہیں بھی پائے جائیں گے ان کے نتائج ضرور ہی مرتب ہو کر رہیں گے۔

استمتاع بخلاق اور خوض بالباطل تمام مفاسد کا منبع اور تباہیوں کا موجب ہے احادیث اور آیات میں ان دو چیزوں کو مختلف طریقوں پر مختلف الفاظ میں ادا کیا گیا ہے جن اقوام نے انبیاءؑ کی مخالفت کی ان میں یہی دو مرض عام طور پر پائے جاتے تھے۔ ان دو فتنوں کی اہمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر رکعت میں حکم دیا گیا کہ ان سے بچنے کے لئے جناب الٰہی میں اپنی استدعا پیش کریں۔ المغضوب علیھم وہی لوگ ہیں جو حق کو جان کر اس کے خلاف عمل کرتے ہیں الضالین سے وہ لوگ مراد لئے جاتے ہیں جنھوں نے صحیح علم حاصل کرنے میں غلطی کی۔ انسان کا اعتقاد جب خراب ہوتا ہے تو وہ خوض بالباطل سے اور جب عمل خراب ہوتے ہیں تو وہ استمتاع بالخلاق۔ ایک کو بدعت کہا جاتا ہے اور دوسرے کو اتباع ہوا۔ سلف صالحین فرمایا کرتے تھے احذروا من الناس صنفین صاحب ھواء فتنہ ھواہ وصاحب دنیا اعجبتہ دنیاہ احذروا فتنۃ عالم الفاجر والعابد الجاھل فان فتنتھما فتنۃ لکل مفتون جن لوگوں نے ان دونوں چیزوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھا انھیں ائمۃ المتقین کا خطاب دیا گیا۔ وجعلناھم ائمۃ یھدون بامرنا لما صبروا وکانوا بآیاتنا یوقنون۔ صبر سے انھوں نے ترک شہوات کا مقابلہ کیا اور یقین سے شبہات کو دفع کیا۔ مذکورہ بالا آیات و شواہد سے بالتصریح معلوم ہو چکا کہ شریعت اسلامی نے قیاس علت کو ایک نہایت ہی مستند دلیل قرار دیا ہے۔ اس کے نظائر و شواہد قرآن حکیم و احادیث میں کثرت سے ملتے ہیں جن کا بالاستیعاب یہاں ذکر کرنا دشوار معلوم ہوتا ہے مشتے نمونہ از خروار مذکورہ شواہد پر اکتفا کی جاتی ہے۔

(۲) قیاس دلالت۔ قیاس دلالت کا مدار اس امر پر ہے کہ اصل اور فرع کو دلیل علت

میں جمع کیا جائے۔ قیاس علت میں اصل فرع کی ایک علت ہوا کرتی تھی۔ یہاں علت ایک نہیں۔ مگر دلیل علت، دونوں میں مشترک ہے۔ اس کے باعث دونوں کا حکم بھی ایک ہی ہوگا اس کا حاصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل ایک علت سے معلول ہے اور فرع بھی ایک دوسری علت سے معلول ہے اور دونوں علتوں کی دلیل ایک ہے۔ جس کے باعث دونوں کا حکم ایک ماننا پڑے گا۔

آیت ذیل سے اس کی تشریح و توضیح ہو سکتی ہے۔ ومن آیاتہ انک تری الارض خاشعۃً فاذا انزلنا علیھا الماء اھتزت وربت ان الذی احیاھا لمحی الموتیٰ انہٗ علیٰ کل شیءٍ قدیر۔

اس آیت میں دو زندگیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۱) زمین کی زندگی۔ جب قحط سالی ہوتی ہے اور باران رحمت کا نزول رک جاتا ہے تو اس وقت زمین خشک بے رونق ہو جایا کرتی ہے۔ کسی قسم کا سبزہ و تازگی اس پر نمودار نہیں ہوتی اس وقت زمین کو مردہ کہا جاتا ہے۔ جب باران رحمت کا نزول ہوتا ہے اور زمین کے قوائے مولدہ و نامیہ اپنے مواد محفوظہ میں کام کرنے کے بعد زمین کو سرسبز و شاداب کر دیتے ہیں تو یہ زمین کی زندگی ہے۔

دوسری زندگی ان لوگوں کی ہے جو اس عالم سے فانی ہو کر عالم برزخ میں جا پہنچے ان کی پہلی زندگی تو ہر شخص تسلیم کرتا ہے مگر کفار کو دوسری زندگی سے انکار ہے۔ اب ان کے سمجھانے کے لئے کہ مرنے کے بعد تم دوسری زندگی میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنا حساب کتاب دو گے اور ہر نفس کے روبرو اس کے کارنامے پیش ہوں گے۔ حسنات کی زیادتی کی صورت میں وہ مستوجب رحمت و جنت ہوں گے۔ اور سیئات کے زیادہ ہونے کی بنا پر انھیں جہنم رسید کیا جائے گا۔ احیاء ارض کی علت نزول باراں تھی اور احیائے موتیٰ کی علت ارادۂ الٰہی۔ اب دونوں کے درمیان جو امر مشترک ہے وہ عموم قدرت و کمال قدرت ہے جو احیائے ارض کی علت، و احیائے موتیٰ کی

علت دونوں کو شامل ہے۔

قیاس دلالت کو اور بھی کئی موقعوں پر استعمال فرما کر ہماری رہنمائی فرمائی گئی آیۂ ذیل کا مطالعہ اسی قاعدے کے ماتحت کیا جائے۔

یا ایہا الناس ان کنتم فی ریب من البعث فانا خلقناکم من تراب ثم من نطفۃ ثم من علقۃ ثم من مضغۃ مخلقۃ وغیر مخلقۃ لنبین لکم ونقر فی الارحام ما نشاء الی اجل مسمی۔ ثم نخرجکم طفلا ثم لتبلغوا اشدکم ومنکم من یتوفی ومنکم من یرد الی ارذل العمر لکیلا یعلم من بعد علم شیئا الخ (سورہ حج پارہ ۱۷)

اگر تمہیں قیامت کے بارے میں تردد وشک ہے تو اپنے مخلوق ہونے میں اور درجہ بدرجہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہونے میں اور درجۂ کمال تک پہنچکر سن شیخوخت تک پہنچکر مرنے میں تو تردد نہیں۔ بعث بعد الموت بھی اسی زندگی کی نظیر ہے کیونکہ دونوں ممکن الوقوع ہیں۔ اگر نشأۃ اولی ممکن نہ ہوتی تو انسان کبھی زندگی کا جامہ نہ پہنتا۔ اس نشأۃ کے ختم ہونے کے بعد کوئی ایسا استحالہ عقلی قائم نہیں ہوا جو دوبارہ زندگی کو روک دے۔ جس طرح ایک کاریگر کسی چیز کو بناتا ہے دوبارہ اس کا بنانا بہ نسبت پہلے کے زیادہ آسان اور سہل ہوا کرتا ہے۔ پیدائش اولین کے مشاہدہ کرنے کے بعد احیائے ثانوی سے تم کیونکر منکر ہو سکتے ہو اس کی قدرت ہمیشہ یکساں ہے۔ جیسے کہ اس کی ذات لازوال وغیر متغیر ہے ایسے ہی اسکے صفات بھی غیر متبدل وغیر زوال پذیر ہیں۔ احیائے اول اپنے اسباب اور علل سے متحقق ہوتا ہے، اور احیائے ثانی کا تحقق بھی اپنے علل واسباب سے ہوگا مگر ہر دو نشأتوں کی علت العلل امکان قابل وقوع دونوں میں مشترک ہے۔ لہٰذا دونوں کا حکم بھی مشترک ہوگا۔

قولہ وضرب لنا مثلاً ونسی خلقہ قال من یحی العظام وھی رمیم قل یحییھا الذی انشأھا اول مرۃ وھو بکل خلق علیم ن الذی جعل لکم من الشجر الاخضر

نارًا فاذا انتم منہ توقدون اولیس الذی خلق السموٰت بقادر علیٰ ان یخلق مثلہم بلٰی وھو الخلاق العلیم۔ انما امرہٗ اذا اراد شیئاً ان یقول لہٗ کن فیکون فسبحٰن الذی بیدہٖ ملکوت کل شیٔ و الیہ ترجعون۔ بھی اسی سلسلے میں مندرج ہے۔

ان آیات میں احیاء بعد الموت پر کئی وجوہ سے روشنی ڈالی گئی ہے جو حسب ذیل ہے۔

(۱) اول اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰہُ سے انسان کو اس کا مبداءِ خلقت یاد دلا کر نشأۃ ثانیہ کا قائل کیا جاتا ہے۔ پھر

(۲) دوم۔ ضرب لنا مثلاً و نسی خلقہ میں اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ کہ کیا منکر احیائے ثانی کو اللہ تعالیٰ کی پہلی نعمتِ حیات جس سے وہ اس عالم میں مستفید و متمتع ہو رہا ہے۔ فراموش ہو گئی۔ اگر وہ اس زندگی کے حالات اور اس کے اطوار کو اپنی قوت حافظہ میں محفوظ رکھتا تو کبھی بھی اسے جرأت نہ ہوتی کہ احیاءِ بعد الموت کا انکار کرتا۔

(۳) سوم۔ قل یحییھا الذی انشأھا اول مرۃ میں اس کے اعتراض من یحیی العظام وھی رمیم کا صراحۃً حکم فرمایا گیا۔ جس ذات نے اسے پہلے پیدا کیا تھا۔ اب بھی وہ اس کے پیدا کرنے پر قادر ہے اور قادر رہے گی۔

(۴) چہارم۔ وھو بکل خلق علیم سے اپنی عمومِ قدرت اور وسعت علم کو بطور دلیل پیش کر کے منکر کے شک کو زائل کیا گیا ہے۔ کیونکہ اعادہٗ موتیٰ کا تعذر دو امروں پر مبنی ہو سکتا ہے۔ قصورِ علم یا قصورِ قدرت۔ وھو بکل خلق علیم سے ہر دو کا ثبوت پیش کیا گیا۔ اس کی قدرت کی بھی کوئی انتہا نہیں۔ تمام مقتدر ہستیوں سے اس کی ہستی بالاتر ہے خلق السموٰت والارض اس کی قدرت کے لئے ہر دم شہادت دے رہے ہیں۔ کسی معدوم کے اعادہ کے لئے اسے چنداں سامان و اسباب مہیا کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف کلمہ کُنْ سے جس چیز کو چاہے فوراً اسے بیشتر پیدا کر سکتا ہے۔ ہر شے پر اس کو حکمرانی حاصل ہے۔ احیائے موتیٰ کا خلق السموٰت والارض کے ساتھ اگر مقابلہ کیا جائے تو ایک معمولی سا کام معلوم ہوتا ہے۔

اندرین حالات منکرین کی عقلوں پر کیوں پتھر پڑ گئے۔

(۵) پنجم۔ اللہ تعالیٰ نے احیاء اموات پر ایک ایسی دلیل قاطع بیان فرمائی جس کے سمجھنے کے بعد کوئی ذی عقل زندگی ثانی کا منکر نہیں رہ سکتا۔ الذی جعل لکم من الشجر الاخضر نارا اللہ تعالےٰ کی کمال قدرت اور اخراج الاموات من القبور پر صراحۃً دال ہے اور منکرین کے اس شبہ کا بھی جواب ہے جو نشأۃ ثانیہ کے انکار کے لئے پیش کیا کرتے ہیں۔ موت کی طبیعت بارد یابس ہے اور طبع حیات حار رطب۔ بارد یابس اور حار رطب کے درمیان تقابل تضاد ہے جب ان میں سے ایک چیز کسی محل میں حلول کر جائے تو دوسری کا آنا محال ہے۔ ورنہ تضاد قائم نہ رہے گا۔

اس کی یوں تردید کی گئی۔ شجر اخضر بھی حار رطب ہے اور نار حار یابس۔ جب ایک حار یابس کا حار رطب سے پیدا ہونا ممکن ہے تو بعد الموت زندگی کا آنا کیوں محال اور ممنوع ہے۔ روزمرہ ہم دیکھتے ہیں کہ درختوں سے آگ نکلتی ہے۔ درختوں کی رطوبت حار یابس کے وجود کو فنا نہیں کر سکتی۔ اسی طور پر یُبسِ موت اور رطوبت حیات میں بھی کوئی رکاوٹ اور بندش نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ متضادین کا ایک وقت ایک محل میں ایک حیثیت سے جمع ہونا محال ہے۔ اور متضادین کا علےٰ سبیل التبادل ایک محل میں آنا ممنوع نہیں جس طرح عدم ملکہ میں محل عدمی کا وجودی کے لئے قابل ہونا ضروری ہے اسی طرح تقابل تضاد میں ہر ایک کا محل دوسرے کی قابلیت رکھتا ہے صورتِ متنازعہ فیہ میں موت وحیات کو ایک محل میں جمع نہیں کیا گیا بلکہ بعد از زوالِ حیات موت آجاتی ہے اور موت کے ارتفاع کے بعد اسی مادّے میں حیات کا ظہور ہو جاتا ہے لہٰذا کوئی اعتراض ہی نہ رہا۔ ان وجوہات خمسہ کے علاوہ اس آیت سے اور بھی کئی طریقوں سے استدلال کیا جا سکتا ہے مگر سردست ان ہی پانچوں پر اختصار کیا جاتا ہے۔ واللہ اعلم

(۳) سوم۔ قیاس شبہ۔ اس کا اللہ تعالیٰ نے جہاں کہیں بھی قرآن کریم میں ذکر فرمایا ہے۔ کسی قابلِ مدح صورت میں اسکو بیان نہیں فرمایا۔ قیاس شبہ کا استعمال کرنے والے عام طور پر مبطل ورکاذب

ہوتے ہیں۔ سورۂ یوسف میں وارد ہے اِنْ یسرق فقد سرق اخٌ لہٗ من قبل۔ یہاں اصل فرع میں کوئی علت جامع بیان نہیں کی گئی اور نہ ہی دلیل علت میں اجتماع ہے۔ بغیر کسی علت جامع اصل فرع کا حکم ایک گردانا گیا جو کسی عقلمند کے نزدیک قابل قبول نہیں۔ اس کی صورت تو صورت قیاس کی ہے مگر معنیٰ قیاس سے خالی ہے اس قسم کے قیاسات کو قیاس فاسدہ کے ساتھ ملقب کیا جاتا ہے ایک شخص کا دوسرے کے لئے بھائی ہونا اس امر کو نہیں چاہتا کہ جو وصف کمال یا نقص ایک میں پایا جائے وہ خواہ مخواہ دوسرے میں بھی موجود ہو۔ یوسفؑ اور بن یمین کا باہم بھائی ہونا اس کا مقتضی نہیں کہ جو نقص و کمال ایک میں پایا جائے دوسرے میں بھی موجود ہو۔ اسی قیاس شبہ کی بنا پر کفار نے انبیاءؑ کو یہ کہہ دیا مَا نَرٰیكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلُنَا۔ مجرد صورت انسانی اور شکل آدمیت میں شرکت کے باعث انکی نبوّت و رسالت کے منکر بن گئے۔ کیا روزمرّہ کے مشاہدات میں اس قسم کے نظائر و امثال کا مشاہدہ نہیں کیا جاتا۔ کہ ایک ہی گروہ اور فرقے کے بعض لوگ نہایت ہی باکمال ہو کر بام ترقی پر پہنچ جاتے ہیں۔ اور بعض ناقص الفہم کمزور عدیم الاستطاعت نہایت ہی بیکار اور ردّی ہوتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نوع انسانی میں سے کسی فرد کو خلعتِ خلّت سے مشرف فرما کر باعث ہدایت بناوے تو اس میں کون استحالہ و استعجاب ہے۔

ایسا ہی کفار کا دوسرا قول اسی قیاس شبہ کی مثال بن سکتا ہے۔ وقال الذین کفروا وکذبوا بلقاء الاٰخرۃ واترفناھم فی الحیوۃ الدنیا ما ھٰذا الا بشر مثلکم یاکل مما تاکلون منہ ویشرب مما تشربون۔

کفار نے صرف مساوات فی البشریت وخواص بشریت کو مشاہدہ کرتے ہوئے انبیاءؑ کی نبوت و رسالت کا انکار کر دیا۔ ان کی نبوت و رسالت اس امر کو نہیں چاہتی کہ ان سے بشریت و خواص بشریت زائل ہو جائیں۔ نبوت ایک مخصوص تعلق باللہ کا نام ہے۔ جو انسانوں میں سے کسی خاص فرد کے لئے بطور خلعت انعامی طور پر مرحمت فرمایا جاتا ہے۔ کسب و اکتساب سے اسکو کوئی تعلق نہیں نبی کی زندگی تمام لوگوں کی زندگی سے نہایت اعلیٰ و ارفع اور پاکیزہ ہوتی ہے۔ اس کی تعلیم میں جاذبیت خاصہ پائی جاتی ہے۔ جو کسی دوسرے بشر کی تعلیم میں نہیں ہوتی۔ اس کے اخلاق

نہایت ہی پسندیدہ اور سنجیدہ ہوتے ہیں۔ اس کے افعال اور معاملات و امور معاشرتی کا معیار دوسرے لوگوں سے نہایت ہی بلند ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کی صورت صورتِ بشری ہے اور خواص بشری سے بھی وہ متصف ہے مگر اس کے روحانی کمالات و باطنی ترقیات کی کوئی حد و انتہا نہیں۔ ظاہر بیں لوگوں نے صرف قیاس شبہ کی بنا پر ان کی نبوت کا انکار کر دیا۔ جہاں کہیں بھی قرآن کریم میں قیاس شبہ کا استعمال ہوا ہے مذموم رنگ میں اسے پیش کیا گیا ہے۔ فی الحقیقت قیاس کی پہلی دو قسمیں قابل توجہ و التفات ہیں۔ ہمارے علمائے اصول نے اثبات قیاس کیلئے قرآن حکیم کی صرف ایک آیت کو پیش کیا ہے فاعتبروا یا اولی الابصار۔ اگر صرف اسی آیت پر نظر ڈالی جائے، تو بھی قیاس کا اثبات تو ہو سکتا ہے مگر قیاس کی جس قدر اہمیت اور ضرورت ہے وہ ضرور اس بات کی مقتضی ہے کہ اسے متعدد آیات اور مختلف مثالوں سے واضح کیا جائے۔

آیاتِ امثال جس قدر بھی قرآن حکیم میں آئی ہیں یا امم سابقہ کی تخریب و تعمیر کے متعلق جو قصص مذکور ہوئے ہیں وہ سارے کے سارے قیاس کے ثبوت کے لئے شواہد صادقہ و ادلۂ قطعیہ ہیں۔

باوجود اس قدر دلائل پائے جانے کے جن لوگوں نے قیاس صحیح کا انکار کیا ہے انھوں نے غالباً قرآن کریم کی ان آیات یا امثال کو کما ینبغی مطالعہ نہیں فرمایا۔ اس موضوع پر جس قدر بھی لکھا جائے کم ہے۔ مگر بغرض کفایت و خوفِ ملامتِ سامعین اس وقت اسی پر اکتفا کی جاتی ہے۔

جس طرح امثال کے چند نمونے قرآن حکیم سے پیش کئے گئے ہیں اور بہت سے باقی ہیں اسی طور پر احادیث صحیحہ میں بھی امثال کا استعمال فرمایا گیا ہے۔ بلکہ تعبیر رویا بھی فن امثال کا ایک شعبہ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق مرحمت فرمائی تو کسی دوسرے مقالہ میں امثال احادیث و تعبیر رویائے کے متعلق انشاء اللہ ایک مقالہ لکھا جائے گا۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔

مکتبہ جامعہ کی نئی کتابیں

المدنیۃ والاسلام یہ کتاب علامہ مصر محمد فرید وجدی کی مشہور تصنیف ہے۔ از مولوی رشید احمد صاحب انصاری مرحوم، اب مکتبہ جامعہ نے اس کے تمام نسخے مجلد کراکے نہایت نفیس گرد پوشش (DUST COVER) کے باوجود قیمت صرف دو روپے (عہ) کردی ہے۔ المدنیۃ والاسلام میں ثابت کیا گیا ہے کہ اسلامی تمدن اور اصول وقوانین انسانی ترقی کے لئے ایک مفید چیز ہیں۔ قیمت دو روپے عہ

میری کہانی پنڈت جواہر لال نہرو کی آپ بیتی کا اردو ترجمہ ہے۔ انگریزی میں یہ کتاب شائع ہوتے ہی ساٹھ ہزار فروخت ہوگئی، اردو میں ہندوستان کی اور سب زبانوں سے پہلے چھپی ترجمہ نہایت سلیس اور شگفتہ ہے۔ کتاب ایک ہزار صفحات سے زیادہ پر مشتمل ہے بلاک کی چودہ تصویریں ہیں اور دو خوشنما جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ قیمت مکمل مجلد چار روپے (للعہ)

شعلہ و شبنم حضرت جوش ملیح آبادی کی پرجوش اور کیف آور نظموں کا مجموعہ، جو آپ کو آتش کدے کی شعلہ فشانیوں، اسلامی شان وحریت کے خون کھولا دینے والے واقعات، بادۂ سرجوش کی سرمستیوں اور گلبانگ فطرت کے روح پرور نغموں سے لطف اندوز ہونے کا موقع دے گا۔ شاعر انقلاب کا یہ لافانی شاہکار غیر مطبوعہ کلام سے مرصع ہے۔ کتاب مجلد ہے۔ اور نہایت خوشنما گرد پوشش سے آراستہ ہے۔ قیمت صرف تین روپے (عہ)

تاریخ فلسفۂ اسلام مشہور جرمن فلسفی۔ ٹ، ج، دی بوئر کی مقتدر تصنیف کا اردو ترجمہ از جناب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی، یہ کتاب اب کچھ ترمیم و اضافے اور نظر ثانی کے بعد چھوٹے سائز پر نہایت خوشنما جلد کے ساتھ شائع کی گئی ہے اس میں اسلامی فلسفے کی نشوونما، یونانی عربی علوم، فلسفہ فطرت، یونانی و اسلامی حکما، مشرق میں فلسفے کا انحطاط وغیرہ پر کار آمد مباحث۔ قیمت دو روپے

پستالوزی از ڈاکٹر قاضی عبدالحمید صاحب بی اے (جامعہ)، ایم اے، پی ایچ ڈی، برلن۔ پستالوزی نے تعلیم کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ اس کتاب میں پستالوزی کی زندگی اس کے فلسفہ، ترقی اس کے تعلیمی نظر اور تعلیمی کارنامے اور ان کی تفصیل سلیس زبان اور دلکش انداز بیان میں ملاحظہ فرمائیے

قیمت مجلد عہ

درس ادب اگر بود زمزمۂ محبتے ٭ جمعہ بہ مکتب آورد طفل گریز پائے را

مکتبہ جامعہ قرولباغ، نئی دہلی

تاریخ الامّت

ابتدائے رسالت سے آخر زمانہ خلافت عثمانیہ تک تمام ضروری معلومات اور مسلمانوں کے کارناموں کا ذکر نہایت سلیس اور دلچسپ عبارت میں کیا گیا ہے۔

اسلامی تاریخ کا یہ سلسلہ مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری نے بڑی جانفشانی اور تحقیق سے مرتب فرمایا ہے ملک کی متعدد یونیورسٹیوں اور کالجوں میں داخل نصاب ہے۔ بالخصوص ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے طلبار کے لئے نہایت مفید ہے طباعت وکتابت نہایت عمدہ۔

حصہ اول	سیرۃ الرسولؐ	قیمت	عہ	مجلد	عمہ
حصہ دوم	خلافت راشدہ	قیمت	عار	"	عگہ
حصہ سوم	خلافت بنی امیہ	قیمت	عمہ	"	عمہ
حصہ چہارم	خلافت عباسیہ	قیمت	عار	"	عگہ
حصہ پنجم	عباسیہ بغداد	قیمت	عار	"	عگہ
حصہ ششم	عباسیہ مصر	قیمت	عار	"	عگہ
حصہ ہفتم	خلافت عثمانیہ	قیمت	عہ	"	عمہ

نوٹ۔ جو صاحب یہ مکمل سلسلہ بہ یک وقت طلب فرمائیں گے ان کو پوراسٹ مجلد پیش کیا جائے گا۔ اور قیمت غیر مجلد کی لی جائے گی۔ جلدیں نہایت اہتمام کے ساتھ اچھے مضبوط کپڑے کی تیار کرائی گئی ہیں جس پر کتاب اور مکتبہ جامعہ کا نام بلاک سے چھپوایا گیا ہے۔ جلد پر ایک خوشنما کاغذ کا کور ہے۔ اس کی طباعت بھی بلاکوں سے کی گئی ہے۔

حصص اول و دوم طلبار کی ضروریات کے خیال سے چھوٹے سائز پر بھی شائع کئے ہیں اور ان کی قیمت ہر ایک کی ایک ایک روپیہ ہے۔

جامعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

بسم اللہ

جامعہ

زیر ادارت ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ ڈی

نمبر ۴	اپریل ۱۹۳۷ء	جلد ۲۷

فہرست مضامین

۱	ہمارے مدارس میں تاریخ ہند کی تعلیم	ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب استاذ جامعہ عثمانیہ	۱۵۹
۲	روسو	پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے آکسن استاذ جامعہ	۱۷۱
۳	رفتار عالم	....	۱۹۷
۴	التفہیمات الالٰہیہ	مولانا اسلم جیراج پوری	۲۰۲

ضمیمہ۔ جدید دستور کا خاکہ ..... از ۱ تا ۳۰

قیمت سالانہ صہ   فی پرچہ ۸ر

پرنٹر پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) نے محبوب المطابع برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا

ہماری متعدد فہرستیں

مکتبہ جامعہ نے اپنے زبردست ذخیرے کی فہرستیں ایک خاص نوعیت سے علیحدہ علیحدہ شایع کی ہیں جو حضرات جس خاص مضمون یا شعبے سے دلچسپی رکھتے ہوں، از راہِ کرم مطلع فرمائیں مطبوعہ فہرست فوراً حاضر کی جائے گی۔ چند فہرستوں کے نام درج ذیل ہیں:۔

(۱) مطبوعاتِ جامعہ۔ جامعہ کی شائع کردہ اور سول ایجنسی کی کتابوں کی مکمل فہرست۔

(۲) ناشرینِ اُردو۔ جامعہ کے علاوہ اُردو کتابوں کے تمام ناشرین کی فہرستوں کا مجموعہ۔

(۳) مصنفینِ اُردو۔ مشہور مصنفین، مترجمین و مولفین اُردو کی کتابوں کی فہرست۔

(۴) بچوں کی کتابیں۔ بچوں کے لئے اُردو کی کتابوں کی فہرست۔

(۵) عورتوں کی کتابیں۔ عورتوں اور بچیوں کے لئے پسندیدہ کتابیں۔

(۶) مختصر فہرست کتب۔ کتب اُردو کی تقریباً ایک ہزار مشہور کتابوں کی فہرست۔

(۷) ادبی کتابیں۔ تاریخ و تنقیدِ ادب، مقالات و انشا، ناول، افسانہ، نظم، ڈراما، مکاتیب، ظرافت وغیرہ پر اُردو کتابوں کی مکمل فہرست۔

(۸) مذہبی کتابیں۔ ڈھائی سو منتخب مذہبی کتابوں کی فہرست۔

(۹) تاریخی کتابیں۔ پانچسو منتخب تاریخی کتابوں کی فہرست۔

(۱۰) اجتماعیات، سیاسیات، معاشیات، تعلیم، فلسفہ، منطق، نفسیات، اخلاقیات، طبیعات، کیمیا، طب، حفظانِ صحت، زراعت اور صنعت و حرفت پر اُردو کی تمام کتابوں کی مکمل فہرست زیرِ طبع ہے۔ عنقریب شایع ہوگی۔

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

ہمارے مدارس میں تاریخ ہند کی تعلیم

اس زمانے کے ایک مشہور فلسفی مورخ کروچے کا خیال ہے کہ ماضی کی تاریخ بڑی حد تک حال کی تاریخ سے عبارت ہوتی ہے۔ اسی خیال کو ہمارے الہامی شاعر غالب نے کس خوبی اور لطف سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے :-

بنام و آئینہ حرف جم و سکندر چیست
کہ ہر چہ رفت بہر عہد در زمانہ تست

یہ تاریخی حقایق کو سمجھنے کا خالص موضوعی (SUBJECTIVE) نقطہ نظر ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ تاریخ کی حیثیت محض آرٹ کی رہ جاتی ہے جسے معروضی (OBJECTIVE) حقایق سے زیادہ ذہن انسانی کی کارفرمائی سے تعلق ہے۔ لیکن کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ معروضی حقایق کی طرف سے آنکھ بند کر کے تاریخ کو افسانوی حیثیت دیدی جائے۔ دراصل تاریخ کی تحقیق میں موضوعی اور معروضی دونوں طریقے استعمال ہونے چاہئیں۔ جس طرح ماضی حال سے بالکل علیحدہ نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے اندر مضمر رہتا ہے اسی طرح مورخ مجرد حقایق کا تصور بغیر اپنی ذہنی کیفیات کے دخل کے نہیں کر سکتا۔ لیکن باوجود آرٹ ہونے کے تاریخ بعض اٹل قوانین کی پابند ہوتی ہے۔ وہ قوانین ویسے ہی اٹل ہوتے ہیں جیسے طبیعات کے قوانین چونکہ تاریخ کا موضوع بحث انسانی اجتماعی زندگی کا نشیب و فراز ہے اسواسطے اس کے قوانین بھی انسانی اور اخلاقی حیثیت رکھتے ہیں۔ قوموں کا عروج و زوال، بعض گروہوں کا ابھرنا اور بڑھنا اور دوسروں کا گرنا اور گھٹنا ایسے اجتماعی مظاہر ہیں جن کی توجیہ اخلاقی قوانین کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ کیا یہ یوں ہی بغیر کسی سبب کے ہے کہ بعض اقوام کو تمدن کی سربراہی اور سرفرازی ملتی ہے اور دوسرے ان کا تتبع کرنے پر مجبور ہوتے ہیں ؟ ۔ نہیں، ان اجتماعی مظاہر کے قوانین ہونے چاہئیں اور ہیں۔ مورخ کا فرض ہے کہ ان کی

تحقیق کرے اور انھیں اجاگر کرے۔ موضوعی اور استخراجی طریق تحقیق کے یہ معنی ہرگز نہ سمجھے جائیں کہ ہر شخص کو اختیار ہے کہ جس طرح چاہے واقعات کی توجیہ کرے۔ اس کے لئے بھی بعض کلیات کی پابندی ضرور ہوگی ورنہ ذہنی نراج کا خطرہ ہے۔

۴۔ واقعات کی توجیہ اور ان کی چھان بین نہایت مشکل کام ہے جس کے لئے خاص سلیقہ کی ضرورت ہے۔ مورخ کو اس میں بڑی دشواری پیش آتی ہے کہ وہ واقعات کے انبار میں سے کیا چنے اور کیا چھوڑے اور کس واقعہ کو زیادہ اہمیت دے اور کس کو کم۔ بالخصوص ہندوستان جیسے ملک کی تاریخ میں یہ کام اور زیادہ دشوار ہو جاتا ہے اس لئے کہ یہاں کی تاریخ مختلف نسلوں، قبیلوں، مذہبوں اور تہذیبوں کے باہمی تصادم و تعاون کا نتیجہ ہے۔[۴۷] سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تاریخ ہند میں ہم اہم اور غیراہم کا فیصلہ کس اصول پر کریں؟ ظاہر ہے کہ اس اصول کے انتخاب میں مورخ کی ذاتی رائے اور اس کے ذہنی رجحان کا رنگ غالب آجائے گا۔ ہمارے نزدیک اشخاص کو زیادہ اہمیت حاصل ہونی چاہیئے یا مجرد واقعات کو؟ یہ سوال بھی بہت مشکل ہے۔[۴۸] تاریخ ہند کا ہر محقق جانتا ہے کہ اس ملک کے نشو و نما میں بادشاہوں، سرداروں، مدبروں اور مہاتماؤں سب ہی نے حصہ لیا ہے۔ اس لئے مجرد واقعات کو بغیر اشخاص کے حالات معلوم کئے سمجھنا ناممکن ہے۔[۴۹] تاریخی واقعات اشخاص ہی کی تخلیقی کوششوں سے پیدا ہوتے ہیں، ان ہی کی مساعی سے زمانہ کی رفتار پلٹتی ہے اور اجتماعی جسم میں اشخاص ہی کا نفسِ گرم زندگی کی نئی روح پھونکتا ہے۔[۵۰] میں روح عصر کا منکر نہیں جو اشخاص کو اپنے مقاصد کا آلۂ کار بناتی ہے لیکن اس کے تسلیم کرنے سے خود اشخاص کی اہمیت مورخ کے لئے کسی طرح بھی کم نہیں ہو جاتی۔ اشخاص تاریخ میں نشان منزل کا کام دیتے ہیں۔ بغیر ان کے تاریخی واقعات کا انبار طالب علم کے لئے بے معنی چیز ہے۔

۴۔ بعض اوقات جماعتیں اور گروہ اپنے مخصوص مفاد کے تحفظ کے لئے غلط واقعات کو حقائق تسلیم کرکے ان کی توجیہ سے اپنی اغراض وابستہ کر لیتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل ہمارے مدارس میں انگریزوں کی لکھی ہوئی تاریخیں پڑھائی جاتی تھیں جو حکمِ ان طبقہ کے مخصوص نقطۂ نظر سے لکھی گئی تھیں۔ مثلاً ہماری

تاریخوں میں کلکتہ کی "کالی کوٹھری" کا واقعہ عام طور پر ملتا ہے۔ جدید معروضی تحقیق نے پورے طور پر ثابت کر دیا ہے کہ یہ واقعہ غلط ہے۔ لیکن ابتدائی انگریزی استعماریت کو اس ملک میں اپنی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے اس قسم کے افسانوں کو باور کرانا اور ان کی نشر و اشاعت کرنا ضروری تھا تاکہ ہندوستان آنے والے انگریزوں کی قومی عصبیت کمزور نہ ہونے پائے۔ اسی طرح انگریزوں کی لکھی ہوئی تاریخوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کی کشیدگی کو بہ نسبت ہم آہنگی کے زیادہ اجاگر کر کے دکھایا گیا ہے۔ یہ بات بھی محض اتفاقیہ نہیں ہے بلکہ اس کی تہ میں شہنشاہی مقاصد کام کر رہے ہیں۔ غرضکہ تاریخ ہند میں ان سب باتوں نے اس لئے راہ پائی کہ معروضی حقایق سے دیدہ و دانستہ چشم پوشی کی گئی اور رائے یا خواہش کو حقیقت سمجھ لیا گیا۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ تاریخ ہند لکھنے والے کو، دنیا کے کسی دوسرے ملک کی تاریخ لکھنے والے کی طرح، یہ دشواری پیش آتی ہے کہ ایک واقعہ کی اس کو مختلف شہادتیں ملتی ہیں جو آپس میں متضاد ہوتی ہیں۔ اس وقت اس کا یہ فرض ہے کہ نہایت دیانتداری کے ساتھ چھان بین سے کام لے اور عام حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے حتی المقدور معروضی حقایق کی بنا پر اپنے نتائج اخذ کرے۔[26] تاریخ کا بہترین طریقہ تحقیق وہ ہے جس میں معروضی اور موضوعی دونوں طریقوں سے کام لیا جائے۔ جس طرح موضوعی تاریخ میں خیالی واقعات کے راہ پانے کا اندیشہ ہے وہاں معروضی تاریخ میں یہ خطرہ مضمر رہتا ہے کہ خشک اور ایک دوسرے سے بے تعلق واقعات ساری بحث کو بے معنی نہ بنا دیں جن میں زندگی کا ربط و اتحاد نام کو نہ ہو۔ بلاشبہ تاریخ کی بنیاد معروضی حقایق ہیں جو عالم وجود میں آچکے ہیں لیکن ان کی تاویل و توجیہ میں موضوعی طریقۂ تحقیق سے کام لئے بغیر چارہ نہیں۔ انسانی حقایق کو اسی وقت سمجھا جا سکتا ہے جبکہ انھیں کسی نقطۂ نظر سے خاص تصورات کے تحت سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ یا یوں کہئے کہ تاریخ میں کوئی نہ کوئی انسانی مقصد پوشیدہ رہنا چاہئے۔

بدقسمتی سے ہمارے مدارس میں جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں وہ زیادہ تر واقعات و سنین کا ایک بے ربط انبار ہوتی ہیں۔ ان میں کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ طالب علم ہر واقعہ کو اس کے پس منظر سے علیحدہ کر کے اپنے تصور میں جگہ دیتا ہے۔ استاد کا فرض ہے کہ وہ بتائے کہ اجتماعی زندگی کے مختلف

واقعات میں ایک طرح کا ربط پنہانی پایا جاتا ہے۔ ان کے اسباب و علل پر اگر غور کیا جائے تو وہ سب ایک زنجیر کی کڑیاں نظر آئیں گی۔ ان ہی واقعات کے تار و پود سے جسدِ قومی کی تشکیل عمل میں آتی ہے۔ انھیں ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم اپنی زندگی میں رخنوں کو راہ دے رہے ہیں۔

تاریخ ہند کی ہندو، مسلم اور برطانوی عہدوں میں جو تقسیم کی گئی ہے وہ جدید تاریخی نقطۂ نظر سے صحیح نہیں۔ اس کے بجائے قدیم، متوسط اور عہد جدید کی تقسیم بہتر ہے تاکہ طالب علم کے ذہن میں زمانے کا تصور فرقہ دارانہ یا نسلی تعصب کے ساتھ نہ پیدا ہو۔ زمانے کی ادواری تقسیم مورخ کی خود اختیاری ہوتی ہے اس واسطے کہ قطعی تقسیم تو محال ہے۔ مثلاً آپ کوئی لمحہ یا تاریخ ایسی نہیں بتا سکتے جس وقت سے کہ ہندوستان میں انگریزی راج شروع ہوا۔ بالعموم ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی یا ۱۷۶۴ء کی جنگ بکسر کے بعد سے برطانوی عہد کو شروع کرتے ہیں۔ حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ یہ دونوں متذکرہ بالا تاریخی اتفاق اس تاریخی رجحان کے مظاہر ہیں جو بہت پہلے سے ہندوستان میں موجود تھا اور جو ان واقعات کے بعد سے زیادہ شدید اور قوی ہو گیا۔ اسی طرح اسلامی عہد کی تاریخ کا آغاز محمود غزنوی کے حملوں سے ہونا چاہئے یا ۱۲۰۶ء سے جبکہ قطب الدین ایبک نے دلی میں ایک مرکزی حکومت کی بنا ڈالی اور اسلامی ہند کی سیاست کو عملی حیثیت سے بیرونی اثرات سے آزاد کرایا۔ بہرحال زمانے کی تقسیم سے مطالعہ میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے اس واسطے کہ ماضی کی گرفت کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کے ٹکڑے کر دئے جائیں۔ ازمنۂ وسطیٰ کا نام سنتے ہی ہمارے ذہن میں معاً ایک ایسا جامع تصور آ جاتا ہے جو اس زمانے کی پوری حیات اجتماعی پر حاوی ہوتا ہے۔ جاگیر داری، کلیا، اور تمدن و معاشرت کی ایک جیتی جاگتی تصویر زندگی کے سارے خط و خال کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ ادوار کی تقسیم دراصل تاریخ میں نشان منزل کی حیثیت رکھتی ہے۔ زندگی میں یکایک تغیرات پیدا نہیں ہوتے۔ ہاں، اہم رجحانات پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کی نشان دہی طالب علم کو کرانا ضروری ہے تاکہ وہ واقعات کے تانے بانے کا کھوج لگا سکے۔ جس طرح انفرادی تجربات کے نقوش انسان کے حافظہ میں محفوظ رہتے ہیں اسی طرح اجتماعی اعمال کے نقوش زمانہ کے بے قلم سے قرطاس تاریخ پر بنائے جاتے ہیں۔ ایک طرف

اجتماعی زندگی کے رجحان اور دوسری طرف اشخاص کی قوت ارادی کی کارفرمائی ان نقوش کے لئے رنگ و روغن کا کام دیتے ہیں۔

ہر زمانے کی تاریخ نویسی کا ایک مخصوص انداز ہوتا ہے۔ آج کل تاریخ کا مطمح نظر محلات کی سازشوں، جانشینی کے جھگڑوں اور لشکروں کی نقل و حرکت کی تفصیلات کے ماسوا اور بھی کچھ ہے۔ اب لشکرگاہوں کی شان و شوکت سے زیادہ عوام الناس کی زندگی کی طرف مورخ توجہ کرتا ہے اس لئے کہ اسے سمجھے بغیر کسی گروہ کی سیاست، معاشرت یا اقتصادی نظام کا آپ پتہ نہیں لگا سکتے۔ تاریخ ہند میں بھی اس کی ضرورت ہے کہ قومی نظم و تربیت اور تہذیب و تمدن کو بہ نسبت آلوں اور لشکرکشیوں کی زیادہ اہمیت دی جائے۔ دراصل اس وقت ہم تاریخ کو جس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں چند صدی قبل کا مورخ اس نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ ہمارے اخلاقی اور ذہنی معیار بہت کچھ بدل گئے ہیں۔ ہم اگلے زمانے کی تاریخ نویسوں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ بہت ہی معمولی اور جزوی باتوں پر تو صفحے کے صفحے سیاہ کر ڈالتے ہیں لیکن اپنے زمانے کے طور طریقوں، صنائع اور فنون اور تمدن و معاشرت کے متعلق کچھ نہیں لکھتے۔ لیکن اگر ہم غور کریں تو معلوم ہو کہ ہم جن واقعات کی تفصیل کی پرانے مورخوں سے توقع کرتے ہیں وہ بیجا ہے۔ دراصل ہماری یہ توقع عکس ہے ہماری اپنی زندگی کا۔ ہمارے زمانے میں اجتماعی زندگی نے انفرادی زندگی پر بہت زیادہ اہمیت حاصل کر لی ہے۔ آج معاشرہ کو خود اپنے وجود کا احساس ہو گیا ہے۔ آج کسی ایک فرد کی زندگی، چاہے وہ فرد کتنا ہی ذی مرتبہ کیوں نہ ہو قومی تاریخ سے عبارت نہیں ہو سکتی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ قومی تاریخ کے ایک کسی گوشہ کو وہ اجاگر کر سکتی ہے۔

ہمارے مدارس کی مروجہ تاریخوں میں تصادم اور جنگوں کا اس کثرت سے ذکر ہوتا ہے کہ طالب العلم کے ذہن و حافظہ میں سوائے ان کے اور کوئی نقوش مشکل ہی سے باقی رہ سکتے ہیں۔ ہماری تاریخوں سے بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتے رہتے۔ امن کے مشاغل گویا اس ملک میں کبھی پنپے ہی نہیں۔ لیکن یہ سراسر غلط ہے۔ جنگ اگرچہ ایک تلخ اور ناگزیر حقیقت ہے لیکن تاریخ صرف اسی سے عبارت نہیں ہو سکتی۔ بالخصوص ہندوستان کی عہد وسطیٰ کی تاریخ میں سوائے جنگوں کے اور کچھ

طالب علم کو بتایا ہی نہیں جاتا ۔ بلاشبہ مسلمانوں نے ہندوستان میں فتوحات حاصل کیں ۔ لیکن اس کے ساتھ انھوں نے اس ملک کو اپنا وطن بنایا ۔ اس کی خاطر اپنا خون بہایا ۔ اس ملک کے عام مزاج میں ایک مستحکم مرکزی حکومت قایم کی ۔ یہ سب حال ہمیں مروجہ تاریخوں میں نہیں ملتا ۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اشوک اعظم کے بعد مسلمانوں ہی کی بدولت ہندوستان کو سیاسی وحدت نصیب ہوئی ۔ انھوں نے یہاں ایک بین ہندی تمدن کی بنا ڈالی اور ایک بین ہندی زبان نے ان ہی [illegible] نشو ونما پائی جو آج ہماری قومی زبان کہلاتی ہے ۔ نظم ونسق اور فنون وصنائع کے ہر شعبہ میں ان کی وجہ سے ترقی ہوئی ۔ ان کی بدولت اس ملک کی اجتماعی زندگی کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا اور ہندوستان دنیا کے اہل کمال کا مرکز بن گیا ان ہی کے توسط سے ہندوستان نے دنیا کے اور دوسرے ممالک کے ساتھ روابط استوار کئے ۔ یہ سب باتیں ہمارے طالب علم کو معلوم ہونی چاہئیں لیکن ہماری تاریخوں میں ان کا ذکر تو بالکل نہیں ملتا اور اگر ملتا ہے تو نہایت اجمال سے ۔

میں نے ابھی اس امر کی طرف اشارہ کیا تھا کہ ہماری تاریخ ایک بے مقصد تاریخ ہے ۔ اس بے مقصدی کی وجہ سے ہماری تاریخ کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی اُکھڑی اُکھڑی باتیں کرے جن میں ربط نہ ہو اور یہ بھی پتہ نہ چلے کہ آخر گفتگو کرنے والا کہنا کیا چاہتا ہے ۔ یورپ کے مدارس میں جو تاریخ پڑھائی جاتی ہیں ان میں کوئی نہ کوئی اجتماعی مقصد ضرور پیش نظر رکھا جاتا ہے ۔ تاریخ کے ذریعہ سے ہر مملکتیں اپنی آئندہ نسلوں کو قومی ذمہ داریوں کے لئے تیار کرتی ہیں ۔ اگر حقایق کو پس پشت نہ ڈالا تو میرے خیال میں اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ آپ اپنے نوجوانوں کے سامنے قومی ضروریات مصالح کے تحت ایک خاص مطمح نظر پیش کریں ۔ دراصل ہمارے ملک کی تاریخ میں متحدہ قومیت کا تخیل کرنا مورخ کے لئے بہت ضروری ہے ۔ اتحاد و یکجہتی کے جو رجحان ہماری ازمنۂ وسطیٰ و زمانہ حال کی میں ملتے ہیں ان کو اجاگر کرکے دکھانا چاہئے ۔ لیکن یہ کام نہایت دشوار ہے اور اس کے لئے بڑے سا ضرورت ہے ۔ تاریخ کا کام یہ نہیں کہ وہ کسی خاص مسلک یا نقطۂ نظر کا پروپگنڈا کرے ۔ اپنے خیال کو کرنے میں اسی لئے مورخ کو بڑی احتیاط لازم ہے ۔ جتنی زیادہ اس کی نظر وسیع ہوگی اتنا ہی ا

اس کا سلیقہ حاصل ہوگا کہ وہ تعمیری تصورات کو جو قومی زندگی کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کو فروغ دینے میں مدد و معاون ہوتے ہیں، نوجوانوں کے سامنے پیش کر سکے۔

ہندوستان کی تاریخ میں مرکز پسند اور مرکز گریز قوتوں کا تعامل ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ دونوں قوتیں ہماری اجتماعی زندگی میں شروع سے آج تک برابر کارفرما رہی ہیں اور دونوں کے [illegible] نہایت اہم مقاصد رہے ہیں۔ ان قوتوں کی توجیہ کے ذریعہ ہم بعض نہایت پیچیدہ تاریخی مسائل کو علمی حیثیت سے سلجھا سکتے ہیں۔ مثلاً اشوک اعظم کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے سیاسی حیثیت سے مرکز گریز قوتوں کو کمزور کرکے سارے ہندوستان کو سیاسی وحدت میں منسلک کیا اور اس کے ساتھ بدھ مت کے ذریعہ مذہب و معاشرت کی مرکز گریز قوتوں کا خاتمہ کیا۔ معاشری اعتبار سے برہمنیت ایک مرکز گریز قوت ہے اس لئے کہ وہ معاشرہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتی ہے اور ذاتوں میں اس کو تقسیم کر دیتی ہے۔ بدھ مت کے انسانی مساوات کے اصول کو ہم مرکز پسند قوت سے تعبیر کریں گے۔ مسلمانوں کے زمانے میں سیاسی حیثیت سے مرکز پسند قوتوں کو فروغ حاصل ہوا لیکن چونکہ انھوں نے اس ملک کے لوگوں کے مذہبی و معاشری معاملات میں دخل اندازی نہیں کی اس لئے معاشری اعتبار سے مرکز گریز قوتوں کو نشو و نما پانے کا پورا موقع ملا۔ کم و بیش ہمارے عہد جدید کی تاریخ میں بھی آپ یہی حالت پائیں گے۔ اگرچہ مسلمانوں کے زمانے میں ہندو سماج میں بعض ایسی معاشری تحریکیں وجود میں آئیں جو سماج میں ہم آہنگی قایم کرنا چاہتی تھیں لیکن پورے طور پر انھیں کامیابی نصیب نہ ہوئی۔

تاریخ ہند میں آپ نے اکثر پڑھا ہوگا کہ اورنگ زیب اچھا حکمراں نہیں تھا یا یہ کہ سیواجی اچھا شخص تھا یا برا حکمراں تھا۔ لیکن اس قسم کی رائے کا اظہار میرے خیال میں ذہنی تنگ نظری پر دلالت کرتا ہے۔ ہم اپنی رائے کے اظہار میں اکثر اپنے تعصب کو راہ دیدیتے ہیں۔ اس خصوص میں اگر ہم واقعات کا علمی تجزیہ کریں تو دیکھیں گے کہ ہماری قومی زندگی کی وسعت اورنگ زیب اور سیواجی دونوں کو امتیازی اور موزوں جگہ دینے کو تیار ہے۔ اورنگ زیب نے سوائے اس کے کیا کیا کہ اس نے سارے

ہندوستان کو ایک سیاسی وحدت کے تحت لانے کے لئے اپنی پوری عمر صرف کردی - وہ ہندوستان کی اجتماعی زندگی کے اس پرانے مرض کا علاج کرنا چاہتا تھا جس کی وجہ سے ہمارے ملک کو صدیوں دوسروں کی غلامی برداشت کرنا پڑی - ہندوستان کو وہ اسی قدر اپنا وطن سمجھتا تھا جتنا کہ کوئی دوسرا سمجھ سکتا ہے - اس کی سرحدی حکمت عملی کا اگر مطالعہ کیا جائے تو بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اس نے ہندوستان کی حفاظت کے لئے جو تدابیر اختیار کیں وہ کس قدر دور اندیشی پر مبنی تھیں - اس نے یوسف زئیوں کی بغاوت کو اسی سختی سے فرو کیا جس طرح وہ دکن کی مرکز گریز مرہٹہ قوت کے ساتھ پیش آیا - اس باب میں اس نے ہندو اور مسلمان کا کوئی فرق نہیں کیا -

جغرافی حیثیت سے ہمارے ملک کے لئے یہ مقدر ہو چکا ہے کہ ہم ایک سیاسی وحدت کے سایہ میں زندگی بسر کریں - ہماری تاریخ میں عروج کا زمانہ وہی ہوا ہے جبکہ ایک سیاسی مرکزی نظام ملک کے مختلف گوشوں میں یکسانیت کے ساتھ موثر ہوا - اس اعتبار سے اورنگ زیب کو ہماری تاریخ میں وہی رتبہ ملنا چاہیئے جس کا وہ مستحق ہے - اگر ہم تاریخی شواہد کی روشنی میں اس کی سیرت کے خط و خال کو دیکھیں تو صاف طور پر معلوم ہو جائے گا کہ اس پر تعصب کا الزام ایک غلط اور بے بنیاد اتہام ہے - وہ ان لوگوں میں سے تھا جو مملکت کے ساتھ اپنی زندگی کو وابستہ کر لیتے ہیں اور اس کے مفاد کی راہ میں جو نظر آئے اُسے بلا تامل ہٹا دیتے ہیں اس میں یہ نہیں دیکھتے کہ ان کی راہ میں آنے والا کس مذہب سے تعلق رکھتا ہے اور نہ یہ دیکھتے ہیں کہ وہ اجنبی ہے یا قرابت دار - اس نے راجپوتانہ کے راجاؤں کا مقابلہ اسی طرح کیا جبکہ وہ مرکزی حکومت سے اپنا رشتہ توڑ لینا چاہتے تھے جس طرح دکن کے سلاطین کا - اس کے سامنے بس ایک نقطۂ نظر تھا وہ سب کچھ کرنے میں مطلق پس و پیش نہ کیا جسے عام طور پر مروجہ اخلاق کے معیار کے خلاف تصور کیا جائے گا لیکن وہ جن کے ہاتھوں میں قوموں کی زندگی کی باگ ہوتی ہے ان کا اخلاق ایک شخصی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور ان کے نصب العین کو مروجہ معیار سے جانچنا درست نہیں - اس کے خطوط کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے اپنے مقاصد میں کس بلا کا انہماک تھا - اس کی زندگی بے لوث، سادگی اور پاکبازی کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کرتی ہے جس کے متعلق ہمارے نوجوانوں کو علم ہونا چاہیئے -

اسی طرح سے سیواجی کی زندگی بھی ایک خاص مقصد کی ترجمان تھی۔ جس طرح ہماری قومی زندگی میں یہ ضروری ہے کہ سیاسی مرکزیت کا نصب العین ہمارے سامنے رہے اس طرح یہ بھی ضروری ہے کہ ہماری مقامی آزادیاں برقرار رہیں۔ سیاسی مرکزیت مشترک مفاد کے لئے ہونی چاہیئے اور اس کے ساتھ مقامی گروہوں کو اپنی زندگی کی تشکیل کی پوری آزادی ہونی چاہیئے۔ سیواجی نے مقامی آزادی کے نصب العین کی ترجمانی کی اور مقامی خصوصیات کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ دراصل اس ملک کا مفاد یہی ہے کہ مرکز گریز اور مرکز پسند قوتوں کے باہمی تعامل و امتزاج سے ایک ایسی معتدل صورت حال پیدا ہو جو اس ملک کی اجتماعی زندگی کے لئے قابل قبول ہو۔ ہمارا ملک یورپ کے ممالک کی طرح اتنا چھوٹا نہیں کہ یہاں کی مقامی خصوصیات کو پس پشت ڈال دیا جائے۔ یہ دراصل ایک براعظم ہے۔ اور باوجود اس امر کے کہ جغرافی اور تہذیبی عناصر اس ملک کے ہر گوشہ کو ایک مرکز کے ساتھ وابستہ کرنا چاہتے ہیں لیکن مقامی خصائص قومی زندگی کے تانے بانے میں ایسے پیوست ہیں کہ انھیں دبانا ناممکن ہے۔

تاریخ ہند کے مختلف ادوار میں جن گروہوں نے فوقیت حاصل کی اس کی توجیہ اس طور پر کرنا چاہیئے کہ ہماری آبادی کے مختلف عناصر میں سے کسی کو وہ ناگوار نہ گذرے۔ ہماری قومی زندگی میں مختلف گروہوں کے توسط سے نیا خون مختلف زمانوں میں آتا رہا۔ ان گروہوں کی فوقیت کے اسباب تاریخی قوانین کے تحت بیان ہونے چاہئیں۔ گروہوں کی فوقیت کے اسباب میں سے ایک سبب ان کے طریق جنگ کی برتری ہوتا ہے۔ آپ قدیم زمانے سے آج تک کی تاریخ پر ایک نظر ڈال جائیے۔ اس حقیقت کے بہت سے ثبوت آپ کو ملیں گے۔ سکندر اور پورس کی جنگ میں اور اسی طرح عہد اسلامی اور عہد جدید کی جنگوں میں آپ دیکھیں گے کہ کامیاب گروہ کا طریق جنگ مفتوح کے طریق جنگ کے مقابلے میں اعلیٰ اور زیادہ سائنٹفک تھا عہد حالیہ اور عہد متوسط کی بعض جنگوں کی تفصیلات ہمارے پاس موجود ہیں۔ ۱۵۷۰ء میں عادل شاہیوں اور نظام شاہیوں کی متحدہ دو لاکھ کی جمعیت نے گوا کا محاصرہ کیا۔ یہ محاصرہ دس مہینے تک برابر جاری رہا۔ لیکن صرف چار ہزار پرتگالیوں نے اس بڑے لشکر کی ایک نہ چلنے دی اور بالآخر اس پر مجبور کیا کہ محاصرہ اٹھا لیا جائے۔ اس محاصرہ میں جدید فوجی نظم و انضباط کا مقابلہ قدیم طرز کی افواج سے ہوا اور دس ماہ کی

کوشش اور تعداد سپاہ کی زیادتی کے باوجود قدیم کو جدید پر کامیابی نہیں ہوئی۔ یہ واقعہ ہمارے اس زمانے کے فرمانرواؤں کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی تھا۔ پرتگالی لوگ بھی انسان تھے اس ملک میں اجنبی تھے اور محصور ہونے کے باوجود اپنے طریق جنگ کی برتری کے سبب سے کامیاب رہے۔ میں اپنے مطلب کو ایک اور دوسری مثال سے واضح کردوں۔ کرناٹک کے نواب انورالدین خاں اور فرانسیسیوں میں ۱۷۴۶ء میں جب ناچاقی ہوئی تو نواب موصوف نے اپنے بڑے لڑکے محفوظ علی خاں کی ماتحتی میں ۱۰ ہزار کا لشکر سازوسامان سے آراستہ کرکے فرانسیسیوں کے خلاف روانہ کیا۔ فرانسیسی فوج کی تعداد بہت کم تھی لیکن باوجود اس کے اس نے نواب کی فوج کے مقابلے میں کامیابی حاصل کی اور اسے پسپا ہونے پر مجبور کیا۔ اس کامیابی سے ڈوپلے کو چند باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ اگر یورپین فوج تھوڑی سی بھی ہو اور جدید نظم و انضباط کے اصولوں سے واقف ہو تو ہندوستانیوں کے ٹڈی دل لشکر پر بھاری رہے گی۔ اس سے بھی بڑھ کر اس نے یہ بات معلوم کی کہ اہلِ ہند کو اگر یورپین طریق جنگ کی مشق کرائی جائے تو کچھ عرصے میں اپنی ذہانت سے یہ لوگ خود اہلِ یورپ کے مثل جنگ کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ ان دونوں باتوں سے بڑھ کر اس کو یہ معلوم ہوا کہ اہلِ ہند کا کوئی اصول وفاداری نہیں۔ انھیں بدیسی قوت سے تعاون عمل کرکے خود اپنے اہلِ وطن کے خلاف تلوار اٹھانے میں کوئی باک نہیں۔ اس پر ہمیں تعجب نہ کرنا چاہیئے کہ ایک اجنبی شخص نے ہماری نفسیاتی حالت کو ہم سے بہتر سمجھا۔ ہماری تاریخ کا یہ وہ زمانہ ہے جبکہ زندگی کی تمام اعلیٰ قدریں نامرادی کے ہاتھوں مسمار ہو چکی تھیں۔ کسی قسم کی وفاداری کا جذبہ لوگوں کے دلوں میں باقی نہیں رہا تھا۔ ملک کے ہر گوشہ میں بدامنی اور نراج کا دور دورہ تھا۔ زبردست کمزوروں پر ظلم کرنے اور استحصال بالجبر اور زیادہ ستانی میں مطلق تامل نہیں کرتے تھے۔ وفاداری کا نرم و نازک پودا وہیں نشوونما پاتا ہے جہاں عدل و انصاف کی سازگار فضا اسے میسر آئے۔ جس مملکت میں انصاف نہیں وہاں وفاداری کی توقع کبھی پوری نہیں ہوسکتی۔ آپ ایک ایسے شخص سے وفاداری کی کیا توقع کرتے ہیں جو شہری زندگی کے معمولی حقوق تک سے محروم ہو، جسے آپ اپنے قریب سے گذرنے بھی نہ دیں، جسے یہ اجازت بھی نہ ہو کہ وہ اپنے لئے اسی کنوے سے پانی بھرے جہاں سے آپ کے لئے پانی آتا ہے اور اگر اس کا سایہ کبھی اتفاق سے آپ پر پڑ جاتا ہے تو آپ

اپنے تئیں ناپاک تصور کریں اسی طرح آپ کسی ایسے گروہ سے وفاداری کی توقع نہیں رکھ سکتے جو بد امنی کا شکار ہو، جس کی فلاح و بہبود کا مملکت کو خیال نہ ہو اور جس کے ساتھ مملکت صرف اتنا تعلق قایم رکھنا گوارا کرے کہ اس کی گاڑھی کمائی میں سے ایک بڑا حصہ اپنے لئے حاصل کرے۔ آپ ان لوگوں سے کیسے وفاداری کی توقع کر سکتے ہیں جن کے پسینہ کی گاڑھی کمائی کی حفاظت کے آپ ضامن نہیں ہو سکتے۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے وقت ہمارے بدنصیب ملک کی یہی حالت تھی۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی فوجوں میں خود ہمارے اہل وطن جوق در جوق بھرتی ہوئے اور اپنے نئے آقاؤں کے لئے اپنے ملک کو فتح کیا۔

ہندوستان کی تاریخ کے یہ واقعات ہماری آئندہ نسلوں کے لئے سبق آموز ہیں۔ عہد قدیم سے آپ دیکھیں گے کہ عوام الناس نے بیرونی فاتحوں کا ساتھ اس وقت دیا جبکہ وہ اپنے ملک میں عدل و انصاف سے محروم ہو گئے۔ اسلامی سلطنت کے آغاز اور انگریزی حکومت کے ابتدائی زمانے میں یہ حقیقت نہایت واضح طور پر نظر آتی ہے۔ تاریخ کے ذریعہ ہمیں اپنے نوجوان شہریوں کو بتانا چاہیئے کہ اجتماعی نظام بغیر اخلاقی محرکات کے قایم نہیں رہ سکتا۔ جب تک کہ مملکت اور سماج کے ساتھ عوام الناس کو جذباتی تعلق نہ پیدا ہو اس وقت تک دونوں کی بنیادیں کمزور رہتی ہیں۔ یہ اس وقت ممکن ہے جبکہ عام مفاد مملکت کا نصب العین ہو۔ اگر ہم اپنی نصابی تاریخوں کے ذریعہ اپنے نوجوان شہریوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دیں تو سمجھئے کہ ہم نے بڑی کامیابی حاصل کی ہے

نہ صرف وہ بلکہ جملہ حیوانات و نباتات بھی فنا ہو جائیں گے۔ یہاں تک کہ نہ کوئی عنصر باقی رہے گا نہ کوئی فلک، اور عدم کی آندھیوں کے جھکڑ، عرش اور پانی پر چلنے لگیں گے۔ جس سے وجود کی دنیا سرتاسر ویران ہو جائے گی۔ اس کے بعد پھر الرحمٰن کی تجلیات کا آغاز ہو گا جن کی وجہ سے عالم ہستی کا نیا دور شروع ہو جائے گا۔

اس قسم کے کتنے دور گذر چکے ہیں؟ اُن کا کوئی حساب انسان کے تو کیا خود آسمانوں کے بھی حاشیہ خیال میں نہیں ہے بلکہ گذشتہ دور کی یاد بھی نئے دور میں باقی نہیں رکھی جاتی۔

عرش اہل ظاہر عرش کو اس طرح سمجھتے ہیں کہ اس کی نوعیت ایک تخت کی ہے جس پر اللہ مستوی ہے اور وہ وہاں سے عالم پر اپنے احکام جاری کرتا ہے۔ قرآن میں یہ بھی ہے کہ "کان عرشہ علی الماء" جس کی تشریح حدیث میں اس طرح کی گئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان کا فاصلہ ۷۱، ۷۲، یا ۷۳ سال کی راہ ہے اور آسمان سات ہیں، جن میں سے ہر ایک سے دوسرے کا فاصلہ اسی قدر ہے، ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے جس کی گہرائی بھی اتنی ہی ہے۔ اس کے اوپر سات پہاڑی بکرے ہیں جن کے کھروں سے گھٹنوں تک کے فاصلے بھی اسی قدر ہیں، ان بکروں کی پشت پر عرش ہے جس کی موٹائی اسی قدر ہے۔ (ترمذی کتاب التفسیر باب سورۃ الحاقہ)

یعنی سات آسمان ہیں جن کے اوپر فلک محدود ہے جو پانی ہے۔ اس کے اوپر سات حاملین عرش جو پہاڑی بکروں سے تعبیر کئے گئے ہیں عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں۔

اور شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ وحدت کبریٰ اور وجود اقصیٰ کی پیہم تجلیات کا مآل کار ایک ایسی تجلی پر ہوا جو زبان شرع میں "الرحمٰن" کے نام سے موسوم ہوئی اس تجلی کے فیضان سے ایک ناسوتی موجود کا ظہور ہوا جو دو چیزوں کا مجموعہ ہے۔ ایک عرش جس پر الرحمٰن مستوی ہے اور دوسرا پانی[ل]

ل غالباً مراد ہے آیۂ کریمہ "وجعلنا من الماء کل شیء حی" میں نے اپنی کتاب تعلیمات قرآن میں وہ آیتیں بھی نقل کی ہیں جن میں عرش کے پانی پر اور پانی کے مبداء حیات ہونے پر غایت تخلیق کا انحصار ظاہر کیا گیا ہے۔

جو عالم امکان کا مبدار ہے۔ جملہ کائنات کی صورتیں عرش ہی میں ہیں اور جو اس سے خارج ہو وہ عدم محض ہے۔ اس طرح پر عرش مع اپنے مشمولات کے بمنزلہ شخص واحد کے ہے، جس کے آنکھ بھی ہے اور وہ "الرحمٰن" ہے۔ اسی کو اصطلاح فلسفہ میں عقل فعّال کہتے ہیں۔ اور جس کے نفس ناطقہ بھی ہے جو عین اس کی ذات ہے اور جس کی جان بھی ہو جو اس کے تمام اعضاء یعنی افلاک و عناصر میں ساری ہے اور جس میں قلبی قوی بھی ہیں جن سے امور جزئیہ کا صدور ہوتا ہے۔

شاہ صاحب کے بیان کے مطابق عرش ومار دونوں میں چار چیزیں مختلط ہیں، یہاں وہاں[۵]، آج اور کل، کون و فساد اور بالفعل و بالقوہ، ناسوتی عقل نے ان کے لئے مکان و زمان و ہیولیٰ و صورت کے نام تراشے ہیں[۵]۔ ان مثالوں سے میرا مدعا یہ ہے کہ شاہ صاحب کا بیان بلند اور لطیف سہی لیکن جمہور مسلمانوں کے لئے کس قدر بعید الفہم ہے۔

ظہور خودی | راہ عرفان میں جس کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔ عارف کے اوپر خود اس کے نفس کے مراتب کا بھی ظہور ہوتا ہے۔ شاہ صاحب نے اس کتاب میں اپنے ان مراتب کو جابجا بیان فرمایا ہے میں ان کو نہایت اختصار کے ساتھ اپنے الفاظ میں لکھتا ہوں۔

(۱) اللہ نے مقام کریم اور مرتبہ عظیم سے مجھ کو سرفراز فرمایا جس پر بزرگوں کو بھی رشک ہوگا۔ لوگو میں تم میں اجنبی ہوں تم مجھ کو نہیں جانتے۔ میرے سر پر تاج ہو اور ہاتھ میں قلم۔ میرا قلب حلیم ہے اور زبان شیریں (صفحہ ۵۸، ج ۲)

(۲) دو گوہر گراں بہا بمن دادہ اند، یکے اتمام دورۂ کمال، دیگر وصایۃ آنکہ مرتضیٰ علی کرم اللہ وجہہ ہمہ جوشش او میزد،

نفخۂ از ریاض قدسیہ مرا سخت در بر گرفت ——— ہمہ روئے من می بینند و شیوہ من می نگرند
جہانیاں بمن آیند و ہمتے طلبند ——— ازاں سبب کہ منم این زماں مطاع جہاں

---

۵ نہ صرف یہی بلکہ فلسفیوں کے مقولات عشرہ بھی اہل حقیقت کے نزدیک سراسر موہومات ہیں۔

کنوں وہی رسوم خزانہ دار علوم بدست ماست کنون خیر و انتفاع جہاں[1]

(ص ۱۴۲ ج ۲)

(۳) مجھ سے کہا گیا کہ تو ان لوگوں میں سے ہے جو جنت میں بلا حساب داخل کر دئے جائیں گے[2]

(ص ۱۹۵ ج ۲)

(۴) اللہ سبحانہٗ نے مجھے مجددیت کا خلعت پہنایا۔ کیوں کہ میرے اوپر حکمت کا دور ختم ہو گیا۔

ص ۱۳۱، ج ۲

(۵) میں اللہ کی کس زبان سے حمد کروں اور کن لفظوں میں اس کی صفت بیان کروں جس نے مجھ کو سارے کمالات عطا کر دئے۔ (ص ۱۴۳، ج ۲)

(۶) مجھے صحابہ کرام، اولیاء عظام اور علماء اعلام کے مقامات ملے، پھر وصایت، ارشاد اور مجددیت کے مناصب عطا ہوئے، (ص ۱۴۴، ج ۲)

(۷) چہ گوئی در حق کسیکہ منسلخ است بسوئے وحدت کبریٰ ہر چہ ہست دلیست، و ہر چہ ہست تفصیل ولیست (ص ۱۹۳، ج ۲)

(۸) مجھے معلوم ہے کہ قبر میں کون سی تجلی ہوگی اور کون سی حساب کے دن، اور کون سی جنت میں یہ جملہ تجلیات میرے سامنے حاضر بلکہ میرے قلب میں موجود ہیں۔ میں افلاک، معادن، اشجار، بہائم، ملائکہ، جن، لوح، قلم، اسرافیل بلکہ ہر اس شئ کے کمال کا کامل احاطہ کئے ہوں جو وجود کے تحت میں ہے۔ (ص ۲۰۰، ج ۲)

(۹) اس نے مجھے اہل طریقت کا امام بنا دیا اور حقیقت قرب تک پہنچنے کے سارے رستے بجز میری پیروی کے بند کر دئے، اب اہل مغرب و مشرق سب میری رعایا ہیں۔ در میں ان کا امام۔ خواہ جانیں یا نہ جانیں۔ (ص ۱۲۵، ج ۲)

---

[1] غالباً شاعری کا کمال شاہ صاحب کو نہیں عطا ہوا، کیونکہ کمالات بزرگانہ میں اس کا شمار نہیں ہے

[2] اس کا ماخذ یہ آیت ہو سکتی ہے۔ ان الذین قالوا ربنا اللّٰہ ثم استقاموا الآیۃ

(۱۰) امرار اور ملوک میری زیارت کو آئیں گے، علماء صلحاء مجھ سے استفادہ کریں گے۔ میرے اوپر ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کردی جائیں گی۔ میرے اصحاب اور ذریت میں برکت ہوگی۔ میں اگر نہ ہوتا تو دنیا بھی نہ ہوتی۔ (ص ۳۰ ج ۱)

(۱۱) امید آنست کہ اگر خدا خواستہ بر دست وے من، زمانہ تازہ شود۔ (ص ۸، ج ۱)

(۱۲) میری پیروی دو جماعتیں کریں گی۔ ایک میں سابقین کی استعداد ہوگی۔ ایک میں اصحاب یمین کی (ص ۸۰، ج ۲)

یہ اور اسی قسم کے بہت سے مراتب تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں موجود ہیں لیکن ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کا کوئی صحیح محمل آیات یا احادیث سے نکل نہ سکے یا اہل ظاہر کو اس سے وحشت ہو۔

شاہ صاحب کے مجددیت کے دعوے پر اعتراض نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ ان کے ذریعے سے ہندوستان کے مسلمانوں میں قرآن اور بالخصوص حدیث کا علم پھیلا۔ اور جیسا کہ انھوں نے فرمایا ہے دو گروہ خصوصیت کے ساتھ اس کی نشر و اشاعت میں مصروف ہوگئے یعنی اہل حدیث و علماء دیوبند اہل حدیث حنفاء کی جماعت ہے جنھوں نے تقلید کا قلادہ توڑ کر پھینک دیا اور کتاب و سنت کی ترویج اور شرک و بدعت کے مٹانے میں بلا خوف لومۃ لائم علاً و عملاً ایسی کوششیں کیں کہ سارے ہندوستان میں اُن کی روشنی پھیلی اور توحید کا منارہ بلند ہوا۔ اگرچہ اب لامرکزیت کی وجہ سے ان میں اضمحلال پیدا ہوگیا ہے اور وہ ولولہ اور جوش جو پہلے تھا باقی نہیں رہا۔ پھر بھی ان کی دینی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

دیوبندی جماعت مرتفقین کا گروہ ہے جو عوام کے ساتھ ملا جلا رہا۔ اس نے تقلید کو بھی قائم رکھا اور فروعی امور میں امتیازی خصوصیت اختیار کر کے اپنا فرقہ الگ نہیں بنایا مگر اصولی اصلاح یعنی محو شرک و بدعت اور اشاعت کتاب و سنت میں پوری جد و جہد سے کام لیا۔ یہاں تک کہ اپنی اسلامی خدمات کی بدولت ہندوستان کے جمہور مسلمانوں پر ان کا اثر غالب آگیا اور اب تک

مدرسہ دیوبند کی وجہ سے چونکہ ان میں ایک مرکزیت باقی ہے اس لئے اُن کی کوششوں کا سلسلہ جاری ہے - یہی جماعت اس وقت اسلامی ہند میں مذہب کی علمبردار ہے -

یہ دونوں گروہ شاہ صاحب کو اپنا مقتدا اور پیشوا تسلیم کرتے ہیں ۔ کیا یہ بات اُن کی مجددیت کے ثبوت کے لئے کافی نہیں ہے ؟ - ہاں اپنی ذریت کے متعلق انھوں نے برکت کی جو خبر دی تھی وہ صرف تھوڑے زمانے تک صحیح ثابت ہوئی ۔ پھر ان کی اولاد منقرض ہو گئی - مجھے یاد ہے کہ سنہ ۱۹۱۰ء میں مولانا عبد الحق صاحب محدث دہلوی کے خاندان میں ایک شادی تھی جس کی شرکت کے لئے میں دہلی آیا تھا ۔ اس وقت ایک شخص سید احمد نامی جو اپنے آپ کو ولی اللہی کہتے تھے ۔ مجھ سے ملے تھے، ان کا قد چھوٹا تھا اور داڑھی بڑی وہ اسی کتاب یعنی تفہیمات کو طبع کرانے کی فکر میں تھے ۔ اس کے ۲۰۴ صفحے چھپے ہوئے مجھے دکھلائے بھی تھے ، میں نے اس کی بابت ان کو کچھ مشورے بھی دئے مگر اس کے تھوڑے ہی زمانے کے بعد وہ انتقال کر گئے ۔ اب جہاں تک مجھے علم ہے شاہ صاحب کی ذریت میں کوئی باقی نہیں ہے -

لطیفہ | حافظ حمید الدین فراہی مرحوم نے جو قرآن سے اکثر علمی لطائف نکالا کرتے تھے ۔ ایک بار مجھ سے کہا کہ اس آخری دور میں اللہ نے دو شخصوں کو خدمت قرآن کے لئے چنا ۔ جن کی خبر اس آیت میں دی ہے - وھو الذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا وینشر رحمتہ وھو الولی الحمید یعنی شاہ ولی اللہ اور حمید الدین ۔ ایسا ہی ایک اشارہ اس کتاب میں بھی مجھے ملا ۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں

صوفی امروز تسمیت از اسمار حسنٰے کما قال قولہ الحق " وھو الذی ینزل الغیث الایۃ "
ہیچ میدانی کہ ایں کجا صورت خواہد لیست ۔ جائیکہ کس نگوید کہ پدر ولی فلانست و مادرش فلانۂ ۔ (ص ۱۸ ج ۲)

مجددیت | یہاں یہ ذکر بے موقع نہ ہوگا کہ مسلمانوں میں دو منصب ، مجددیت اور مہدویت کے احادیث کی رو سے مسلم چلے آتے ہیں ۔ پہلا مجدد جو دوسری صدی ہجری کے سرے پر ہوا لوگوں نے خلیفہ عمر بن عبد العزیز کو قرار دے دیا ۔ لیکن اس کے بعد سے یہ رتبہ علمار وصلحا کے حصے میں آگیا ۔ ہر ہر صدی

میں مختلف جماعتیں مختلف اسلامی ممالک میں اپنے اپنے معتمد علیہ اکابر کو مجدد گردانتی رہیں۔ جس کا سلسلہ اب تک برابر چلا جاتا ہے۔ چونکہ مجددیت کا مدار عمل سے زیادہ ذاتی وجاہت پر رہی اس لئے اس کے واسطے میدان بہت وسیع ہے۔ مہدی کا منصب اہل سیف کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ کیوں کہ اس کے فرائض علماء وصلحا کے حیطۂ قدرت سے باہر تھے، اور روایات کی بنیاد پر چونکہ یہ غیر اہل بیت سے نہیں ہو سکتا تھا اس لئے انھیں کے ساتھ مخصوص ہو گیا۔ دوسرے خادمانِ ملت وحامیانِ دین جنھوں نے جہاد و اعلاء کلمۃ الحق میں اپنا خون اور پسینہ ایک کہ جیسے سلطان محمود غزنوی، سلطان نور الدین زنگی شہید، سلطان صلاح الدین اور سلطان محمد فاتح، وغیرہ اُن کے واسطے نہ مجددیت رہی نہ مہدویت۔

اہل عرفان قرآن میں وارثین کتاب کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں: "سابق، مقتصد، اور ظالم لنفسہ" ان کی تفصیل مختلف سورتوں میں ہے۔ جن کی تشریح کا یہ موقع نہیں ہے۔ یہاں اہل عرفان کا مقام معلوم کرنے کے لئے تاریخی ادوار کے لحاظ سے انھیں ناموں کے ساتھ مسلمانوں کے طبقات کو مختصراً بیان کرتا ہوں

(۱) سابق:- یہ وہ طبقہ ہے جس کو ایسا امام متفق علیہ[۵] نصیب ہوا۔ جو خالص اللہ کی مرضی اور اس کے احکام کے مطابق چلنے والا تھا۔ مرکزیت کی بدولت اُن کے اجتماعی مقاصد متعین تھے۔ اور ان کے سامنے سوائے اللہ اور اس کی رضا کے کچھ نہ تھا۔ یہی مقربین بارگاہ ہیں۔ "السابقون السابقون اولٰئک المقربون"۔ ان کو عرفان کی جستجو کی ضرورت نہ تھی۔ کیوں کہ صداقت مجسم ان کے سامنے تھی اور عمل بالقرآن نے خود ان کو سراسر عرفان بنا دیا تھا۔ افسوس ہے کہ ان کا زمانہ نبوت کے بعد صرف ۴۰ سال تک رہا۔

(۲) مقتصد:- اپنے امراء کے تغلب سے یہ طبقہ امام متفق علیہ سے محروم ہو گیا اور براہِ راست

۵؎ امام منصوص نہیں۔ کیوں کہ قرآن سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ اگر امام منصوص کوئی ہے تو صرف رسول ہے جو امام متفق علیہ میں داخل ہے۔

احکام الٰہی کی ماتحتی سے اُن کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ اُن کے مرکزی مقاصد میں استبدادی اغراض شامل ہو گئے تھے۔ اس لئے اُن میں سے بہت سے لوگ جزئی جماعتوں میں یا انفرادی طور پر اپنی اپنی نجات کی راہیں نکالتے تھے انھیں میں سے کچھ لوگوں نے ترک دنیا اور زہد کا طریقہ اختیار کیا یہی لوگ اہل عرفان یا اہل تصوف کہے گئے۔

۳۔ ظالم لنفسہٖ:۔ مقتصدین نے جب ایک مدت تک کی مہلت پاکر بھی اپنی حالت کی اصلاح کی کوشش نہیں کی اور اپنے امراء کی غلامی پر قانع رہ کر حکومت الٰہی کو بھلا بیٹھے تو اس کی سزا میں وہ اور اُن کے اُمراء سب کے سب کفر کی محکومیت کے جہنم میں ڈال دئے گئے۔ اُن کے لئے نہ صرف اجتماعی بلکہ بہت سے انفرادی راستے بھی نجات کے بند ہو گئے۔ لیکن پھر بھی مختلف راہیں مقبولیت کی کھلی ہوئی ہیں۔ ان میں سے بھی کچھ لوگ تصفیہ باطن کا راستہ اختیار کرتے ہیں اور سلوک کے مقامات طے کرکے نجات کی اُمید رکھتے ہیں۔

اگرچہ اہل نظر میں ابھی یہی مسئلہ زیر بحث ہے کہ یہ نجات اور مقبولیت کا ذریعہ بھی ہے یا نہیں۔ کیوں کہ باطنی ریاضتوں سے یہی مدارج غیر مسلم کو بھی حاصل ہو جاتے ہیں، لیکن اس بحث سے قطع نظر کرکے نفس طریقت یا تصوف کو دیکھا جائے تو تاریخی حیثیت سے اس امر میں بہت کم شبہ کی گنجائش ہے کہ مسلمانوں میں یہ چیز عہدِ غلامی کی پیداوار ہے۔

ان اہل عرفان میں بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اگر ان کو متفق علیہ امام مل جائے تو وہ بھی سابقین کے رتبہ تک پہنچ جائیں۔ مگر اجتماعی اعمال نجات کی راہیں بند پاکر ان کا سارا رجحان باطنی اصلاح کی طرف ہو جاتا ہے۔ اس راہ میں آسانیوں سے زیادہ دشواریاں ہیں اور ایسے مقامات آتے ہیں کہ اگر حبل اللہ یعنی قرآن کا دامن دونوں ہاتھوں سے مضبوط نہ پکڑے ہوئے رہیں تو قدم اپنی جگہ سے اکھڑ جاتا ہے۔ اور پھر حیرت میں سرگرداں ہونے لگتے ہیں،

ان حضرات میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں جن پر حال کا غلبہ ہو جاتا ہے اور ان کی زبانیں بند ہو جاتی ہیں۔ مگر بعض کی نسبت علمی حال پر غالب رہتی ہے۔ وہ ان قلبی واردات کو بیان

کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن کے لئے نہ زبان ہے نہ الفاظ ا اس وجہ سے بالعموم ان کے کلام میں ابہام پایا جاتا ہے۔ علاوہ بریں یہ کلام بھی خالص صحو میں نہیں ہوتا بلکہ فی الجملہ سکر کی کیفیت اس میں شامل رہتی ہے۔ ان بیانات کو زیادہ سے زیادہ وجدانیات اور ذوقیات کہہ سکتے ہیں۔ ورنہ بعض اہل علم نے تو ان کو سراسر شطحیات قرار دیا ہے۔

ان بزرگوں میں سے جنھوں نے ان کیفیات کو لکھا ہی۔ شیخ اکبر اور شاہ صاحب ممتاز ہیں شاہ صاحب کا قدم جادۂ شرع سے کہیں ہٹتے نہیں پایا ہے۔ مگر شیخ اکبر نقطۂ اتصال پر پہنچ کر جہاں حظیرۂ قدس کی تجلیات کا ظہور ہوتا ہے اتحاد کی طرف جھک گئے اور اپنی کتاب فتوحاتِ مکیہ کا پہلا فقرہ یہ لکھا کہ

سبحان الذی خلق الاشیاء وھو عینھا۔

اور پھر زندگی بھر اسی کی تشریح کرتے رہے۔

مجھے امام ابن تیمیہ جیسے شخص پر جو اس قابل ہیں کہ امت اُن کے اوپر فخر کرے تعجب آتا ہے کہ انھوں نے حال کا کوئی لحاظ نہیں رکھا، اور شیخ اکبر جیسے شخص کو جو قدوۃ الاولیا ہیں طاغوت اکبر کہہ دیا۔ بجز اس کے کیا کہا جائے کہ یہ وہی اہل باطن و ظاہر کا مقابلہ تھا، جو اس سے پہلے شیخ عبدالقادر جیلانی اور امام ابن جوزی میں پیش آچکا تھا۔

باوجود اس کے کہ شاہ صاحب نے غلبہ حال میں بھی ظاہر شرع کا لحاظ رکھا ہی اور اس سے تجاوز نہیں کیا ہی پھر بھی وہ اپنے اس کلام سے خوش نہیں ہیں۔ بلکہ اس سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

یہ بیان میری فطرت کی قوت ممیزہ کے باعث ہی عنقریب اس کو قتل کرکے ایک گہرے کنوئیں میں دفن کردوں گا۔ (ص ۱۵ ج ۲)

آخر میں پھر یہ حقیقت بیان کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس قسم کے وجدانی بیانات اور صوفیانہ نصائف سے ممکن ہی کہ اہل نظر کچھ لطف یا فائدہ اٹھا سکیں مگر عوام کے لئے ان میں کوئی نفع نہیں ہی بلکہ الٹا نقصان ہے کیوں کہ بعض لوگ انکو دیکھکر ہر قسم کے بلکہ انسے بھی بڑے بڑے دعوے کر بیٹھتے ہیں اور امت میں بدافتراق اور تشتت پیدا کرنے کے موجب ہوتے ہیں

تاریخ الامت

ابتدائے رسالت سے آخر زمانۂ خلافت عثمانیہ تک تمام قرونی علوم اور مسلمانوں کے کارناموں کا ذکر نہایت سلیس اور دلچسپ عبارت میں کیا گیا ہے۔

اسلامی تاریخ کا یہ سلسلہ مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری نے بڑی جانفشانی اور تحقیق سے مرتب فرمایا ہے۔ ملک کی متعدد یونیورسٹیوں اور کالجوں میں داخل نصاب ہے۔ بالخصوص ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے طلباء کے لئے نہایت مفید ہے۔ طباعت و کتابت نہایت عمدہ۔

حصہ اول	سیرۃ الرسول	قیمت	عہ	مجلد	عمر
حصہ دوم	خلافت راشدہ	〃	عہ	〃	عمر
حصہ سوم	خلافت بنی امیہ	〃	عمر	〃	عمار
حصہ چہارم	خلافت عباسیہ	〃	عار	〃	عہ/ر
حصہ پنجم	عباسیہ بغداد	〃	عار	〃	عہ/ر
حصہ ششم	عباسیہ مصر	〃	عار	〃	عہ/ر
حصہ ہفتم	خلافت عثمانیہ	〃	عہ	〃	عمر

نوٹ: جو صاحب مکمل سلسلہ یکمشت طلب فرمائیں گے ان کو لوپاسٹ مجلد پیش کیا جائے گا اور قیمت غیر مجلد کی لی جائے گی۔ جلدیں نہایت اہتمام کے ساتھ اچھے مضبوط کپڑے کی تیار کرائی گئی ہیں جن پر کتاب اور مکتبہ جامعہ کا نام بلاک سے چھپایا گیا ہے۔ جلد پر ایک خوش نما کاغذ کا کور ہے اس کی طباعت بھی بلاکوں سے کی گئی ہے۔

حصص اول و دوم طلباء کی فرمائش کے خیال سے چھوٹے سائز پر بھی شائع کئے ہیں اور ان کی قیمت ہر ایک کی ایک روپیہ ہے۔

مکتبہ جامعہ دہلی

جامعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

ڈاکٹر انصاری مرحوم

سر خاکِ شہیدے برگ‌ہائے لالہ می پاشم

ڈاکٹر انصاری موجود تھے اور کسی کے مرنے کی خبر سننے میں آتی تھی تو سوال فوراً زبان پر آتا تھا ڈاکٹر انصاری کو بھی دکھایا تھا؟ اب جبکہ ڈاکٹر انصاری کی رحلت کی خبر آئی تو تھوڑی دیر تک عقل و حواس معطل رہے، سوچنے لگا آخر ڈاکٹر انصاری کیوں کر جاں بحق ہوئے اور یہ کیوں کر ممکن ہوا کہ وہ خود اپنے لئے اس موت کا سدِ باب نہ کر سکے جس کو ان کی نتھری چمکیلی، گہری اور مریض اور تندرست دونوں کو تسکین دینے والی آنکھیں ہمیشہ روکے دیتی تھیں، ٹال دیتی تھیں اور بھگا دیتی تھیں۔

میں ہمیشہ مریض رہا اور ڈاکٹر انصاری سے اپنی تکلیف رجوع کرتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ میرا مرض معمولی مرض نہیں ہے اور اس کا انجام اچھا نہیں ہے۔ ایسی حالت میں جب ذہن کی فضا ایسی مٹیالی، نمناک اور غلیظ ہو جاتی جس کو میں اس طرح چھو سکتا تھا جیسے گلی سڑی پھپھوندی کو اس وقت میں اُن کے مطب کا رخ کرتا۔ انتظار میں اکثر زیادہ وقت صرف ہوتا اور میں اُن کے انتظار کے کمرہ میں بیٹھا کھجوری کی دوکانوں، گزرنے والوں کی تگ و دو، گاڑیوں اور پھیری والوں کے شور و شغب دیکھتا اور سوچتا کہ یہ چہل پہل، یہ لہر بہر، یہ مشغولیت، یہ خلفشار زندگی ہے جس سے میں ہمیشہ کے لئے علیحدہ کر دیا جاؤں گا۔ زندگی ہی وہ کل ہے جو اپنے جزو سے مستغنی ہے تو مجھ پر ہراس مایوسی اور اکثر بغاوت کا جذبہ طاری ہو جاتا۔ اور میں زیادہ بیتابی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کا منتظر ہو جاتا۔

اتنے میں ڈاکٹر صاحب کی آمد کی خبر آتی۔ وہ اپنے مضبوط اور ہموار قدموں سے زینہ پر چڑھتے اور کسی ہمراہی سے گفتگو کرتے ہوئے سنائی دیتے۔ دیکھتے ہی مسکراتے اور اس طور پر کہ گھنی پلکوں کے نیچے سے اُن کی آنکھیں بھی مسکرانے لگتیں، کہتے بھئی تم کہاں، بڑے عرصہ تک غائب رہے،

میں کہتا ڈاکٹر صاحب بڑی تکلیف ہے، پریشان ہوں، کچھ کرتے دہرتے نہیں بنتا۔ بولتے گھبراؤ نہیں ابھی دیکھتا ہوں، پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ باتیں اس لب و لہجہ سے اور اس طرح ہنس ہنس کر اعتماد اور اعتقاد، دل آسائی اور دلربائی کے ساتھ، دوستی اور بزرگی کی شان سے کہتے کہ مجھے خود محسوس ہونے لگتا کہ میں ناحق پریشان ہوا، اس سے پہلے کیوں نہیں آیا۔ خواہ مخواہ اتنے دنوں مصیبت و مایوسی میں کیوں مبتلا رہا۔

ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کوئی نہ کوئی ضرور ہوتا اس سے بات کرتے جاتے، اندازِ گفتگو سے محسوس ہوتا کہ وہ دوسرے سے بات اس لئے کر رہے ہیں کہ مجھے تقویت پہونچے اور مجھ سے گفتگو کرتے تو اوروں کو محسوس ہوتا کہ وہ دوسروں میں بھی اعتماد اور امید کی روح بیدار کر رہے ہیں۔ اُن کے ساتھ صرف مریض یا اُن کے اعزا نہ ہوتے بلکہ مختلف اقسام کے لوگ ہوتے۔ مقاصد کی نوعیت بھی جداگانہ ہوتی، لیکن ڈاکٹر انصاری کی بات میں وہ جادو تھا کہ ہر شخص یہی سمجھتا کہ گو ڈاکٹر انصاری مخاطب دوسروں سے ہیں لیکن کہہ وہی رہے ہیں جو ہماری تقویت یا دلچسپی کا موجب ہو۔

ڈاکٹر انصاری اپنے معائنہ کے کمرہ میں لے جاتے، مجھے اس قسم کے معائنہ خانوں اور آپریشن روم وغیرہ میں جانے کا اکثر اتفاق ہوا ہے لیکن جس امید اور اعتماد کے ساتھ میں نے اپنے آپ کو ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر بھاٹیا (لکھنؤ) کے حوالہ کیا ہے وہ مجھے کہیں اور نصیب نہوا۔ ڈاکٹر انصاری اس طرح دیکھتے، ٹٹولتے گویا وہ خود اپنے زخم یا درد کو ٹٹول رہے ہیں۔ اُن کی انگلیاں، خوبصورت، سڈول، گداز پاکیزہ خوش رنگ اور ایسی معتدل حرارت کی ہوتیں اور اُن کو وہ اس نرمی اور نزاکت کے ساتھ کام میں لاتے کہ مجھے کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ کسی دوسرے کی انگلیاں میرے جسم کو چھو رہی ہیں۔ آہ ان کی گھنی ابروئیں اور لمبی پلکوں والی، گہری، روشن اور ہنستی ہوئی آنکھیں اور شیر و شہد سی نگاہیں جو جسم و جان میں اس طور پر نفوذ کرتیں جیسے کوئی اچھا خیال یا اچھا کام قلب کو بالیدہ، جذبات کو رنگین اور خیالات کو بلند کر دیتا ہے۔ وہ مریض کا معائنہ ایسے کرتے جیسے وہ اُن کا جان چھڑکنے والا بھائی بھتیجا بیٹا یا جاں نثار دوست ہے۔ اُن کی پیشانی ایک روشن فضا تھی جس میں مریض کو

امید اور بر آنے والی امید کے نقوش نظر آتے تھے۔

معائنہ کرتے وقت ایسا معلوم ہوتا گویا ڈاکٹر انصاری کو آج تمام دن کوئی اور کام کرنا نہیں ہے اور اُسی مریض پر تمام وقت اور توجہ صرف کر دیں گے۔ معائنہ ختم کرنے کے بعد میز پر لیٹے ہوئے مریض کو خود سہارا دے کر اُٹھاتے۔ کچھ دیر تک اسے میز پر پاؤں لٹکائے ہوئے بٹھا رہنے دیتے اور خود اُس کے پاس کھڑے ہو کر اس طور پر باتیں کرتے جیسے اپنے کسی گہرے بے تکلف دوست سے خوش گپی کر رہے ہوں۔ اس کے بعد سہارا دے کر میز سے اُتارتے، کپڑے پہنانے میں مدد دیتے، نسخہ لکھتے، استعمال کی ترکیب بتاتے اور رخصت کر دیتے۔

ڈاکٹر انصاری سے رخصت ہو کر میں اپنے آپ کو بالکل تندرست سمجھنے لگتا۔ اگر مرض کی کچھ تکلیف بھی ہوتی تو سمجھتا کہ دوا استعمال کرنے کے بعد ہی جاتی رہے گی۔ چنانچہ میں مطب سے اُترتے ہی فتحپوری اور چاندنی چوک کی چہل پہل اور ہمہمی میں گم ہو جاتا۔ پھل والوں کے ہاں سے پھل خریدتا اور کسی ہوٹل میں جا کر کھانا کھاتا اور مدتوں پرہیز کرتے کرتے کھانے پینے کا جو لطف کھو چکا ہوتا اس کو بد پرہیزی سے از سرِ نو حاصل کرتا۔ دل کا اندوہ چھنٹ جاتا اور زندگی خوشگوار اور خوش آئند معلوم ہونے لگتی۔

میں نے ایک بار ڈاکٹر انصاری کو سرجری کرتے بھی دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی ماہر مصور کے ہاتھ میں موقلم ہے یا کوئی مرصع ساز کسی نازک زیور یا مشین پر کام کر رہا ہے۔ نشتر اُن کی انگلیوں میں اس طور پر کام کرتا جیسے بہزاد اپنے قلم سے خطوط کھینچ رہا ہے۔ نزاکت اور صلابت دونوں کا امتزاج، ایسا امتزاج جو قوس قزح کے رنگوں میں پایا جاتا ہے، چہرہ پر سنجیدگی، آنکھوں میں گہرائی انگلیوں میں صفائی اور تیزی۔ آپریشن میں آلودگی کا ہونا لازمی ہے لیکن ڈاکٹر انصاری کو آپریشن کرتے دیکھئے تو معلوم ہوتا جیسے مشین کا ماہر مختلف ٹکڑوں کو جو اسکریو سے جڑے ہوں، خوبی پھرتی صفائی اور اعتماد کے ساتھ علیحدہ کر رہا ہے۔

مدتیں گذریں میری طفولیت اور الہلال کے شباب کا زمانہ تھا۔ الہلال کے جتنے پرچے

آتے تھے ہم لوگ اس کو شوق اور عقیدت سے پڑھتے تھے۔ عبارت سمجھتے تو فخر کرتے اور جہاں نہیں سمجھتے تھے وہاں یہ خیال کرتے تھے کہ کوئی بڑی بلند یا گہری بات کہی ہے جو ہماری سمجھ سے باہر ہے اس لئے اس کا احترام اور زیادہ کرتے تھے۔ پچھلی بار گھر گیا، بچپن کی الماری گرد و غبار سے اَٹی پڑی ہوئی تھی۔ ایک پر اتفاقیہ نظر جا پڑی۔ دیکھا تو اس وفد کی تصویر تھی جو ڈاکٹر انصاری مرحوم کی سرکردگی میں یہاں سے جنگ بلقان میں زخموں کی مرہم پٹی کے لئے گیا تھا۔ یہ تصویر اس زمانہ میں الہلال میں شائع ہوئی تھی نیچے لکھا ہوا تھا۔

"اے وہ لوگو کہ زخمیوں کے ملک میں جا رہے ہو جب وہاں پہنچنا تو خدارا
اُن کے زخموں پر سختی نہ کرنا کیوں کہ وہ زخم ان کے نہیں ہیں بلکہ اسلام کے ہیں۔"

آہ وہ زمانہ یاد آ گیا جب اَبوالکلام، محمد علی، ڈاکٹر انصاری کو ہم سب خدا جانے کیا سمجھتے تھے معلوم ہوتا تھا کہ ہم بھی مسلمان ہیں۔ اسلام پر تیرہ سو برس نہیں گذرے ہیں۔ بڑے ہو کر ہم بھی ہندستان سے باہر جا کر مسلمان مجاہد کی طرح لڑیں گے زخمی ہوں گے شہادت پائیں گے فاتح کہلائیں گے۔ دنیا دیکھے گی کہ اسلام اور اسلامیوں سے بڑھ کر کوئی نعمت اور منزلت نہیں ہے۔ آج جبکہ یہ سطور لکھ رہا ہوں ماضی کا غبار زندگی کی شاہراہ سے ہٹ گیا ہے اور تصور کی کرنیں طفولیت کے اس افق پر پڑ رہی ہیں جہاں ہم رہ رہ کر تلملا اُٹھتے تھے کہ کیوں بچپن کا زمانہ نہیں ختم ہوتا اور ہم ترکوں کی مدد کے لئے۔ اسلام کا نام روشن کرنے کے لئے، زخمی ہونے کے لئے سپاہیوں کی صف میں کھڑے ہونے کے لئے کیوں نہیں بلائے جاتے۔ لیکن اب کیا حال ہے، ہم بدل گئے زمانہ بدل گیا، دنیا بدل گئی رنج و راحت، عزت و ذلت کا تصور بدل گیا۔ زندگی کی جد و جہد وہی ہے لیکن جد و جہد کا لطف باقی نہیں رہا تصورات میں نہ رنگینی باقی رہی نہ حرارت، عزائم میں نہ استواری ہے اور نہ برکت! مانا موجودہ عہد کے مسائل اور مطالبات کچھ اور ہی ہیں فرائض اور ذمہ داریاں بھی بدلی ہوئی ہیں لیکن خدارا کوئی یہ بتائے یہ کیسے مسائل ہیں یہ کیسے فرائض ہیں جن سے دماغ میں روشنی نہیں پیدا ہوتی دلوں میں ولولے نہیں پیدا ہوتے ہاتھوں میں قوت نہیں پیدا ہوتی اور زندگی سے حرارت مفقود ہو چکی ہے۔

ظاہر ہے میں پرانے وقتوں کا ہوں راگنی بے وقت کی ہے، زمانہ ترقی کر چکا ہے، زندگی اور زندگی کے تار و پود نئے اسلوب سے مرتب ہو رہے ہیں ہر چیز کی قدر و قیمت گھٹ بڑھ رہی ہے۔ جس چیز کو ہم متاع یوسفی سمجھتے تھے وہ متاع کاسد سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی اور جسے اب دیکھ کر ہم خجل اور سراسیمہ ہوتے ہیں وہی حاصل حیات ہے۔ زمانہ اور زندگی کی رفتار ہی نہیں اس کا رخ بھی بدل گیا ہے لیکن زندگی کی برہنگی کو حقائق کا انکشاف کیوں کہیئے۔ سائنس کے کرشموں کو انسانیت کا معجزہ کیوں بتایا جاتا ہے۔ آرٹ اور آزادی کی، قربان گاہ پر کن چیزوں کی بھینٹ چڑھائی جا رہی ہے۔ افراد کی شادی و غمی کیا ہوئی، ان کی پروا کیوں نہیں کی جاتی۔ جماعت کے ریگ زار سے افراد کی امید اور امنگ کے نخلستان کیوں فنا کئے جا رہے ہیں۔ یہ سب بے وقت کی راگنی صحیح رنج و راحت کا تصور اور وہ بھی درست لیکن رنج و راحت کا احساس کیوں کر بدل گیا؟

~~~~~~~~~~

ڈاکٹر انصاری ہندو مسلمانوں کے نفاق و افتراق کو دور کرنے کی فکر میں تمام عمر کوشاں رہے۔ وہ نفاق و افتراق کو ہندوؤں اور مسلمانوں کا مرض سمجھتے تھے اور ایک سچے طبیب اور ڈاکٹر کی مانند مریض سے ہمدردی کرنے اور مرض کے ازالہ میں پوری توجہ اور دلسوزی اور قابلیت صرف کرتے رہے۔ انھوں نے ہندو مسلم اختلاف کو ہندو یا مسلم کی حیثیت سے نہ کبھی پرکھا اور نہ اس کی چارہ سازی کی انھوں نے اس مرض کے ازالہ کی ایک حقیقی طبیب کی حیثیت سے کوشش کی۔ ڈاکٹر انصاری کے لئے اس کے علاوہ اور چارۂ کار ہی نہ تھا۔ وہ جب کرتے جیسا کچھ کرتے اور جتنا کر سکتے سب ڈاکٹر کی حیثیت سے کرتے اور ایسا ہی انھوں نے کیا۔

~~~~~~~~~~

ڈاکٹر انصاری کی وفات سے کتنے لڑکے لڑکیاں یتیم ہو گئیں۔ بیوائیں لاوارث ہو گئیں۔ نوجوان بے دست و پا ہو گئے۔ رفقا جی چھوڑ بیٹھے۔ وہ معلوم نہیں کن کن مواقع پر کیسے کیسے لوگوں کی مدد کر چکے تھے اس بڑے پہیئے کی گردش سے کتنی چھوٹی چھوٹی اور مختلف متفرق مشینیں گردش کر رہی تھیں۔ وہ

محتاجوں ہی کے مددگار نہ تھے بلکہ اُن لوگوں کی آن بان اور وضعداری کے بھی کفیل تھے جن کو "اسیلۓ گردش ایام" برابر پیستی جاتی تھی۔ ایسوں کی دستگیری معمولی کام نہ تھا۔ دولت، اثر، اقتدار کا کتنا بڑا حصہ ان پر صرف ہوتا ہوگا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنھوں نے ہر قسم کی مدد، انتہائے کشادہ جبینی اور دریا دلی کے ساتھ دوسروں کی کی ہوگی۔ اور شاید کوئی ایسا ہو جس سے اسی نوعیت کی مدد ڈاکٹر انصاری نے حاصل کی ہو۔

انھوں نے خوب کمایا، خوب صرف کیا، ان پر ایسے ایسے مواقع بھی آئے جب اُن کے پاس کھانے اور خرچ کرنے کو کچھ نہ تھا۔ لیکن اُن کی زندگی میں کسی ایسے کو، جس کے کفیل ڈاکٹر انصاری تھے کبھی کسی ایسے موقع سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔ جب اس کو کھانے اور خرچ کرنے کی سختی جھیلنی پڑی ہو ایسے لوگوں کی تعداد کم نہ تھی۔ ڈاکٹر انصاری کے رفقا میں سے کوئی ایسا نہ ہوگا جس نے ڈاکٹر انصاری کی اتنی مدد کی ہو جتنی ڈاکٹر انصاری نے اس کی کی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ لوگ جن پر ڈاکٹر کے احسانات تھے ڈاکٹر کے لئے کیا کرتے ہیں۔ ڈر صرف اسی سے ہے کہ ہم ہندوستانی مسلمان اکثر و بیشتر صرف یہ کرتے ہیں کہ مدد لینے میں تو حق و ناحق کی بھی تمیز اُٹھا دیتے ہیں لیکن مدد دینے کے وقت اور اس حالت کو یکسر فراموش کر جاتے ہیں جب خود ہم کو مدد مانگنے کی ضرورت ہوئی تھی اور ہماری مدد کی گئی تھی۔

ڈاکٹر انصاری جامعہ ملیہ کے قیام و ترقی میں جو کچھ کرتے رہے اور اُن کی جو امیدیں اور ولولے اس سے وابستہ تھے اس کا اندازہ میں کر سکتا ہوں۔ غالباً چند ہی لوگ ایسے ہوں گے جو مجھ سے زیادہ اس کا احساس کر سکتے ہوں۔ ابھی ابھی رمضان کی ایک شام کو ڈاکٹر صاحب[1] کے ہمراہ جامعہ کی نئی عمارت دیکھنے "ادکھلے" گیا ہوا تھا۔ ادکھلے کے صاف سادے ورق پر ایک نقش اُبھر رہا تھا۔ بدیع اور بلند۔ عمارت کا نقشہ اور اس کا ہیکل ابھی نامکمل تھا۔ تصور تصویر میں منتقل ہو رہا تھا۔ مستقبل کا افق دھیرے دھیرے ان تمام گہرائیوں اور پہنائیوں کے ساتھ بے نقاب

---

[1] ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ

ہو رہا تھا جن میں مومن کا عزم پرورش پاتا ہے، بالیدہ ہوتا ہے اور آفاق پر چھا جاتا ہے۔

عمارت کے سامنے کچھ فاصلے پر ایک طرف ڈاکٹر انصاری آسودۂ خاک تھے اور مدفن کے بہشتی جھروکے سے اپنے حسنات کی فردوس تعمیر ہوتے دیکھ رہے تھے۔

دیر ہو رہی تھی ہم سب واپس آ گئے۔



غزل

عہدِ رنگیں کی یادگار ہوں میں
یعنی اپنا ہی سوگوار ہوں میں

آ، کہ بیتابِ انتظار ہوں میں
دل کی اک آخری پکار ہوں میں

ذرۂ آستانِ یار ہوں میں
صدمۂ دہر در کنار ہوں میں

میری ہستی کا واہ کیا کہنا
تیری ہستی کا پردہ دار ہوں میں

نہ سہی، تو ترا خیال تو ہے
یوں بھی فردوس در کنار ہوں میں

اُف جواں مرگیاں، محبت کی
ہائے کس کس کا سوگوار ہوں میں

نکہتِ گل کا بھی دماغ نہیں
کتنا آزردۂ بہار ہوں میں

وہ حقیقت ہے خود مری ہستی
جس حقیقت کا پردہ دار ہوں میں

اللہ اللہ نزاکتیں میری
اپنی خاطر پہ بھی تو بار ہوں میں

تجھ کو تکلیفِ صد نظر ہے، ہے
اپنے ہونے پہ شرمسار ہوں میں

مجھ کو رنگِ خزاں سمجھ کے نہ دیکھ
مژدۂ آمدِ بہار ہوں میں

شذرات

دن گزرتے دیر نہیں لگتی۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم، سابق امیر جامعہ کے انتقال کو پورا ایک سال ہوگیا، پارسال اسی مہینے (۱۰ رمئی ۱۹۳۶ء) مسوری سے اچانک ان کے انتقال کی خبر آئی تھی اور تمام ملک میں غم والم کی گھٹا چھا گئی تھی۔ یہ غم اتنا تازہ ہے کہ یقین نہیں آتا کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی جدائی کو اتنے دن بیت گئے۔

اس پرچے میں پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کا مضمون شایع کیا جاتا ہے۔ رشید صاحب نے بہت ہی دُکھے ہوئے دل سے ڈاکٹر صاحب کے اوصاف بیان کئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے جس شخص کا بھی سابقہ پڑا ہوگا ——— مریض کی حیثیت سے، دوست کی حیثیت سے، ضرورت مند کی حیثیت سے ——— اس کے جذبات کم وبیش یہی ہوں گے۔

رسالہ جامعہ کی اشاعت میں کچھ عرصہ سے بے ترتیبی پیدا ہوگئی تھی۔ اس تاخیر اشاعت سے ہمارے ناظرین کو جو تکلیف واذیت پہنچتی رہی اس کا ہمیں پوری طرح اندازہ ہے لیکن کچھ ایسی رکاوٹیں اور مجبوریاں حائل تھیں جن کا تدارک بہت دیر میں ہو سکا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب حالات پر قابو حاصل ہوگیا ہے اور انتظامات میں ایسی سہولتیں پیدا ہوگئی ہیں کہ آئندہ اس اظہار معذرت کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ مارچ اور اپریل کے پرچے جلد جلد ایک ہی ہفتے میں شایع کر دیے گئے۔ مئی کا پرچہ اپنے وقت پر یعنی مئی کے پہلے ہفتے میں شایع ہو رہا ہے۔

رسالے کے عام مضامین کے سلسلے میں بھی کچھ تبدیلیوں کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ یعنی اب سیاسی مضامین کے لئے زیادہ گنجائش رکھی جائے گی۔ ان کے بعد عمرانی و معاشی مضامین کےلئے خاص

ادبی مضامین اور عمدہ افسانے بدستور شایع ہوتے رہیں گے۔ مضمون نگار حضرات سے توقع ہے کہ مضمون بھیجتے وقت ہماری گذارشوں کا لحاظ رکھیں گے۔

جناب حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی صدر یار جنگ بہادر نے عرصہ ہوا اردو اکادمی میں مقالہ پڑھنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ بارے اب اس کے ایفا کا وقت آیا چنانچہ ۱۰ اپریل کو آپ جامعہ میں تشریف لائے۔ سہ پہر کے وقت آپ نے جامعہ کے مختلف اداروں کا معائنہ فرمایا۔ جامعہ نگر اوکھلا بھی تشریف لے گئے اور وہاں کی ہر چیز کو غور اور توجہ سے دیکھا آپ نے جامعہ کے نئے تعلیمی تجربوں سے دلچسپی ظاہر کی اور جامعہ کے کاموں پر اظہار اطمینان فرمایا شام کو اردو اکادمی کی طرف سے آپ کے اعزاز میں چاء کی دعوت تھی۔ دہلی اور نئی دہلی کے معززین اس دعوت میں شریک تھے۔

رات کو ۸ بجے آپ نے اکادمی کے جلسے میں اپنا مقالہ پڑھا شمس العلماء پروفیسر عبدالرحمٰن صدر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی جلسے کے صدر تھے۔ مقالہ کا عنوان "قدیم علماء کا تعلیمی نصب العین" تھا۔ آپ نے قرآن وحدیث کی روشنی میں نہایت وضاحت سے بیان کیا کہ ہمارے قدیم علماء و طلباء کس مقصد سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ استاد و شاگرد میں آپس کا برتاؤ کیسا تھا؟ طالب علم تحصیل علم کے شوق میں کیسی کیسی مشقتیں برداشت کرتے تھے۔ افلاس تنگ دستی ہزاروں میل کے پیدل سفر۔ اسی قسم کی اور بہت سی رکاوٹوں سے اُن کے استقلال میں ذرا بھی فرق نہ آتا تھا۔

جامعہ کے اساتذہ و طلباء نے آپ کی تقریر غور و توجہ سے سُنی اور مفید سبق حاصل کئے باہر کے حضرات بھی کافی تعداد میں جلسے میں شریک تھے۔

آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۸۶ء میں قایم ہوئی تھی۔ اس حساب سے اس کے قیام کو پچاس برس گذر چکے ہیں۔ اسی تقریب میں گذشتہ مارچ میں اس کی طلائی جوبلی منائی گئی۔ اس کی تفصیل اخبارات میں شایع ہو چکی ہے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے زاویۂ نگاہ اور طرزِ عمل سے بہت سے لوگوں کو اختلاف ہے، تاہم یونیورسٹی کے قیام، مسلمانوں میں تعلیم کی ضرورت کا احساس پیدا کرنے اور غیر مستطیع طلبا میں وظائف کی تقسیم کے سلسلے میں اس نے جو خدمات انجام دی ہیں لبا غنیمت ہیں۔

شکر ہے کہ کارکنانِ کانفرنس کو اپنے اصول و عمل کی فرسودگی کا احساس ہو رہا ہے۔ جوبلی کے مختلف خطبہائے صدارت اور مقالات سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آہستہ آہستہ کانفرنس میں ایسے طبقے کا اثر و نفوذ بڑھ رہا ہے جو تعلیمی امور میں مہارت کے ساتھ زمانے کی ضرورتوں سے واقف ہے۔ یہ امر کانفرنس کے مستقبل کے لئے بہت خوش آئند ہے۔

اس سال مکتبہ جامعہ نے کئی علمی و ادبی تصانیف و تراجم شایع کئے ہیں، اب روسو کی معرکتہ الآرا تصنیف Social Contract کا ترجمہ معاہدۂ عمرانی کے نام سے زیرِ اشاعت ہے۔ ترجمہ ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر ڈھاکہ یونیورسٹی نے کیا ہے۔ کتاب آخر مئی تک تیار ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ حضرت جوش ملیح آبادی کے کلام کا تیسرا مجموعہ "فکر و نشاط" بھی اسی مہینے مکتبہ کی طرف سے شایع ہو رہا ہے۔

اپریل کے جامعہ میں کاتب کی غلطی سے صفحات کے نمبر غلط پڑ گئے ہیں اور یہ غلطی شروع سے آخر تک مسلسل ہے یعنی شروع صفحہ پر ۱۵۹ کی جگہ ۲۵۹ ہونے چاہئے تھے۔ براہِ نوازش اپنے اپنے پرچوں میں تصحیح فرما لیجئے۔

جامعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

یاد رکھنے کی بات

مکتبہ جامعہ اُردو کا سب سے بڑا تجارتی کتب خانہ ہے۔ مشہور مصنفین اُردو مثلاً مرزا غالب، خواجہ حالی علامہ شبلی، مولانا آزاد، مولانا شرر، علامہ اقبال، منشی پریم چند اور اُردو کے تمام مصنفین کی بلند پایہ تصانیف و تراجم اور لاہور، لکھنؤ، الٰہ آباد، حیدرآباد، اورنگ آباد، اعظم گڈھ وغیرہ مقامات کی سب کتابیں ہر وقت ہمارے یہاں موجود رہتی ہیں۔ شائقین فہرست طلب فرما کر اپنی پسندیدہ کتابیں منتخب فرمائیں۔

رعایت :- مطبوعات جامعہ پر محصول ڈاک اور پیکنگ بالکل معاف ہو سکتا ہے بشرطیکہ :-

(الف) فرمائش مبلغ پانچ روپے سے کم نہ ہو۔

(ب) رقم بذریعہ منی آرڈر پیشگی ارسال کی جائے۔

نوٹ :- درسی کتابیں اس اعلان سے مستثنیٰ ہیں۔

مطبوعات جامعہ کے علاوہ دوسری کتابوں پر اس شرط کے ساتھ کہ فرمائش مبلغ دس روپے سے کم نہ ہو اور رقم پیشگی پہنچ جائے محصول ڈاک معاف کیا جائے گا۔ البتہ ان کتابوں پر جو ہمیں بھی کسی خاص رعایت سے نہیں ملتیں یہ ممکن نہ ہوگا۔ ایسی صورت میں رقم واپس کر دی جائے گی اور اس سلسلہ میں کوئی خط و کتابت نہ کیجائے گی۔

جن تاجروں، کتب خانوں یا مدرسوں کو کتابوں پر کوئی کمیشن دیا جاتا ہے۔ انہیں محصول ڈاک معاف نہیں ہو سکتا۔ کمیشن کا معاملہ خط و کتابت سے طے کریجئے۔

مکتبہ جامعہ دہلی

بسم اللہ

جامعہ

زیر ادارت: ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے - پی ایچ ڈی

جلد ۲۷	جون سنہ ۳۷ء	نمبر ۶

فہرست مضامین

۱۔ جدید اردو شاعری کے بعض میلانات	جناب آل احمد صاحب سرور ایم اے	۴۰۷
۲۔ روس کی موجودہ حالت	پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن)	۴۲۳
۳۔ ہندوستان کا مسئلہ آبادی	پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم اے	۴۴۱
۴۔ روسو کا نظریہ تعلیم	ڈاکٹر قاضی عبدالحمید صاحب پی ایچ ڈی	۴۵۱
۵۔ سیاسیات عالم کا خاکہ	پروفیسر سنت پرشاد مدہوش - ایم اے	۴۵۹
۶۔ غزل	حضرت جگر مراد آبادی	۴۷۰
۷۔ تنقید و تبصرہ	...	۴۷۱
۸۔ رفتار عالم		
ہندوستان	...	۴۸۲
ممالک غیر		۴۸۶
اسلامی دنیا		۴۹۷
۹۔ کارٹون		۵۰۶

قیمت سالانہ صہ — پرنٹر و پبلشر محمد مجیب بی اے (آکسن)، محبوب المطابع برقی پریس، دہلی — فی پرچہ ۸

ہماری متعدد فہرستیں

مکتبہ جامعہ نے اپنے زبردست ذخیرے کی فہرستیں ایک خاص نوعیت سے علیحدہ علیحدہ شائع کی ہیں۔ جو حضرات جس مضمون یا شعبے سے دلچسپی رکھتے ہوں ازراہ کرم مطلع فرمائیں مطبوعہ فہرست فوراً حاضر کی جائے گی۔ چند فہرستوں کے نام درج ذیل ہیں

۱۔ **مطبوعاتِ جامعہ** ۔ جامعہ کی شائع کردہ اور سول ایجنسی کی کتابوں کی مکمل فہرست۔

۲۔ **ناشرینِ اُردو** ۔ جامعہ کے علاوہ اردو کتابوں کے تمام ناشرین کی فہرستوں کا مجموعہ۔

۳۔ **مصنفینِ اُردو** ۔ مشہور مصنفین، مترجمین و مولفین اردو کی کتابوں کی فہرست۔

۴۔ **بچوں کی کتابیں** ۔ بچوں کے لئے اردو کی کتابوں کی فہرست۔

۵۔ **عورتوں کی کتابیں** ۔ عورتوں اور بچیوں کے لئے پسندیدہ کتابیں۔

۶۔ **مختصر فہرست کتب** ۔ اردو کی تقریباً ایک ہزار مشہور کتابوں کی فہرست۔

۷۔ **ادبی کتابیں** ۔ تاریخ و تنقیدِ ادب، مقالات و انشاء، ناول، افسانہ، نظم ڈراما، مکاتیب، ظرافت وغیرہ پر اردو کتابوں کی مکمل فہرست۔

۸۔ **مذہبی کتابیں** ۔ ڈھائی سو منتخب مذہبی کتابوں کی فہرست۔

۹۔ **تاریخی کتابیں** ۔ پانچ سو تاریخی کتابوں کی فہرست۔

۱۰۔ اجتماعیات، سیاسیات، معاشیات، تعلیم، فلسفہ، منطق، نفسیات اخلاقیات، طبیعیات، کیمیا، طب، حفظانِ صحت، زراعت اور صنعت و حرفت پر اردو کی تمام کتابوں کی مکمل فہرست زیرِ طبع ہے۔ عنقریب شائع ہو گی۔

مکتبہ جامعہ دہلی

جدید اردو شاعری کے بعض میلانات

کسی دور کی شاعری کا تجزیہ کرنے کی سب سے آسان صورت یہ ہے کہ اس زمانے کے ممتاز شعرار کا حال بیان کر دیا جائے اور ان کے کلام کا مناسب انتخاب مع ضروری حواشی کے دے دیا جائے الگ الگ تصویریں پیش کرنے سے بھی اکثر ایک مکمل خاکہ سامنے آجاتا ہے۔ مگر ایک اور صورت بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ عام تاریخی اور بیانیہ شاہراہ سے ہٹ کر اُن میلانات کو ٹٹولا جائے جو کسی ایک دور کو دوسرے دور سے علیحدہ کرتے ہیں۔ اور ان میلانات میں سے خاص خاص کا ذکر اس طرح کیا جائے کہ ایک مسلسل اور مربوط رشتہ قایم ہو سکے۔ پہلی صورت کو (Inclusive) اور دوسری کو (Exclusive) کہہ سکتے ہیں۔ میں نے دوسرا طریقہ کار اختیار کیا ہے۔

ادب میں دوروں کی تقسیم | یہ بھی ایک بحث طلب امر ہے۔ آخر ہمارے پاس وہ کون سا معیار ہے جس کی بنا پر ہم داغ کی شاعری کو جدید نہیں کہہ سکتے لیکن آزاد اور حالی کو جدید شاعری کا پیغمبر قرار دیتے ہیں یہ تقسیم تاریخی نقطۂ نظر سے تو نہیں ہوتی مگر قدرتی طور پر اس کی ایک تاریخی حیثیت ہوتی ہے۔ چنانچہ ہمیں بعض ایسی تاریخیں مل جاتی ہیں جن کی سرحد پر آنے اور جانے والے دور کا اتصال ہوتا ہے اور جہاں زمانہ ایک منزل کو ختم کر کے دوسری میں قدم رکھتا ہے۔

ایسی ہی ایک تاریخ ۱۸۵۷ء کی تھی۔ اور اس وقت جو کچھ ہوا اُسے چاہے آپ مظلوموں کی حرکت مذبوحی کہیں، یا ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی یا انگریز مورخوں کے الفاظ میں غدر۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس تاریخ سے اردو ادب عموماً اور شاعری خصوصاً ایک نئے روپ میں سامنے آتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس تاریخ اور اس کے واقعات کو پیش نظر رکھنے سے نئی شاعری کا رنگ سمجھ میں آسکتا ہے۔

غدر سے پہلے کی شاعری پر تبصرہ آزاد کے الفاظ میں سنئے۔

— "زبان اردو کے پاس جو سرمایہ ہے وہ شعرار ہند کی کمائی ہے جنھوں نے فارسی کی بدولت

اپنی دوکان سجائی ہے اس سرزمین کی ہوا بگڑی ہوئی ہے ۔ جو کچھ ہے وہ اتنا ہی ہے کہ فارسی کے پروں سے اُڑی، لفاظی اور مبالغوں کے زور سے آسمان پر چڑھ گئی ۔ وہاں سے جو گری تو استعاروں کی تہ میں ڈوب کر غائب ہوگئی ۔

مگر یہ رائے تصویر کے صرف ایک رخ بلکہ یوں کہئے ۔۔۔۔ کہ ایک کونے کے متعلق ہے ۔ آزاد اُردو شاعری کی صورت بتا دیتے ہیں تاکہ پہچاننے والے اُسے پہچان لیں ۔ اس کے مادہ سے انھیں بحث نہیں ۔ ہر دَور کی پیداوار اس دور کا آئینہ ہوتی ہے ۔ اس لئے وہ جدید روش جو قدیم شاعری میں (اور قدیم شاعری سے میری یہاں مراد غدر کے پہلے کی شاعری ہے) کوئی مستحسن پہلو نہیں دیکھتی، قابل لحاظ نہیں ہے ۔ قابل لحاظ یہ بات ہے کہ غدر سے پہلے کی شاعری اور اس کی پرواز تخیلی اور صنعتی قدروں تک ہے ۔ داخلی شاعری کا دور دورہ اور خیال بندی اور خیال آرائی کے چرچے ہیں اور موضوع سے اتنی بحث نہیں ہوتی جتنی محاورے کی صحت اور غلطی سے ۔ زندگی بدلتی رہی، ماحول کچھ کا کچھ ہوتا گیا مگر یہ خیال کے بندے عالم خیال میں داد عشرت دیتے رہے ۔ زمانہ کا تقاضا کچھ اور تھا اور اُن کے دلوں کا کچھ اور ۔ بزم عیش بکھر چکی تھی مگر چاندنی راتوں میں پھولوں کی سیجیں سجانا اور دست حنا بستہ سے افسردہ انگور لینا ہنوز یاد تھا ۔ یہ مصور اپنے مصور تھے کائنات اور فطرت کے مصور نہ تھے ۔ الفاظ کی دنیا بنا لیتے تھے ۔ ماحول کا نقشہ کھینچنا اُن کے بس کی بات نہ تھی ۔ بلکہ یہ تو شاید اپنی دنیا چھوڑ کر دوسری دنیا سے آگاہ بھی نہ تھے ۔

نظام دہر نے لاکھوں ہی کروٹیں بدلیں
مگر ہم ایک ہی پہلو سے بیقرار رہے

غدر سے پہلے کی شاعری کے تین کارنامے ہیں ۔ ایک طرف قصیدہ دوسری طرف مرثیہ اور بیچ میں غزل ۔ بلکہ مجھے اجازت ہو تو کہوں کہ غدر سے پہلے کی نظم یا قصیدہ ہے یا مرثیہ ۔ مرثیہ اپنا، قصیدہ دوسروں کا ۔ کبھی کبھی غزل کا ایک شعر قصیدہ ہے تو دوسرا مرثیہ ۔ اُردو کے اچھے اچھے شاعروں نے اپنی رفعت تخیل، اپنی نازک خیالی، اور اپنی شعریت ان بے راہ وادیوں میں برباد کی ۔ اُنھوں نے بے ازکو

حقیقت کا زینہ کہا مگر پہنچے کہیں بھی نہیں۔ فضا میں نئے نئے میدان تلاش کرنے کی جستجو میں زمین اور زمین والوں سے دور ہوتے گئے۔ ہمارے قصائد ہماری ذہنی پستی کا نہ مٹنے والا ثبوت ہیں جس کا اندازہ کرنے کے لئے بائرن کے (Vison of gudgement) اور ہمارے شعرا کے اسی زمانے کے قصائد کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ دوسری طرف مرثیہ ہے۔ اس سے میری مراد شہدائے کربلا کا ماتم نہیں بلکہ وہ مرثیہ ہے جو عشق کی ناکامیوں اور مایوسیوں' تہی دستی اور تہ دامنی' بربادی اور ویرانی کو شعروشاعری کے پردے میں پیش کرتا تھا۔ اور اپنے نالہ و فریاد سے ساری اجتماعی زندگی کو ماتم اور یاس انگیز بنا دیتا تھا۔ اس طرز بیان کو صوفیانہ خیالات نے اور بھی مقدس بنا رکھا تھا۔ کیونکہ دنیا سے الگ رہ کر دنیا کو سمجھنے اور سمجھانے کی یہ گمراہ کن کوشش وہیں سے شروع ہوتی تھی۔

غزل قدیم شاعری میں ایک خاص شان رکھتی ہے۔ اس کا عروج قدیم شاعری کا عروج اور اس کا زوال قدیم شاعری کا زوال ہے۔ ہر صنف شعر کی پیدائش سادگی پر ہوئی۔ بعد میں اس کا ارتقاء مضامین کے اعتبار سے بہت کم ہوا۔ اسلوب اور زبان کے لحاظ سے ہر ایک میں الجھاؤ اور ظاہری شان و شوکت بڑھتی گئی۔ سادگی سے پیچیدگی کی طرف ترقی اردو شاعری کا عام اصول معلوم ہوتا ہے۔ غزل پہلے سادہ تھی۔ بعد میں ادبی صناعی اور حسن کاری کا نمونہ بن گئی۔ پہلے داستان حسن و عشق کی ترجمان تھی آگے چل کر دماغی ورزش کے لئے بہترین آلہ ہو گئی۔ یہ دور لکھنوی شاعری کا دور تھا۔

غرض ایک طرف قصیدہ' دوسری طرف مرثیہ اور بیچ میں غزل۔ یہ میراث غدر کے وقت اردو شاعری کے پاس تھی یہ روایتی رنگ جاری رہتا اور اس کو جاری رکھنے کی کوشش بھی جاری رہتیں کہ زمانے نے اپنی آواز کے سامنے ان بے حقیقت نغموں کو فراموش کر دیا اور ان ہی میں سے چند صاحب دل ایسے اٹھے جنھوں نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا۔ خیالی اور فرضی باتوں کا ماتم نہ کیا بلکہ حقیقی پستی اور زبوں حالی پر افسوس کیا۔ خود روئے اور دوسروں کو رلایا۔ پھر ان کے آنسو پوچھے اور انھیں ڈھارس دلائی۔ آزاد۔ حالی اور اسمٰعیل کی کوششوں سے جدید اردو شاعری کی بنیاد پڑی۔ سرسید کی

تحریک نے اُسے مددپہنچائی اور وقت کے تقاضے نے اس کے لئے سازگار ماحول پیدا کیا اور اس طرح ہماری شاعری انفرادی اور شخصی موریوں سے نکل کر زمانے کے صاف اور تیز دھارے پر چلنے لگی۔

دنیا میں کوئی بھی نظام ہو اس میں دو مخالف قوتیں برابر سرگرم عمل رہتی ہیں۔ اور سچ پوچھئے تو ان دونوں کی پیکار اور کشمکش پر ہی اس نظام کی ترقی اور بہتری کا انحصار ہے۔ ایک اپنی حالت پر قائم رہنے کی اور جو کچھ ہے اسے سمیٹ کر محفوظ رکھنے کی، اور دوسری بدلتے رہنے کی اور نئی نئی راہوں کو تلاش کرنے کی۔ ایک کو قدامت اور دوسری کو جدیدیت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ایک پرانی روشوں کے قیام کی ضامن ہے اور دوسری ان میں ترمیم، تراش وخراش، بلکہ بسا اوقات پوری عمارت کے ڈھادینے کی ساعی ہے برسوں تک قدامت اُردو شاعری پر بری طرح مسلط رہی، جدید شاعری اسی قدامت کے شکنجے سے نکلنے کی کوشش تھی۔ جس کی رنگا رنگی سے ہم آج بہرہ ور ہو رہے ہیں۔ جدید اُردو شاعری میں قدامت کا عنصر موجود ہے اور نا قابل اعتنا نہیں۔ مگر ہم اس وقت صرف اُن میلانات سے بحث کرنا چاہتے ہیں جو جدید اُردو شاعری کو جدید کے لقب کا مستحق قرار دیتے ہیں اور جو اس کا طرۂ امتیاز ہیں۔ جن سے وہ پہچانی جاتی ہے اور جن کی بنا پر دنیا کی دوسری نظمیات میں جگہ لے سکتی ہے۔

یہ شاعری جن اشخاص کے ہاتھوں پروان چڑھی وہ سب بالواسطہ یا بلا واسطہ انگریزی ادب سے متاثر تھے۔ اُردو پر تقلیدی رنگ ہمیشہ غالب رہا ہے۔ ابتدا میں ہندی کا اثر تھا۔ چنانچہ قدیم اُردو مقامی رنگ سے مالا مال ہے۔ بعد میں فارسی آئی اور اس نے صدیوں تک اُردو کو نوازا اور کچھ کا کچھ کر دیا۔ غدر کے بعد سے انگریزی کا اثر شروع ہوا۔ اس اثر نے موضوع اور طرز بیان دونوں پر اپنا پرتو ڈالا۔ اس کے علاوہ تراجم کو بھی رواج دیا، جدید اردو شاعری کے بانیوں کے یہاں تینوں قسم کے نمونے ملتے ہیں۔

جدید شاعری نے اصناف میں کم اضافہ کیا۔ خیالات اور اسالیب میں بہت۔ غدر کے فوراً ہی بعد کی شاعری قومی۔ معاشرتی اور ادبی اصلاح کے احساس سے پُر ہے۔ اُس کی خصوصیات تراجم، نظموں کا رواج مناظر قدرت کی طرف توجہ، اور ان کا ذکر سادگی، فطری انداز بیاں اور اخلاقی طرز ہیں۔ آزاد۔ حالی اور اسمٰعیل سادگی اور صفائی کے قائل تھے۔ الا ہمہ آزاد استعارات اور تشبیہات سے بھی اپنی دوکان سجاتے ہیں،

لیکن نہ اتنی جتنی نثر میں۔ اسمٰعیل نے جو میدان اپنے لئے انتخاب کیا اُس میں اُن کے تعلیمی ماحول سے بہت مدد ملی۔ انھوں نے ابتدا سے تراجم اور مقامی رنگ پر زور دیا اور اُن کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور معاشرتی مسائل کی طرف بھی توجہ کی۔ رہے حالی تو ان کا مسلک اُن کے ان اشعار سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔

اے شعر دلفریب نہ ہو تو تو غم نہیں — پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دلگداز تو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام — ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو
وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمان شاعری — قبلہ ہو اس طرف تو نہ کیجو نماز تو

اس زمانے کے بعد مگر موجودہ احساسِ ازادی سے پہلے اُردو شاعری پر ایک نسبتاً پرسکون زمانہ گذرا جس میں اکبر اور شوق کی شاعری کا نشو ونما ہوا۔ اس دور میں عنصر اصلاح سے زیادہ ادبیت پائی جاتی ہے۔

مگر یہ اُردو شاعری کی بدقسمتی تھی کہ ابھی اصلاح کا قدم اچھی طرح جما نہ تھا اور اس کے اچھے نتائج ظہور میں نہ آنے پائے تھے کہ اس کا ردعمل شروع ہوگیا۔ حالی اور اکبر کے زمانے میں اتنا فرق نہیں جتنا ان دونوں کے پیغام میں ہے۔ حالی کا پیام ہے ؎ پھر وتم اُدھر کو جدھر کی ہوا ہو۔ اکبر اس کے خلاف زمانے کے ساتھ تبدیلی کو بری نظر سے دیکھتے ہیں اس معمّے کو سمجھنے کے لئے ایک اور حقیقت کو پیش نظر رکھئے حالی کی شاعری کا ادلین دور سرسید کی تحریک شباب کا دور تھا۔ اور یہ تحریک اگرچہ فوج ظفر موج کی طرح ملک کے ہر طبقے کو اپنے ساتھ بہالائی تھی مگر اس کے ساتھ ساتھ مغربیت کے مضر اثرات کو جذب کرنے میں بھی پیش پیش تھی۔ انقلاب کے پہلے دور میں اکثر یہی ہوتا ہے۔ ظاہر بیں نگاہیں سطح پر خس وخاشاک ہی دیکھتی ہیں۔ انھیں موجوں کی آغوش میں موتی کیسے نظر آئیں۔ یہی حشر جدید شاعری کا اکبر کے ہاتھوں ہوا۔ اس سے نقصان یہ ہوا کہ اکبر جیسے اشخاص نے جو نیک نیت بھی تھے اور تھوڑے بہت تنگ نظر بھی انقلاب کی اس چڑھتی ہوئی لہر میں اپنا سب کچھ بہتے ہوئے دیکھا۔ ایک صاحب کی رائے ہے کہ " اکبر کا کلام سامنتی تمدن کا شدید احتجاج تھا جو طنزیہ تک بندی میں کفر کے فتوے صادر کر رہا تھا " لیکن گالی جتنا جوش کو ظاہر کرتی ہے اس سے زیادہ غلطی کو نمایاں کرتی ہے۔ اکبر اپنے عہد کی

مکمل پیداوار ہیں۔ اُن کی شاعری اُن تمام تر ادبی، معاشرتی، رجحانات و تحریکات کی حامل ہے جو ہندوستان میں مغرب کے اولین اثرات کے ردعمل کی وجہ سے پیدا ہوئیں۔ عصرِ اصلاح مغربی اثرات کا دور تھا۔ عہدِ اکبر ان اثرات کے ردعمل کا دور ہے جس کی ابتدا شبلی سے ہو چکی تھی اور جس کی انتہا اقبال کی شاعری میں پرتو فگن ہے۔ اس کی وضاحت آگے چل کر کی جائے گی۔

اکبر نے جب ہوش سنبھالا تو جدید تعلیم کے مضر اثرات پیش نظر تھے۔ اچھے پہلو تک اُن کی نظر پہنچی ہی نہیں۔ دو چیزیں اُن کی شاعری میں قابل غور ہیں۔ ایک تو اُن کا نصب العین دوسرے ان کا اسلوب یا طرز ادا۔ اکبر کی شاعری کا نصب العین ہندوستان میں ایک ایسی قومیت کی تعمیر تھی جس میں روشن خیالی کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب اور روایات مذہب کے تحفظ کا خاص طور پر احساس ہے۔ اکبر مشرقیت کے دلدادہ تھے اور مولویت سے بیزار۔ وہ شوہر پرست بیوی کو پبلک پسند بیوی پر ترجیح دیتے تھے۔ اُن کے خلاف صرف ایک چیز ہے اور وہ یہ کہ اُن کے زمانے اور عصر اصلاح میں اور زیادہ فرق ہونا چاہیئے تھا۔

حالی، اکبر۔ اقبال یہ تینوں مل کر اس تدریجی ارتقا کو واضح کرتے ہیں جو جدید اُردو شاعری میں کارفرما ہے۔ حالی کا کلام بھی ایک مرثیہ ہے مگر اس مرثیہ میں ایک تعمیری شان ہے۔ انھوں نے جس چیز کی اُردو شاعری میں بنیاد ڈالی ہے وہ زندگی اور مسایلِ زندگی سے قربت تھی۔ دوسری اہم چیز ان کا اخلاقی نقطۂ نظر ہے۔ یہ اس صوفیانہ اخلاقیات سے بالکل جداگانہ چیز ہے جس میں کبھی کبھی منہ کا مزہ بدلنے کو اُردو کا بڑے سے بڑا رند بھی راہ نجات کی خاطر دادِ سخن دیا کرتا تھا۔ اس اخلاقیات کی بنا زندگی سے زیادہ قریب تھی۔ پچھلے اخلاقیات مابعدالطبیعیات کی حد میں جا پڑے تھے۔ حالی نے کئی نئے تجربات کئے۔ انھوں نے غزل کو اخلاقی اور فطری خیالات کے اظہار کا آلہ بنایا۔ اپنی نظموں میں واقعات بیان کئے اور اُن سے نتائج اخذ کرنے میں کبھی پس وپیش نہ کیا۔ عبدالماجد دریا بادی انھیں اُردو کا واعظ شاعر کہتے ہیں۔ اُن کا زور غالباً واعظ پر ہے مگر میں لفظ شاعر پر زیادہ زور دینا چاہتا ہوں۔

(۱) جدید اُردو شاعری کی پہلی خصوصیت زندگی اور مسایلِ زندگی سے قربت ہے۔ اُنیسویں صدی کے

آخر نصف میں سماجی نظام سرعت سے بدل رہا تھا۔ مسلمانوں کی پستی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور آہستہ آہستہ سرسید اور اُن کے رفقائے کار کی کوششوں سے اس پستی سے نکلنے کے اسباب بھی پیدا ہو رہے تھے۔ انگریزی خیالات جدیدیت کا لباس پہن کر اونچے طبقہ کے لوگوں کو خیرہ کر رہے تھے۔ اور اُن خیالات کی وجہ سے قدیم نقطۂ نظر بدل رہا تھا۔ رسم و رواج کو ایک ایک کر کے ناقدانہ نظر سے دیکھا جا رہا تھا۔ اور اگرچہ ابھی صحیح قوت تنقید وجود میں نہیں آئی تھی مگر جو کچھ تھا غنیمت تھا کیونکہ اسی مدھم روشنی نے رفتہ رفتہ روز روشن کی شکل اختیار کر لی۔ حالی کی شاعری کی مصلحانہ شان خصوصاً مسدس کی مصلحانہ شان ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اس پر سرسید کے وقتی خیالات کا ایک بڑی حد تک اثر پڑا ہے اور اس کا نقطۂ نظر بھی اصلاح اور تعلیمی ترقی کا وہی ہے جو سرسید کا ہے۔

اُردو شاعری نے جب فضاؤں کی بے معنی پرواز ترک کی اور زمین اور زمین والوں کے مسائل سے قریب ہوئی تو اس میں قدرتی طور پر ایک پیامی رنگ پیدا ہو گیا اور اُس وقت سے اِس وقت تک یہی رنگ اپنی بہار دکھا رہا ہے۔ یہ پیغام آزادی کی جدوجہد کی صورت میں نمودار ہوا مگر آزادی سے یہاں میری مراد صرف سیاسی آزادی نہیں ہے۔ بلکہ شاعری میں ایک نئے تصور کی ابتداء ہے جس کا ذکر میں تفصیل سے کرنا چاہتا ہوں۔ میرے خیال میں جدید شاعری کا کوئی ایک میلان اگر کہا جا سکتا ہے تو یہی آزادی ہے۔ جس کا اظہار نظری اور عملی دونوں طرح ہوا ہے۔ اُن میں موضوعات اور اسالیب دونوں کی آزادی ملتی ہے۔ ان موضوعات میں سے صرف چند پر اظہار خیال اس وقت ممکن ہے۔

پہلی چیز جس میں آزادی ہوئی وہ شاعر کا نقطۂ نظر ہے۔ پہلے شاعر جو کچھ کہتا تھا اپنے لئے کہتا تھا اور اس وجہ سے وہ جو کچھ کہتا تھا اس میں اپنے جذبات، اپنے خیالات اور اپنے رجحانات کو بہت کچھ دخل ہوتا تھا۔ ان جذبات میں اگر کوئی خارجی جذبہ شامل ہوتا تھا تو وہ سرپرستوں کا تھا۔ ہر صنف سخن کا قانون ایک بڑی حد تک اس کے سرپرست وضع کیا کرتے ہیں۔ وہ جس قسم کی چیز پسند کرتے ہیں دنیا ویسی ہی مہیا کرتی ہے۔ یہی حال شاعروں کا ہے۔ وہ اپنے جذبات شعر میں بیان کرتے تھے اور ان جذبات کو جو خارجی چیز متاثر کرتی تھی وہ ان کے سرپرستوں کا مذاق تھا۔ اسی پر انشا قربان ہوئی۔

یہیں مصحفی نے شکست کھائی۔ یہیں سے امانت نے اندر سبھا کے لئے اور شوق نے اپنی مثنویوں کے لئے مواد حاصل کیا۔ یہ ادب یا شاعری کا داخلی یا (Subjective) پہلو تھا۔ جدید شاعری نے خارجی یا (Objective) پہلو پر زور دیا۔ اور نقطۂ نظر میں اس آزادی کی وجہ سے نئے نئے میلانات اور تجربات ظہور پذیر ہوئے۔ اس تبدیلی اور آزادی کی کارفرمائی چند مخصوص میدانوں میں دیکھ کر اچھی طرح سمجھ میں آئے گی۔

اس جذبہ کے ماتحت وطنی اور سیاسی شاعری شروع ہوئی۔ تعجب ہے کہ غدر سے پہلے سوائے نظیر اکبرآبادی کے کلام کے وطنی شاعری کا سرمایہ بہت تھوڑا ملتا ہے۔ لیکن چونکہ اس زمانے کا قبلہ خاکِ وطن نہیں بلکہ سرزمین ایران تھی۔ اسی لئے یہ کمی سمجھ میں آسکتی ہے۔ غدر کے بعد وطن کی زبوں حالی کا احساس پیدا ہوا اور آخر قومی نوحہ کی شکل میں نمودار ہوا۔ حب وطن کا ابتدائی تخیل جغرافیائی ہے جس میں انسان وطن کے آسمان زمین، عنادل، نغمہ سحری کوہسار اور دریا، باغ اور تاروں بھری رات کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے بعد وطن کی تاریخ، تہذیب اور تمدن کی باری آتی ہے۔ اس کے مشاہیر کا ذکر فخریہ الفاظ میں ہوتا ہے۔ اُن کے کارنامے بڑے جوش وخروش سے بیان کئے جاتے ہیں۔ اُن کے ذہنی سرمایہ کو محفوظ رکھنے کی بار بار تلقین کی جاتی ہے۔ حب وطن کا تیسرا اور بلند ترین تصور وہ ہے جہاں مادی وسایل کے بجائے انسانیت کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ جس میں وطن کے مظاہر مادی پر قناعت نہیں کی جاتی بلکہ اہل وطن کی بے غرض خدمت اور بے لاگ سیوا کا درس دیا جاتا ہے۔ جدید شاعری میں حالی۔ چکبست۔ سرور جہاں آبادی اور دَور اول کے اقبال وطنی شاعر کے لحاظ سے ممتاز ہیں حالی وطن کا ذکر بڑی محبت سے کرتے ہیں مگر ان کی وطنی شاعری ہمارے لئے اس وجہ سے بھی اہم ہے کہ اس میں حب الوطن کا تیسرا بلند ترین تصور پیش کیا گیا ہے۔ اپنے اس دعویٰ کے بعد کہ ؎

تیری اک مشت خاک کے بدلے ٭ لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

حالی اپنے ہم وطنوں سے اس طرح خطاب کرتے ہیں ؎

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو ٭ اٹھو اہل وطن کے دوست بنو

مرد ہو تو کسی کے کام آؤ ٭ ورنہ کھاؤ، پیو، چلے جاؤ
مقبلوں مدبروں کو یاد کرو ٭ خوش دلو غمزدوں کو شاد کرو
جاگنے والو غافلوں کو جگاؤ ٭ تیرنے والو ڈوبتوں کو تراؤ

چکبست کی وطنی شاعری میں ایک طرف ہندوستان کی قدیم عظمت کی نوحہ خوانی کی گئی ہے ۔

گوتم نے آبرو دی اس معبد کہن کو ٭ سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جام الفت بخشا اس انجمن کو ٭ سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو

سب سور بیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر میں یا اُن کی ہڈیاں ہیں

دوسری طرف وطنی آزادی کا راگ لبرل تخیل کے مطابق گایا گیا ہے ۔

طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے ٭ نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

اس "ہوم رول" کا نظریہ ملاحظہ ہو ۔

یہ آرزو ہے کہ مہر و وفا سے کام رہے ٭ وطن کے باغ میں اپنا بھی انتظام رہے
گلوں کی فکر میں گلچیں نہ صبح و شام رہے ٭ نہ کوئی مرغ خوش الحاں اسیر دام رہے

سر پہ شاہ کا اقبال ہو بہار چمن
رہے چمن کا محافظ یہ تاجدار چمن

مگر وطن کے مناظر اور قدیم تاریخ کے بہترین مرقعے سرور جہاں آبادی کے یہاں پیش کیے گئے ہیں جن کی مشہور نظمیں گنگا اور جمنا اپنے تخیل، اپنی نصب العینیت، اپنے طرز بیان اور اپنی غنائیت کے لحاظ سے بہت کامیاب کہی جا سکتی ہیں۔

اقبال کے موجودہ رنگ کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ وطنیت کا اس قدر زبردست مخالف ایک زمانے میں وطن کو قدر اعلیٰ اور خاک وطن کے ذرہ ذرہ کو دیوتا سمجھتا ہوگا۔ لیکن اُن کے دور اول کی شاعری میں ایک نہیں بلکہ کئی نظمیں ایسی ملتی ہیں جن میں اقبال نے وطن کی محبت کا اظہار بڑے فخر و مسرت

سے کیا ہے ۔ ان میں کوہ ہمالہ ۔ ہندوستانی بچوں کا قومی گیت ۔ ترانۂ ہندی اور نیا شوالہ زیادہ مشہور ہیں یہ تخیل آگے چل کر بالکل بدل جاتا ہے ۔ اور اقبال ایک عالمگیر انسانیت کے خواب دیکھنے لگتے ہیں جس کی تعمیر میں اُن کے نزدیک سب سے بڑی رکاوٹ وطنیت کا محدود تخیل ہے ۔ ترانۂ ملی اور وطنیت ان دونوں نظموں میں اقبال اپنا جدید مذہب بیان کرتے ہیں جس میں وطنیت کی جگہ ملیت نے لے لی ہے اقبال اب وطنیت کے محدود تصور کو تراشیدۂ تہذیب نوی کہتے اور صاف صاف الفاظ میں پکارتے ہیں ؎

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے ؛ قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اقبال کا یہ تصور 'بال جبریل' اور 'ضرب کلیم' دونوں میں جھلکتا ہے مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اقبال وطن کے بالکل مخالف ہیں ۔ اقبال کی مخالفت درحقیقت وطنیت کے اس محدود تصور سے ہے جس میں اور کسی شے کی گنجائش نہیں ۔ وطن کی محبت اور وطن کو پستی سے نکالنے کی خواہش 'ضرب کلیم' میں بار بار ملتی ہے ۔ شعاع امید میں فرماتے ہیں ؎

ایک شوخ کرن شوخ مثال نگہ حور ؛ آرام سے فارغ صفت جوہر سیماب
بولی کہ مجھے رخصت تنویر عطا ہو ؛ جبتک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرہ جہاں تاب
چھوڑونگی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو ؛ جبتک نہ اٹھیں خواب سے مردان گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز ؛ اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشم مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن ؛ یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرناب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواص معانی ؛ جن کے لئے ہر بحر پر آشوب ہے پایاب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں ؛ محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب
بت خانہ کے دروازہ پہ سوتا ہے برہمن ؛ تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہ محراب

اور تنگ نظر اور محدود وطنیت کے خلاف آخر میں یوں اعلان کرتا ہے ؎

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر ؛ فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

وطنیت کا تصور اقبال کے یہاں بہت بلند ہے مگر عام طور پر جدید شاعری ابھی وطنیت کے قدیم تصور سے معمور ہے اور یہ احساس زیادہ تر سیاسی مشکلات کو حل کرنے میں صرف ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ چونکہ اقبال ایک وسیع تخیل کے ساتھ ایک عمیق نظر بھی رکھتے ہیں اس لئے بہت جلد وہ وطنیت کے اس محدود تصور سے آگے بڑھ گئے جو چند سرمایہ داروں کے ہاتھ میں عوام مزدوروں کو پہنا دینے کا آلہ ہے اور جس کی غایت محض حاکموں کی تبدیلی ہے اور بس۔ ان کا نصب العین انسانیت کی تکمیل و ترقی ہے۔ اور انسان کی تکمیل کے لئے اُن کے خیال میں ایک ہی شاہراہ ہوسکتی ہے۔ اور وہ اسلام کی ہے دوسرے شعرا ابھی اس گنگا کو پار نہیں کرسکے ہیں۔ چونکہ اُن کی نظر زمانے کے سیاسی اور اقتصادی مسائل پر اتنی گہری نہیں ہے اس لئے وہ ابھی تک وطن میں ایک باغ عدن کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ یہ باغ عدن کبھی تو قدیم تہذیب کے عناصر پر قائم کیا جاتا ہے اور کبھی اس میں سب کو مساوات کا پیام سنایا جاتا ہے اور کبھی اس میں عصر حاضر کی سراسیمگی و انتشار سے جائے پناہ تلاش کی جاتی ہے۔ سیماب۔ جوش اور ساغر کی شاعری اسی قسم کی ہے۔

وطنی شاعری میں شروع ہی سے سیاسی نقطۂ نظر کام کر رہا تھا۔ اس کا سلسلہ بھی حالی سے شروع ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ ایک فاضل کی رائے میں "مسلمانوں کی تاریخ سیاسی میں، تاریخ معاشرت میں، تاریخ ادب میں، جہاں کہیں صحیح حرکت کی روانی دکھائی دے تو اس کا سلسلہ پانی پت کے اس ادیب، شاعر، مصلح، محب وطن اور سب سے زیادہ اس صاف دل اور فرشتہ خصائل انسان کی کاوش ذہنی کے چشمۂ صافی سے جا ملتا ہے جس کا نام الطاف حسین اور جس کا تخلص حالی تھا" حالی پر سرسید کے وقتی خیالات کا بہت گہرا اثر پڑا تھا۔ سرسید کی طرح ان کا بھی خیال تھا کہ مسلمانوں کو انگریزوں کے ساتھ میل جول کر کے ترقی کرنی چاہیئے۔ یہ فیصلہ حالی کے دماغ کا تھا مگر روشن ضمیر حالی کا دل اس میں شریک نہ تھا۔ انھیں اس امن میں لٹس اور قزاقی کی جھلک دکھائی دیتی تھی اور مساوات کے بلند آہنگ دعووں میں حاکم و محکوم اور رنگ و خون کا امتیاز صاف نظر آتا تھا۔ کالے اور گورے والی نظم سب نے پڑھی ہوگی جب حکومت کی پالیسی پر یہ بے باک طنز

ملاحظہ ہو ؎

تدبیر یہ کہتی تھی کہ جو ملک ہو مفتوح ؛ واں پاؤں جمانے کے لئے تفرقہ ڈالو
اور عقل خلاف اسکے یہ تھی مشورہ دیتی ؛ یہ حرف سبک بھول کے منہ سے نہ نکالو
پر رائے نے فرمایا کہ جو کہتی ہے تدبیر ؛ مانو اسے اور عقل کا کہنا بھی نہ ٹالو
کرنے کے ہیں جو کام وہ کرتے رہو لیکن ؛ جو بات سبک ہو اسے منہ سے نہ نکالو

اگرچہ اس قسم کی نظموں کی تعداد زیادہ نہیں تھی پھر بھی جو کچھ تھی قبل از وقت تھی۔ اور چونکہ ملکی سیاسیات عام طور پر اس کے خلاف تھیں اس لئے ان کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اور ہوا بھی تو اتنا خاموش کہ معلوم نہ ہوا۔ لیکن سیاسی آزادی کا تصور جو کانگریس کے ہاتھوں وجود میں آیا سرعت سے جڑ پکڑتا گیا۔ حالات اس کے لئے سازگار تھے اور جیسے جیسے تعلیم یافتہ اشخاص کی تعداد زیادہ ہوتی گئی یہ اپنے حقوق اور حکومت میں حصہ کے لئے جدوجہد کرتے گئے۔ اس جدوجہد کا عکس شبلیؔ، اکبرؔ اور چکبستؔ تینوں کے یہاں اپنے اپنے فرق سے ملتا ہے۔ شبلی کے متعلق ایک نقاد کی رائے ہے کہ یہ اگر شعر و شاعری کی طرف زیادہ توجہ کرتے تو دوسرے فردوسی نہیں تو پہلے اقبال ضرور ثابت ہوتے۔ بہر حال شبلی کے کلام میں سیاسی اور قومی نظموں کی تعداد بہت کافی ہے۔ کیفیت اور کمیت دونوں کے لحاظ سے یہاں بھی آپ کو حقوق جنگ اور اس جنگ کے مختلف پہلو ملیں گے۔ جو انیسویں صدی کے آخر میں شروع ہو گئی تھی۔ شبلی حریت پسند تھے۔ اور اگرچہ سرسید کے ادبی رفقا میں سے تھے لیکن ان میں اور سرسید میں جہاں تک سیاسیات کا تعلق ہے ہمیشہ اختلاف رہا۔ مولانا حالیؔ نے سرسید کی بعض رجعت پسندانہ حرکتوں کی تاویلیں کی ہیں مگر شبلی ہمیشہ ان پر اعتراض کرتے رہے اور غالباً ان کی علی گڈھ سے علحدگی کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ مولانا جماعت احرار کے حامی اور ان کے پرجوش مبلغ تھے مگر انھیں بھی ڈر لگا رہتا تھا ؎

دیکھ کر حریتِ فکر کا یہ دَورِ جدید ؛ سوچتا ہوں کہ یہ آئینِ خرد ہے کہ نہیں
اعتراضات کا انبار جو آتا ہے نظر ؛ اس میں کچھ قابل تسلیم و سند ہے کہ نہیں۔

جس نئی راہ میں ہیں جادہ پیما یہ لوگ ؏ کوئی اُس جادۂ مشکل کا بلد ہے کہ نہیں

پہلے گر شانِ غلامی تھی تو اب خیرہ سری ؏ اس دوراہے میں کوئی بیچ کی حد ہے کہ نہیں

مولانا جس چیز سے سب سے زیادہ گھبراتے تھے وہ تخریبی پروگرام تھا۔ اُس کے متعلق پوچھتے ہیں۔

تبکدے آپ نے ڈھائے بہت اچھا لیکن ؏ شرط یہ ہے کہ حرم کی بھی تو رکھئے بنیاد

خوف یہ ہے کہ بکھر جائے نہ شیرازۂ قوم ؏ خوف یہ ہے کہ یہ ویرانہ نہ ہو پھر آباد

اُنھوں نے اپنی دوسری نظموں میں حکومت پر زوال آنے کا ماتم کیا ہے اور چراغ کشتۂ محفل کا رونا رویا ہے مگر یہ درس اُن سے پہلے مسدس میں بھی دیا جا چکا تھا۔ اس لئے شبلی و حالی میں فرق رنگینی وسادگی کا ہے اور کچھ نہیں۔

یہ وہ وقت تھا کہ قومی پستی کا احساس عام ہو چلا تھا مگر ابھی تک شاعری زیادہ سے زیادہ حالی ہے اس میں استقبالی رنگ نہیں آنے پایا۔ اکبر نے اپنے مخصوص انداز میں سیاسیات، معاشرت، تہذیب (تمدن) مذہب و اخلاق سب پر تبصرہ کیا، مذہب میں اکبر قدامت پسند ہوں تو ہوں، سیاسیات کی دنیا میں یقیناً حُر کہے جا سکتے ہیں ؎

جج بنا کر اچھے اچھوں کا لبھا لیتے ہیں دل ؏ ہیں نہایت خوشنما دو جیم ان کے ہاتھ میں

چکبست نے سیاسی جدوجہد کا ذرا اور آگے تک ساتھ دیا۔ یہ بھی حقوقی نقطۂ نظر سے چلے تھے مگر انھوں نے مہاتما گاندھی کی تحریک اور جنگ سے بعد کا زمانہ بھی دیکھا تھا۔ اس لئے آخر آخر میں پکار اُٹھے تھے ؎

دم سے گاندھی کے رہے شور وفا بستی میں ؏ قیس جنگل میں رہے کوہ پہ فرہاد رہے

حکم حاکم کا ہے فریاد زبانی رک جائے ؏ دل کی بہتی ہوئی گنگا کی روانی رک جائے

قوم کہتی ہے ہوا بند ہو پانی رک جائے ؏ پر یہ ممکن نہیں اب جوش جوانی رک جائے

ہوں خبردار جنھوں نے یہ اذیت دی ہے
کچھ تماشہ نہیں یہ قوم نے کروٹ لی ہے
آج بے شوق وفا کا یہی جوہر ہوگا ؛ فرش کانٹوں کا ہمیں پھولوں کا بستر ہوگا
پھول ہو جائیگا چھاتی پہ جو پتھر ہوگا ؛ قید خانہ جسے کہتے ہیں وہی گھر ہوگا
سنتری دیکھ کے اس جوش کو شرمائیں گے
گیت زنجیر کی جھنکار پہ ہم گائیں گے

یہ وہ زمانہ تھا کہ عدم تشدد اور خلافت کی تحریک نے گھر گھر شاعر پیدا کر دئے تھے۔ اُن میں خیال کی گہرائی اور پختگی تو نہ ہوتی تھی مگر جوش بے حد ہوتا تھا۔ اور کچھ نہیں تو اس کی بدولت دار ورسن، خون شہیداں، قفس، گلستاں، باغباں، صیاد، جیسے رسمی اور روایتی الفاظ میں ایک واقعیت اور صداقت پیدا ہوگئی۔ مولانا محمد علی اور حسرت ان دونوں نے غزلوں میں جذبۂ آزادی کی تڑپ سے ایک خاص سوز وگداز پیدا کیا۔ حسرت کے یہاں دل کی بات پھر بھی دل میں رہتی ہے۔ مگر مولانا چوکنے والے نہ تھے صاف صاف پکارتے ہیں ؎

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی ؛ ہوس زیست ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی
حد ہے پستی کی کہ پستی کو بلندی جانا ؛ اب بھی احساس ہو اسکا تو ابھرنا ہے یہی
نقد جاں نذر کرو سوچتے کیا ہو جوہر ؛ کام کرنے کا یہی ہے تمہیں کرنا ہے یہی

مستحق دار کو حکم نظر بندی ملا ؛ کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

دور حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد ؛ ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
تیرے مقابلے کی کسے تاب ہو ولے ؛ میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

جنگ عظیم سے قبل آزادی کی جد وجہد ایک محدود طبقے کی طرف سے تھی ۔ اور دراصل اس جد وجہد کا مقصد یہ تھا کہ تعلیم یافتہ طبقے کے لئے بہتر میدان تلاش کئے جائیں ۔ حکومت میں حصہ ۔ ملازمتوں میں خاص رعایتیں اور شرح کا تعین ۔ ہندوستانی مال کی تجارت میں مراعات کا حصول ۔ سودیشی کی تحریک یہ سب اس لئے تھیں کہ حکمراں بدلے جائیں اور بجائے غیر قوموں کے اقتدار کے کمزور 'بے بس' خاموش عوام پر تعلیم یافتہ طبقہ یا سرمایہ دار طبقہ کا اقتدار قائم کیا جائے ۔ جنگ عظیم کے دوران میں ہندوستانیوں سے بڑے بڑے وعدے کئے گئے تھے ۔ جنگ کے بعد ان کا نتیجہ صرف یہ نکلا کہ اصلاحات درعایات کی ایک مزید قسط مل گئی ۔ سمند ناز پہ ایک اور تازیانہ ہوا ۔ اس بے چینی نے اقتصادی مشکلات سے مل کر ایک عام شورش کی شکل اختیار کرلی ۔ یہ شورش صرف عدم تشدد کے زمانے میں' یا سول نافرمانی کے زمانے میں موجود نہ تھی ۔ بلکہ برابر جاری ہے ۔ کبھی دب جاتی ہے کبھی اُبھر آتی ہے ۔ زندگی کی ہر رو کی طرح اس میں بھی مد وجزر آتا رہتا ہے ۔ مگر اس میں کئی نئی باتیں داخل ہوگئی ہیں ۔ ایک تو اب یہ حقوقی جنگ نہیں رہی بلکہ کھلم کھلا آزادی کی جنگ ہوگئی دوسرے اس کا مقصد اب ایک جماعت یا گروہ کا اقتدار نہیں بلکہ جمہور کا اقتدار قائم کرنا ہے ۔

اب تک اس قسم کے میلانات بیدار کرنے میں ہماری شاعری کا حصہ نہیں تھا ۔ دوسرے الفاظ میں ہماری شاعری بجائے سیاسیات کے میدان میں اجتہاد و رہنمائی کے سماج کے عام خیالات کی آئینہ داری پر قانع تھی ۔ اسے یوں سمجھئے کہ یہ تحریک شاعری کی وجہ سے آگے نہ بڑھی ۔ شاعری صرف پیچھے سے اسے مضبوط کرنے اور مدد پہنچانے پر قانع رہی ۔ مگر اقبال اور جوش کی شاعری میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ اقبال صرف شاعر ہی نہیں مفکر بھی ہیں اور جوش صرف نقیب ۔ اقبال جس مستقبل کی طرف اشارہ کرتے ہیں اس کے خط و خال بھی دکھاتے ہیں ۔ جوش آنے والے زمانے کے تصور میں اس قدر مست ہیں کہ اس کا کوئی خاکہ نہیں بیان کرتے ۔ اقبال کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ "ماضی" کے شاعر ہیں ۔ احمد علی کے الفاظ میں "اُس ماضی کے عشق میں جو اپنے مردے کبھی کا دفن کر چکا ہے ۔ اقبال رنج و محن کے ترانے گاتے ہیں اور چیختے چلاتے، روتے دھمکاتے ۔ قدیم گل وبلبل کے گیت گاتے ۔ ایک ناممکن اور بے معنی پان اسلامزم کی

دعوت دیتے ہیں۔ آگے چل کر یہی بزرخود غلط نقاد فرماتے ہیں کہ "اقبال کی شاعری بیماروں کی طرح زندگی سے گریز کرتی ہے اور حقیقت کو بہلانے کی خواہش سے پیدا ہوئی ہے۔ یہ ہم کو صرف غیر معمولی اور بے حرکتی کی طرف کھینچتی ہے اور اس سے زیادہ رجعت پسندانہ ہے۔" اگر تنقید کوئی مذہب ہے اور اس کی کوئی شریعت ہے تو یقیناً اس شریعت میں یہ الفاظ کفر کے مصداق ہیں۔ اقبال ماضی کے شاعر صرف اسی حد تک ہیں کہ وہ حالی اور اکبر دونوں کے نقش بہتر ہیں۔ حالی کی قنوطیت اور اکبر کا طنز دونوں اُن کے یہاں ملتے ہیں۔ مگر ان سب پر ان کی اپنی رجائیت غالب ہے۔ جو ان کے اپنے فلسفۂ زندگی کی پروردہ ہے۔ اقبال کا نصب العین عالم گیر انسانیت کی تکمیل ہے۔ یہ مقصد اُن کے نزدیک اتحادِ ملی ہی سے پورا ہو سکتا ہے۔ اور اس اتحادِ ملی کے لئے وہ ماضی کی بنیادیں مستعار لیتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ۔ ع ہے جنوں تیرا نیا' پیدا نیا ویرانہ کر۔ کے بھی قائل ہیں۔ اتحادِ ملی کے قیام کے لئے جس قسم کی زندگی کی ضرورت ہے اس کا راز بتاتے ہیں اور پستی و زبوں حالی کے احساس کے ساتھ ان کا مستقبل کی طرف اشارہ وہی کرتا ہے جو تھکی ہوئی روح کے ساتھ ایک نیا منظر کرتا ہوگا۔ مستقبل کی نئی دنیا کے لئے اقبال جن ہتھیاروں کی ضرورت سمجھتے ہیں انھیں دوسروں سے مستعار لینا انھیں گوارا نہیں۔ اس لئے کہ ان کے خیال میں اپنی ہستی کو پہچاننے کے بعد اس کی ضرورت نہیں رہتی۔

ہاں ضرورت اس بات کی رہتی ہے کہ ہستی کو پہچاننے کے بعد اس کو ثابت بھی کیا جائے۔ اس ثبوت کے لئے حرکت' پیکار' اور عمل کا فلسفہ سکھایا جاتا ہے۔ اس ضمن میں مغربی تہذیب کی غارت گری کا پردہ فاش کیا جاتا ہے۔ اور اس کی سرمایہ دارانہ ذہنیت کے خلاف " فرمانِ خدا فرشتوں کے نام " اور " لینن " جیسی نظموں میں صدائے احتجاج بلند کی جاتی ہے۔ فرمانِ خدا فرشتوں کے نام اُس نئی دنیا کا پتہ دیتا ہے جو اقبال تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ اس نظم کی خوبی اس وقت اور زیادہ ظاہر ہوتی ہے جب ہم " ضربِ کلیم " کی دوسری نظم " ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام " اور جوش کی نئی نظم " روحِ استبدادیت کا فرمان " پیشِ نظر رکھیں۔ اقبال کی شاعری کا امید افزا پہلو ان کی ایک اور نظم۔ شعاعِ اُمید سے ظاہر ہوتا ہے جس میں مشرق و مغرب کی ہر شب کو سحر کرنے کا عزم کیا گیا ہے۔ اس نظم کا ایک حصہ اوپر دیا جا چکا ہے۔

روس کی موجودہ حالت

انگریزی کے دو رسالوں The Nineteenth Century اور The Slavonic Review میں روس کی موجودہ حالت کے بارے میں دو مضمون نکلے ہیں۔ ایک مسٹر وکٹر کیزلٹ ایم پی کے چشم دید حالات پر مشتمل ہے، اور ایک جو مسٹر برنارڈ پیرز نے لکھا ہے یہ دکھاتا ہے کہ روس کی خارجی پالیسی پر ملک کی زندگی کس طرح اثر ڈال رہی ہے۔ مسٹر کیزلٹ ایک مالدار مگر شائستہ آدمی ہیں، مسٹر پیرز انشا پرداز اور نقاد۔ لیکن دونوں کے بیان میں کوئی اہم اختلاف نہیں۔ سوشلسٹ ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں، مگر اس وقت کوئی ایسی نمایاں عداوتیں نہیں ہیں جن کا ان دونوں میں سے کسی کی رائے پر اثر پڑتا، بلکہ جرمنی اور اٹلی کے خوف سے سرمایہ دار اور لورڈز و آبھی فاشزم کے مقابلے میں کمیونزم سے کسی قدر دوستی برت رہے ہیں۔

مسٹر کیزلٹ لکھتے ہیں:-

"میرا مقصد سیاسی رنگ کا مضمون لکھنا نہیں ہے اور نہ میں کسی کو قائل کرنا چاہتا ہوں۔ میرا مقصد تو بس یہ ہے کہ وہ اچھی اور بری باتیں جو میں نے دیکھیں بیان کر دوں۔ سوویٹ راج کے انجام کی نسبت ہم چاہے جو رائے رکھتے ہوں، اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اس وقت روس میں ایک عظیم الشان معاشرتی اور معاشی نظام کا تجربہ کیا جا رہا ہے، اور جسے بھی معاشیات، معاشرتی بہبودی، یا فن حکومت سے دلچسپی ہے اسے روس میں مطالعے اور مشاہدے کے لئے بہت کچھ سامان ملے گا۔

"میرا خیال ہے کہ میں اتنا بے تعصب تھا جتنا کہ ایسے معاملے میں کوئی ہو سکتا ہے، اور میں یہ طے کر کے گیا تھا کہ جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکا وہ دیکھوں گا اور اپنی رائے قایم کروں گا۔ واپسی پر مجھ سے کئی لوگوں نے پوچھا کہ آپ کو کچھ دیکھنے کی اجازت بھی ملی؟ میرا جواب یہ ہے کہ ہم جو کچھ

روس میں یہ سب دیکھ سکتے ہیں، سڑکوں پر لوگوں کو روزمرہ کے کاروبار میں مصروف دیکھ سکتے ہیں، گھروں کی، کارخانوں کی، دکانوں کی اور آرام گاہوں کی حالت دیکھ سکتے ہیں، یہ دیکھ سکتے ہیں کہ لوگ کیا کھاتے اور پہنتے ہیں، مزدوروں سے بات چیت کرسکتے ہیں۔ یہ موقعے ایسے ہیں کہ جن سے ہم عام حالت کا خاصا صحیح اندازہ کرسکتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ سوا ان عہدہ داروں کے جو اس کے لئے مقرر ہیں ہم سرکاری ملازموں سے مبادلہ خیالات نہیں کرسکتے، اور سیاسی مجرموں کے لئے جو قیدی باڑے (Concentration Camps) بنے ہیں ان کے اندر نہیں جاسکتے لیکن اس کی اجازت روس ہی میں کیا یورپ کے کئی اور ملکوں میں بھی نہیں دی جاتی۔

"تمہید کے طور پر میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ روس کا مغربی یورپ کے کسی ملک سے مقابلہ کرنا بہت ہی دشوار ہے۔ روس پہلے بھی ایک نیم مشرقی ملک تھا اور اب بھی ہے، وہاں کی زندگی کے معیار کو انگلستان، فرانس اور امریکہ کی معاشرت سے کوئی نسبت نہیں۔ یہ سمجھنے کے لئے کہ اس وقت روس میں کیا ہو رہا ہے ہم کو ترقی یافتہ مغربی ملکوں کی فضا کو ذہن سے بالکل نکال دینا چاہئے۔

"روس میں بوڑھے آدمی نہیں رہ گئے ہیں۔ جب کبھی کوئی سن رسیدہ آدمی نظر آتا ہے تو یہ سوچ کر تعجب ہوتا کہ وہ کیسے گذر کرتا ہوگا۔ روس میں بوڑھے لوگ "خارج" یا "بیباق" کردئے گئے ہیں، یا تو اپنے خیالات کے سبب سے یا اس لئے کہ وہ پچھلے بیس برس کی مصیبتیں برداشت نہ کرسکے۔

"پھر آپ کو ایسا ملک تصور کرنا چاہئے جس میں اس چیز کا جسے ہم مذہب کہتے ہیں نام ونشان نہیں۔ کسی روسی مزدور سے مسیح یا خدا کے متعلق گفتگو کرنا اتنا ہی فضول ہے جتنا کہ انگریز مزدور سے گوتم بدھ یا کنفیوشیس پر بحث کرنا۔ روس سے عیسائی مذہب اور خدا دونوں خارج کردئے گئے ہیں۔ اب الحاد کی تبلیغ کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا، اس لئے کہ نئی پود کی تربیت ایسی فضا میں ہوئی ہے جہاں خدا کے تصور کا کوئی ذکر ہی نہیں، اور روس کی موجودہ آبادی میں ستر فی صدی یہی نئی پود ہے،

جس کی پرورش سوویٹ حکومت کے اصولوں پہ ہوئی ہے۔ ہاں، مگر یہ بھی کہہ دینا چاہئے کہ ایک نصب العین، یعنی اپنے سے زیادہ بلند یا زیادہ روحانی قوت رکھنے والی ذات کی پرستش کرنے کی خواہش، جسے ہم میں سے بہتیرے آدمی کی سرشت میں شامل سمجھتے ہیں، آج کل روس میں آہستہ آہستہ اپنا اثر دکھا رہی ہے۔ خدا، مسیح اور پرانے اولیاؤں کی جگہ لینن اور سٹالن کو دی جا رہی ہے۔ ہر دکان، ہر سڑک، ہر ہوٹل اور اسٹیشن پر لینن اور لینن سے زیادہ سٹالن کی قدآدم تصویریں لگی ہوئی ملتی ہیں۔ کچھ دن ہوئے ایک مضمون چھپا تھا جس کا پہلا جملہ یہ تھا: "ہمارا رب سٹالن وہ سورج جس سے کہ ہم کو قوت اور جان حاصل ہوتی ہے..." قدیم وحشی نسلوں میں مذہب کی ابتدا یہیں سے ہوئی۔

"اسی طرح آپ ایسا ملک تصور کیجئے کہ جہاں ذاتی ملکیت نہیں ہے۔ لوگوں کے پاس اپنی ملکیت بہت کم ہے، اور اسے بڑھانے پر آمادہ کرنے کے لئے کوئی محرک نہیں۔ اگر آپ اپنی بنیادی ضروریات کے علاوہ کچھ خریدنا چاہیں۔ اور ایسی چیز آپ کو کسی دکان میں نظر بھی آ جائے، تو جہاں آپ رہتے ہوں گے وہاں اسے رکھنے کی جگہ نہ ہوگی اور آپ کے پڑوسی آپ پر شک کرنے لگیں گے......

"ظاہر ہے روس میں سیاسی آزادی نہیں، لیکن روس کے علاوہ اور ملک بھی ہیں جہاں آزادی نہیں۔ وہاں طبقے، نسل اور جنس کا امتیاز بھی نہیں... جب میں ہوائی جہاز سے اترا تو میرے اسباب کی باقاعدہ تلاشی لی گئی، ہر چھوٹی بڑی چیز نکال کر دیکھی گئی، ہر خط کھولا گیا۔ پہلے مجھے اس سے الجھن ہوئی، مگر پھر میں نے دیکھا کہ جو آدمی میری کتابیں اور خط پڑھ رہے تھے وہ انھیں الٹا پکڑے ہے۔ یہ وہاں کی دفتری کی حکومت کی شدت کارپردازی کا ایک نمونہ ہے۔ آپ کہیں جائیں، ٹیلیفون پر کسی سے بات کریں، آپ سے کوئی ملنے آئے، ہر ایک بات کی اطلاع حکومت کو پہنچائی جاتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی اطلاعات کو ترتیب دینا یا ان سے کام لینا کیسے ممکن

"غیر ملک والے اچھے ہوٹلوں میں رہنا چاہیں تو انھیں بہت خرچ کرنا پڑتا ہے، لیکن مجموعی حیثیت سے ہوٹل خاصے آرام دہ اور صاف ہوتے ہیں ... غیر ملکیوں کو کھانا افراط سے ملتا ہے، لیکن وہ ہوتا ہے روز ایک ہی قسم کا۔ سفارتوں کے متعلقین یا نامہ نگار ــ روس میں یہی غیر ملکی ملتے ہیں ـ سب کھانے کی چیزیں باہر سے منگواتے ہیں۔ سرکاری ہوٹلوں کے منتظم، پارٹی کے کار پرداز اراکین ہیں، اور غیر ملکیوں کی نقل و حرکت پر صحیح اور مفصل رپورٹیں بھیجتے ہوں گے، مگر وہ ہوٹلوں اور کھانے پینے کے انتظام میں مستعد نہیں کہے جا سکتے۔ اس سبب سے کھانا دن کا سب سے غیر دلچسپ مشغلہ بن جاتا ہے۔ اور سیاحوں کی طرح میں بھی سمجھا تھا کہ روس میں "کاویار"[۹۱] سستے اور افراط سے ملیں گے، مگر 'تازہ' 'کاویار' مجھے صرف ماسکو میں ملے اور اسے بھی ہم لندن یا نیویارک میں گھٹیا ہی کہتے۔ شاید اچھا 'کاویار' باہر بھیج دیا جاتا ہے۔

"ایک اور بات جو میں نے محسوس کی وہ یہ ہے کہ روس میں کسی قسم کے بھی موٹر نہیں[۹۲]۔ لینن گراد کے نفسکی پروسپکٹ پر، جو دنیا کی سب سے خوبصورت اور کشادہ سڑکوں میں سے ہے، دوپہر کو نکل جائیے، اور اگر آپ موٹر پر سوار ہیں تو غالباً بس آپ ہی کا ایک موٹر سڑک پر جا رہا ہوگا۔ ٹریمیں بہت ہیں، اور ان میں جتنے آدمی اندر ہوتے ہیں اتنے ہی باہر ٹنگے اور ٹنگے ہوتے ہیں۔ لینن گراد کی آبادی قریب تیس لاکھ ہے، ماسکو کی آبادی چالیس پچاس لاکھ، لیکن ان دونوں شہروں میں بس گنتی کے موٹر اور لاریاں ہیں۔ اوڈیسا یورپ کے سب سے آراستہ اور خوش نما شہروں میں سے ہے، لیکن وہاں بھی میں شام کو گھومنے نکلا تو صرف پانچ موٹر دکھائی پڑے اور ٹیکسی ایک بھی نہیں تھی۔ گاڑیوں کی کمی شاید اس لئے تعجب کی بات

---

۹۱ ایک قسم کی مچھلی کے انڈے، جو خاص طرح سے تیار کئے جاتے ہیں۔

۹۲ اس کے خلاف یہ روایت ہے کہ فورڈ کمپنی نے روس میں ایک شاخ کھولی ہے جس نے کئی لاکھ موٹر تیار کر دئے ہیں اور موٹروں کی مانگ بہت بڑھ رہی ہے۔

نہیں کہ روس میں بڑے شہروں اور اُن کے اس پاس کے علاوہ کہیں بھی ایسی سڑکیں نہیں ہیں جو واقعی سڑکیں کہلانے کے قابل ہیں۔ اضلاع میں تو ایسی سڑکیں ہی نہیں جن پر کسی قسم کی گاڑی چلائی جا سکے۔ میرے بعض ملاقاتی جو سرحد سے موٹر پر ماسکو گئے انھیں سفر میں گیارہ دن لگ گئے۔ میں نے لمبے سفر ریل پر کئے، اور یہ بھی بہت سست تھیں اگرچہ اکسپرس کہلاتی ہیں۔ وہ بھچر مچر کرتی ہوئی تیس چالیس میل فی گھنٹہ چلتی ہیں، مگر پٹریاں اتنی خراب ہیں کہ ریل میں کتاب پڑھنا تقریباً ناممکن ہے۔

"تعلیم کو دیکھئے تو اس میں شک نہیں کہ بعض اعتبار سے سوویٹ نے بہت کام کیا ہے کہتے ہیں کہ آبادی میں قریب اسی فی صدی لکھنا پڑھنا جانتے ہیں۔ اوڈیسا میں میں نے نئے طرز کا ایک اسکول دیکھا جو بہت ہی اچھا تھا۔ عمارت خوشنما تھی، کمرے کشادہ اور ضرورت کے مناسب تھے، استاد بہت مہربان اور جوش کے ساتھ کام کرنے والے لوگ تھے، بچوں کی دیکھ بھال اچھی طرح کی جاتی تھی۔ بچوں میں سے بعض کو دن کا کھانا اسکول کی طرف سے ملتا تھا۔ لیکن اس تعلیم کے باوجود یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں جن کو خبر ہے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ غیر ملکوں کے اخبار روس کے اندر لے جانا یا منگوانا منع ہے، اور روس کے اخباروں میں ایسی ہی خبریں نکلتی ہیں جو حکومت چاہتی ہے۔ ایسے انگریز یا امریکن کی ذہنیت کا اندازہ لگانا مشکل ہے جسے بیس برس تک وہی معلومات حاصل ہوئی ہوں جو حکومت اس کے لئے مناسب سمجھتی ہو۔

"اب کارخانوں اور مزدوروں کے بارے میں کچھ سن لیجئے۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ روس میں بے روزگاری نہیں ہے، اور میں نے اس کی ظاہری علامتیں بھی نہیں دیکھیں۔ تمام کارخانے قریب قریب پورے وقت کام کر رہے تھے۔ بے روزگاری نہ ہونے کے علاوہ اور بھی چند خوبیاں قابل ذکر ہیں۔ بیمار مزدوروں کو پوری مزدوری ملتی رہتی ہے، اور ہر ایک کو پوری تنخواہ پر سال میں تین چار ہفتے کی چھٹی دی جاتی ہے۔ آرام کے لئے اچھے "کیمپ" ہیں، ایسے پارک بھی بہت ہیں جہاں آرام اور تہذیبی تفریح کا انتظام ہے۔ بچوں کی پرورش گاہیں اور کھیل کود کے میدان ہیں، کھلی ہوائیں

سینما اور موسیقی کا انتظام کیا جاتا ہے۔ میں غلط فہمی پیدا نہیں کرنا چاہتا کہ روس کی بے شمار آبادی کے لئے اس طرح کی چیزوں کا کافی انتظام ہو گیا ہے، لیکن ایسے جو ادارے میں نے دیکھے وہ بہت سلیقے سے چلائے جا رہے تھے، مزدور بڑی تعداد میں ان سے فائدہ اٹھاتے اور ان کی قدر کرتے تھے۔

" روس میں کام کا 'ہفتہ' پانچ دن کا ہوتا ہے، اور ہر روز سات گھنٹے کام کیا جاتا ہے، پھر ایک دن آرام کا ملتا ہے۔ اس طریقے کا مغربی یورپ کے قاعدے سے مقابلہ کیا جائے تو روسی مزدور سمجھئے دس فی صدی فائدے میں رہتے ہیں۔ روس اور مغربی یورپ میں جو اجرت دی جاتی ہے اس کا مقابلہ کرنا آسان نہیں۔ لیکن میں نے اس طرح حساب لگایا ہے کہ روس اور انگلستان میں جو اجرت ملتی ہے اس کی قوت خرید کا مقابلہ کیا۔ روس میں اوسطاً مزدور کو چھ روبل روزانہ ملتے ہیں، اور انگلستان میں چھ شلنگ، اس لئے اگر ہم یہ دیکھیں کہ چھ روبل سے کیا کیا خریدا جا سکتا ہے اور چھ شلنگ سے کیا، تو ہمیں اس کا اندازہ ہو جائے گا کہ کس کو زیادہ ملتا ہے۔ انگلستان میں چار پاؤنڈ کی ڈبل روٹی ۱/۲ شلنگ کو ملتی ہے، روس میں اس کی قیمت تین شلنگ ہوگی۔ انگلستان میں ایک گیلن دودھ دو شلنگ کو ملتا ہے، روس میں چھ شلنگ کو۔ مکھن کا نرخ روس میں بیس شلنگ فی سیر ہے، اور اچھے قسم کا گوشت دس شلنگ فی سیر۔

" یہ سن کر آپ فوراً پوچھیں گے کہ گرانی کا یہ حال ہے تو لوگوں کا گذر کیسے ہوتا ہے۔ اس کا اصل جواب یہ ہے کہ جس چیز کا آدمی کو پتہ نہ ہو اس کے نہ ہونے کا خیال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ اس وقت روسی یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی حالت دوسرے ملکوں کے مزدوروں سے کہیں بہتر ہے۔ اور پھر گرانی کے ساتھ آسانیاں بھی ہیں جو نقصان کو پورا کرتی ہیں۔ مکانوں کا کرایہ کم ہے، کارخانوں میں دن کا کھانا سستے داموں مل جاتا ہے، ایسی عورتیں بہت کم ہیں جو کوئی کام نہیں کرتیں، جو کام کرتی ہیں انھیں مردوں کے برابر اجرت ملتی ہے، اور اس طرح ہر خاندان کی آمدنی دوگنی ہو جاتی ہے۔ ایک جواب یہ بھی ہے کہ روسی سفید گیہوں کی روٹی جیسی نفیس چیزیں کھاتے ہی نہیں، ان کی پرانی غذا باجرے کی روٹی

اور کرم سکنے کا سوپ ہے۔ دودھ ایک نعمت ہے جس پر صرف بیماروں اور بچوں کا حق مانا جاتا ہے کپڑوں کا قصہ یہ ہے کہ ایسے موقعے بہت کم ہوتے ہیں جب نئے کپڑے پہننا ضروری سمجھا جائے یا لوگ دوسروں سے بہتر کپڑے پہننے کا شوق کریں۔ میں نے روس میں ایک آدمی کو بھی اچھے کپڑے پہنے نہیں دیکھا اور نہ کسی کے پیر میں کارآمد اور اچھے بنے ہوئے جوتے دیکھے۔ مجھے شاید یہ بتا دینا چاہئے کہ اب بورژوا معاشرت کی خصوصیات بھی چوری چھپے پھیل رہی ہیں۔ عورتیں معلوم کرنا چاہتی ہیں کہ بال بنانے کے اور لباس کے کون سے نئے فیشن نکلے ہیں، اور لوگوں کی اس طرف توجہ اتنی بڑھ گئی ہے کہ حکومت نے بھی صاف ستھری پوشاک، روزمرہ داڑھی بنانا اور اسی طرح کی اور بورژوا عادتوں کو پھیلانا شروع کر دیا ہے۔

" یہ یقین کرنا دشوار ہے کہ رہائش کا انتظام کسی زمانے میں آج کل سے بھی بدتر تھا۔ میں نے صرف لینن گراد اور ماسکو دیکھا، جہاں کی آبادی انقلاب کے بعد سے بہت زیادہ بڑھ گئی ہے ان دونوں شہروں میں کسی خاندان کے قبضے میں ایک سے زیادہ کمرہ ہونا غیر معمولی بات ہے جو نئے مکان بنے ہیں ان کا مسالا اتنا خراب ہے کہ وہ شاید ہی ایک دو سال سے زیادہ ٹھہر سکیں۔ اضلاع میں لڑائی کے بعد سے رہائش کا کوئی انتظام کیا ہی نہیں گیا ہے، لیکن میں نے سنا ہے کہ بعض نئے صنعتی مرکزوں میں شہروں کی ترتیب اور تعمیر میں بڑی کوششیں کی گئی ہیں۔

" میں یہ بتا چکا ہوں کہ مرد عورت میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا، نہ گھریلو زندگی میں اور نہ کارخانوں میں۔ مثلاً عورتیں لوہے کے کارخانوں میں بھی بالکل وہی کام کرتی ہیں جو کہ مرد کرتے ہیں، اور ریل کی پٹریوں پر بھی اکثر کام کرتی نظر آتی ہیں۔ پچھلے سال دو سال میں طلاقیں بہت کم لی گئی ہیں، زیادہ تر اس سبب سے کہ طلاق کا خرچ بہت بڑھ گیا ہے۔ پہلی طلاق بہت سستی ہوتی ہے، دوسری اور تیسری مرتبہ طلاق لینے میں اتنا خرچ نہیں ہوتا کہ آدمی برداشت ہی نہ کر سکے۔ اس کے بعد پھر سرکاری ٹیکس اتنا بڑھ جاتا ہے کہ صرف بڑی تنخواہ پانے والے سرکاری ملازم اسے ادا کر سکتے ہیں۔ شوہر اور بیوی دونوں میں سے جو چاہے مخصوص دفتر میں کاغذات

لے کر جا سکتا ہے، اور طلاق مانگنے پر مل جاتی ہے۔ بعض مرتبہ تو دوسرے فریق کو طلاق کی خبر اسی وقت ہوتی ہے جب اس کے پاس باضابطہ سرکاری اطلاع بھیجی جاتی ہے۔ اب حکومت اور کومیونسٹ پارٹی دونوں کی طرف سے کوشش کی جارہی ہے کہ مردوں عورتوں میں اندھا دھند تعلق نہ ہو اور ان کا رشتہ خاندانی زندگی کی صورت اختیار کرے، بلکہ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ والدین بچوں سے محبت کریں اور بچے والدین کا ادب کریں، جیسے کہ انقلاب سے پہلے قاعدہ تھا۔

"خریداری ایک نہایت پیچیدہ مگر دلچسپ کارروائی ہے۔ ہر دکان سرکاری دکان ہے، کسی کو کچھ بیچنے سے غرض نہیں۔ میں ماسکو میں ایک کھلونوں کی دکان میں گیا۔ دکان والے تہذیب سے پیش آئے مگر کسی کو مجھ سے مطلب نہیں تھا۔ خریدنے کی کارروائی خاصی لمبی ہوتی ہے۔ پہلے آپ کو چیز پسند کرنا اور اس کی قیمت معلوم کرنا ہوتا ہے، پھر دکان کے ایک اور آدمی کے پاس جا کر دام دینا اور رسید لینا۔ آخر میں رسید کو پہچانا اور مال وصول کرنا ہوتا ہے۔ یہ کارروائی لمبی ہر حال میں ہوتی ہے، لیکن ان دکانوں میں جہاں مجمع زیادہ ہوتا ہے، مثلاً جہاں کھانے کی چیزیں، شراب یا کتابیں بکتی ہیں، وہاں قطار میں کھڑے ہو کر اپنی باری کا انتظار کرنا عام قاعدہ سا ہو گیا ہے۔ پھر خریدی ہوئی چیز کو رکھنے یا لپیٹنے کے لئے آپ کو اپنا بیگ یا کاغذ لے جانا چاہئے، اور دودھ یا کریم لینا ہو تو اپنا برتن ساتھ رکھئے۔ ایک دن ماسکو میں ہم نے ایک بڑی لمبی قطار ایسی دکان کے سامنے دیکھی جہاں وہ گوشت بکتا ہے جو اچھے حصے نکال لینے کے بعد بچ رہتا ہے۔

"روس کی فوجی اور ہوائی قوت کسی ایسے دشمن کے دانت کھٹے کرنے کو کافی ہے جس کی جنگجوئی اسے روس پر حملہ کرنے پر مائل کرے۔ مجھے بہت معتبر ذریعوں سے معلوم ہوا ہے کہ فوج مستعد اور کارپرداز ہے، اسے پیٹ بھر کھلایا جاتا ہے اور اس کی ہر ضرورت پوری کی جاتی ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ روس جیسے پرولتاری ملک میں جہاں ہم سمجھتے کہ فوجی افسر بھی عام سپاہیوں میں سے منتخب کئے جاتے ہوں گے وہاں ایسا نہیں ہے، بلکہ افسر فوجی اسکولوں کے چنے ہوئے طلبا ہوتے ہیں جنھیں اسکول سے فارغ ہونے کے بعد خاص ٹریننگ دی جاتی ہے۔ حال ہی میں سوویٹ فوج میں کپتان، کرنل اور جنرل کے

پرانے خطابات دینا جاری ہوگیا ہے۔

"میں اس مسئلے پر تفصیل سے بحث نہ کروں گا کہ روس میں مجرموں کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا جاتا ہے، لیکن روسی طریقہ دلچسپ ضرور ہے۔ بولشیوو نامی اصلاحی قید خانے میں جو بہت مشہور ہے قریب چار ہزار نوجوان مجرم ہوں گے۔ یہ ادارہ جس کا انتظام نہایت اچھا ہے اور ایسے ہی لوگوں کے سپرد کیا گیا ہے جو اس کے لئے موزوں ہیں، کئی اعتبار سے ایک نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ چوری اور قتل روس میں ایسے جرم نہیں ٹھہرائے جاتے کہ جن کا کسی سے سرزد ہونا اس کے لئے شرم اور ندامت کا باعث ہو۔ بلکہ یہ ناقص نظام معاشرت یا خراب تربیت کے نتیجے سمجھے جاتے ہیں۔ ساری برائی سیاسی جرموں میں ہے' اور قیاس کیا جاتا ہے کہ اس وقت دو سے لے کر تین لاکھ سیاسی مجرم مختلف قیدی باڑوں میں بند ہیں۔ تعمیر کے تقریباً تمام بڑے کام — مثلاً بحر سفید کی نہر سیاسی مجرموں کی محنت سے انجام دئے گئے۔ یہ کام کرانے کی سب سے سستی ترکیب ہے، اور چونکہ روس میں پولیس کا محکمہ مزدور فراہم کرتا ہے' انجینیرنگ کے تمام بڑے کام اسی کے سپرد کئے جاتے ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں ایک ہولناک قحط پڑا، جس میں پچاس لاکھ اور ایک کروڑ کے درمیان جانیں ضایع ہوئیں۔ لیکن جو سرکاری خبریں کرملن* سے بھیجی گئیں ان میں کسی ایسے حادثے کا ذکر نہیں تھا۔ سرکاری اطلاعات تو شاید سیاسی مجرموں کے وجود سے بھی انکار کریں۔ لیکن اس کو کوئی کیا کرے۔

"روس کی خارجی پالیسی ایک بہت بڑا موضوع ہے جس پر یہاں صراحت سے بحث نہیں کی جا سکتی۔ اگر کوئی بات یقینی ہے تو یہ کہ اس وقت روس کسی پر حملہ نہیں کرنا چاہتا' اس کے مدبروں کو صرف اندرونی زندگی کی تعمیر اور اصلاح کی فکر ہے۔ خود کمیونسٹ پارٹی کے اندر اس معاملے میں اختلاف رائے ہے کہ غیر ملکوں میں پروپگنڈا اور مالی امداد کے ذریعے انقلاب برپا کرنا چاہئے کہ نہیں۔ ہسپانیہ میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے باوجود سٹالن اور اس کے حامی کم از کم فی الحال ایسی ترکیبوں سے دنیا میں

---

* کرملن Kremlin ماسکو کا پرانا شاہی محل جس میں اب حکومت کے دفتر ہیں۔

انقلاب پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرنا چاہتے، اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ جب تک سٹالن زندہ ہے کوئی اس کی جگہ پر قبضہ نہ کر سکے گا۔

"روس کو دیکھ کر میں نے جو رائے قائم کی وہ مجموعی طور پر یوں بیان کی جا سکتی ہے۔ روس میں اچھی باتیں ہیں، اگر مزدوروں اور کارخانوں کی حالت کو، فراغت کے موقعوں کو، بچوں کی پرورش گاہوں اور عام آرام گاہوں جیسے اداروں کو، عجائب خانوں کی دیکھ بھال اور فنون لطیفہ کی سرپرستی کو دیکھئے، دوسری طرف معمولی سیاح کو ملک کی حالت دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ ایک بہت بڑا "غریب واڑہ" ہے، بدنما، بے لطف، یکساں، نہ رنگ، نہ باغ، نہ پھول، نہ رنگینی، نہ جگہ جگہ اور آدمی آدمی میں فرق، نہ آسائش۔ روس میں میں نے جو تین ہفتے گذارے وہ دلچسپ تو ضرور تھے مگر دل پر بھاری بھی گذرے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کوئی ملک کو پیسے ڈالتا ہے۔ مگر میں یہ بھی صاف صاف کہدوں گا کہ اگر اس وقت ووٹ لیا جائے تو اسی نوے فی صدی موجودہ حکومت کو قائم رکھنے کی رائے دیں گے۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہوگی کہ زندگی کا اور کوئی طریقہ ان کے علم میں نہیں، کچھ یہ کہ حکومت کا پروپگنڈا بہت اچھا اور ہمہ گیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ ایک طرح سے خوش بھی رہتے ہیں۔۔۔"

مسٹر پیرز لکھتے ہیں:-

"جرمنی اور جاپان کے درمیان جو اینٹی کومنٹرن (کومیونزم کے خلاف) معاہدہ ہوا اور جس کو فاشسٹ اٹلی کی ہمدردی بھی حاصل تھی اس کے شایع ہونے سے روس کی حالت زیادہ نازک ہوگئی ہے، اور اس معاملے میں جو مسائل درپیش ہیں ان پر ایک نظر ڈال لینا بیکار نہ ہوگا۔

"ہم کو یہ کبھی نہ بھولنا چاہئے کہ ستالن اور تروتسکی میں جو جھگڑا تھا، اور جس کے سبب سے تروتسکی آہستہ آہستہ کومیونسٹ پارٹی اور پھر روس سے بے دخل کر دیا گیا اس کی بنیاد اس مرکزی مسئلے پر تھی کہ آیا سوشلزم کا ایک ملک میں قائم رہنا ممکن ہے جب باقی دنیا ساری سرمایہ دار رہے، یا نہیں۔ ستالن کا دعوی تھا کہ ایسا ممکن ہے، تروتسکی کو اس سے انکار تھا، اور اس کا عقیدہ تھا کہ سب سے پہلے اور نفع نقصان کا خیال کئے بغیر عالم گیر انقلاب پیدا کرنا ناگزیر ہے۔ ہمیں اس بات پر زور دینے کی ضرورت نہیں کہ

سوشلزم کی تبلیغ کی اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی کہ اس کو کسی ایک ملک میں کامیاب کر کے دکھایا جائے۔

" سٹالن کے دعوی کا لازمی نتیجہ پنج سالہ صنعتی، زراعتی اور تعلیمی منصوبے تھے۔ ان کو عمل میں لانے کے لئے انتہائی بیدردی درکار تھی۔ صنعتی منصوبے کی کامیابی کے لئے ضروری تھا کہ روس سے خام مال، اور خصوصاً کھانے پینے کی چیزیں جن کی ملک میں اشد ضرورت تھی باہر بھیج دی جائیں، اور آئندہ مفاد کی امید میں سب کو اپنا پیٹ کاٹنا پڑا۔ "نئی معاشی پالیسی" کے زمانے میں کسانوں نے صاف ظاہر کر دیا تھا کہ وہ زراعت کو شخصی کاروبار کی صورت دینا پسند کرتے ہیں، اور ۱۹۲۳ء میں سوویٹ حکومت نے جو نظام عمل شایع کیا اس میں کسانوں کا یہ مطالبہ بڑی حد تک منظور بھی کر لیا گیا تھا۔ اس حالت میں کسانوں کو اجتماعی کاشت پر مجبور کرنا کاروبار کی گھڑی کو روکنا ہی نہیں بلکہ اسے الٹا چلانا تھا۔ اور اس کا نتیجہ ایک طرح کی خانہ جنگی ہوئی جس میں کسی فریق نے دوسرے پر ذرا بھی ترس نہیں کھایا۔ لیکن اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ دونوں منصوبے، زراعتی اور صنعتی، زیر عمل ہیں۔ صنعتی منصوبے نے روس کو پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ بھاری مشینری بنانے کے لائق کر دیا ہے، جس کا ایک ضمنی اثر یہ ہوا ہے کہ مدافعت کی ایک قابل اعتبار صورت نکل آئی ہے اور ایک کمی پوری کر دی گئی ہے جو پچھلی جنگ میں بہت محسوس کی گئی تھی۔ ۱۹۳۶ء کے شروع میں تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا تھا کہ کارخانے کی بھاری مشینری تیار ہو گئی ہے اور استعمال کی چیزیں بہت تیزی کے ساتھ بنائی جانے لگی ہیں، بلکہ حال کے میزانئے میں ان کی تیاری کے لئے مقابلتاً بہت زیادہ سرمایہ مخصوص کر دیا گیا ہے۔ صنعتی منصوبے کے متعلق اسی طرح یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن اس میں شک نہیں کہ ملک کے بہت بڑے حصے میں اجتماعی کاشت ہو رہی ہے، اور حکومت اور کسانوں کے درمیان جنگ کی حالت نہیں ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ زرعی آلہ جات کو بہتر سے بہتر بنا دینے سے کسانوں کی اور ضروریات پوری کرنے کا پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ مستحکم انتظام ہو گیا ہے اور موسم اور فصل کی تلون مزاجی لوگوں کو پہلے کی طرح پریشان نہیں رکھتی ہے۔ زیادہ اہم یہ بات ہے کہ اجتماعی کاشت کے اصولوں کو نظر ثانی کے بعد جو شکل دی گئی ہے اس میں کسان کی جبلت اور خواہشوں کا بہت زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے۔ بہر صورت، یہ ایک تعمیری پروگرام تھا جس کا مقصد ملک کا اجتماعی مفاد تھا، اس نے نوجوانوں میں ذوق

اور ولولہ دوبارہ پیدا کر دیا ہے جس نے شروع میں ان کے حوصلے بڑھائے تھے اور انھیں ذمہ داری محسوس کرنے اور خود سوچ کر آگے قدم بڑھانے کا موقع دیا ہے۔

"یہ ایک قدرتی بات تھی کہ جب ستالن نے اپنی پوری توجہ ملک کے تعمیری کاموں کے لئے وقف کردی تو عالم گیر انقلاب کی کمیٹی کے معاملات پس پشت ڈال دئے گئے، یہاں تک کہ کئی سال تک کمیٹی کا جلسہ نہیں ہوا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ تروتسکی کی شکست کے بعد اس کمیٹی نے یورپ کے مقابلے میں ایشیا کی طرف زیادہ توجہ کی، اور یقیناً اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان کی عداوت زیادہ سخت ہوگئی۔ اسی کی بدولت جاپان نے زیادہ اصرار اور زور کے ساتھ ایشیا کی قیادت کا دعوی کیا، اور اس دعوی نے سوویٹ پالیسی کو مخمصے میں ڈال دیا۔

— پنج سالہ منصوبہ تکمیل کو پہنچا نہیں تھا جب ہٹلر کے جرمنی پر حاوی ہو جانے سے روس کے آسمان پر ایک نئے طوفان کے آثار نظر آنے لگے، اور سوویٹ روس کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ ہٹلر نے اپنی کتاب "میری جد و جہد" میں جو دھمکیاں روس کے ایک حصے کو ہڑپ کر جانے کی دی تھیں وہ بعد کو واپس نہیں لی گئی ہیں، بلکہ اس کے برخلاف اب تک پالیسی کے بارے میں جو اعلانات کئے گئے ہیں ان میں برابر دہرائی جا رہی ہیں۔ اس نے ستالن کی حکمت عملی کے مدافعانہ پہلو کو اور واضح کر دیا ہے، اور واقعی روسیوں کے ذہن میں اب ملک کا تصور، اگرچہ اسے "سوویٹ وطن" کا نام دیا گیا ہے، بہت زیادہ اثر رکھتا ہے۔ اب یہ ناگزیر ہو گیا ہے کہ غیر ملکوں میں دوست تلاش کئے جائیں، اور لتوی نوف نے یہ کام بڑی مستعدی سے انجام دیا ہے۔ اس نے بڑی کوشش کے بعد ریاستہائے متحدہ کو اس پر آمادہ کیا کہ سوویٹ نظام کو باضابطہ حکومت تسلیم کر لے، اس نے روس کو بین الاقوامی اتحاد میں شامل کرایا، جہاں اس کی حیثیت بہت ممتاز رہی ہے، اس نے انگلستان اور فرانس سے تعلقات بڑھائے اور فرانس اور چکوسلوواکیا سے اس نے مدافعانہ معاہدے کئے ہیں جن کا مقصد موجودہ صورت حال کو قائم رکھنا ہے، کیونکہ اس میں ذرا سا رد و بدل بھی ستالن کے تعمیری کام کے لئے مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔ اسی درمیان میں ان قوتوں نے جو موجودہ صورت سے

مطمئن نہیں تھیں، یعنی جرمنی، اٹلی اور جاپان، انھوں نے اپنے درمیان زیادہ اتحاد عمل پیدا کر لیا ہے۔

" خارجی پالیسی کے پہلو بہ پہلو روس کے اندر بھی ایک تحریک جاری رہی ہے جس کا اثر ۱۹۳۲ء سے بعد کے قوانین میں صاف نظر آتا ہے۔ اس تحریک کا مقصد یہ ہے کہ ملک اور حکومت کو مضبوط اور مدافعت کے لئے تیار کر لے، اور حکومت نے بہت سی غیر ضروری اور مبالغہ آمیز خصوصیات کو دور کر کے اسی پالیسی کے مناسب چلن اختیار کیا ہے۔

" پچھلے تین سال کے عرصے میں جو تبدیلیاں روس میں ہوئی ہیں وہ صحیح معنی میں تبدیلیاں ہیں اور بہت بڑی تبدیلیاں ہیں۔ نظر ثانی کے بعد اجتماعی کاشت کے جو قواعد اتحاد بنے ہیں ان میں خاص خیال اس کا رکھا گیا ہے کہ افراد کو زیادہ ڈھیل دی جائے، جیسا کہ مغربی یورپ کے اتحادی زرعی کاروبار میں ہوتا ہے، اور یہ قواعد کسانوں کو اپنے کھیتوں کے انتظام میں بہت زیادہ آزادی دیتے ہیں اور شخصی ملکیت کا حق بھی بہت بڑھا دیا گیا ہے۔ کسان اب اپنا ذاتی گھر، تین ایکڑ کا باغ ایک یا زیادہ گائیں، اور جتنے سور اور مرغیاں حاصل کر سکے رکھ سکتا ہے۔ ہر شخص کی آمدنی اس کی ملکیت قرار دی گئی ہے، قانوناً محفوظ کر دی گئی ہے، اور موروثی مانی جاتی ہے، اسی وجہ سے سیونگز بنک میں خوب روپیہ جمع رہتا ہے۔ بہت سے کسان جو جلا وطن کر دئے گئے تھے اب وطن واپس بھیج دئے گئے ہیں۔ سوویٹ کے زرعی نظام میں بس تجارت اور اجرت پر کام کرانے کے اصول کی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے بس

" تعلیمی اور معاشرتی پالیسی میں بھی ایسا ہی بین رجحان نظر آتا ہے۔ والدین کے حقوق اور اختیارات اب بحال کر دئے گئے ہیں اور بچوں کی تربیت میں اب ان کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ نوجوانوں میں غنڈہ پن ہر طرح سے روکا جاتا ہے۔ طلاق کے معاملہ میں اگر ایک فریق کو اختلاف ہو تو مسئلہ عدالت میں پیش کیا جاتا ہے، حمل گروانا اب بہت برا مانا جاتا ہے اور اس کی سختی سے روک ٹوک کی جاتی ہے۔ یونیورسٹی کے داخلے پر جو پابندیاں طبقوں کی تفریق کی بنا پر لگائی گئی تھیں، یعنی یہ کہ پرانے بورژوا خاندانوں کے لوگ اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکتے تھے، وہ موقوف کر دی

گئی ہیں، اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں تاریخ اور جغرافیہ جیسے مضامین کی تعلیم پہلے کی طرح خالص علمی اصولوں پر دی جاتی ہے[۵۱]، اس نقطہ نظر سے نصاب کی تمام کتابوں کی تصحیح کی گئی ہے، اور اس دور کے نئے قواعد میں وہ قانون بہت معنی خیز ہے جس کا مقصد "بچے کے ذہن پر سیاسی اور مدنی تعلیم کے بوجھ کو حد سے زیادہ بھاری ہو جانے کو" روکنا ہے۔ مذہب اور مذہبی تعلیم کے خلاف جو احکامات جاری ہوئے تھے وہ ابھی منسوخ نہیں کئے ہیں، لیکن ان پر عمل کرنے کی نہ تاکید کی جاتی ہے نہ کسی کو اس کی پرواہ ہے۔

"یہ سب باتیں اس نئے دستور کی ایک ضروری تمہید تھیں جو کہ اب باقاعدہ نافذ ہو گیا ہے، ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ اس معاملے میں پیش قدمی خود حکومت نے کی، بلکہ ابتدا میں خود کومیونسٹ پارٹی نے، جو اب تک ہمیشہ ہر مسئلے پر بحث کرتی رہی ہے قبل اس کے کہ وہ عمل درآمد کے لئے حکومت کے سپرد کیا جائے۔ نئے دستور نے قومی نمائندگی کو جاری کیا ہے جو مردوں عورتوں دونوں کے غیر مشروط حق رائے دہندگی اور خفیہ ووٹ کے اصول پر مبنی ہے یہ اصول کومیونسٹ حکومت نے شروع میں ترک کر دیا تھا۔ ملک کی نمائندہ جماعت ملک کی فرماں روا ہے، اور وہی یا تو براہ راست یا ایک مستقل کاؤنسل کے ذریعے جو چھٹیوں میں اس کی جگہ کام کرتی ہے، وزیر، جج اور مرکزی حکومت کے تمام عہدہ داروں کا تقرر کرتی ہے۔ جج خود مختار ہیں اور ان کے عامل قانونی ان کے احکامات کی تعمیل کرتے ہیں اور اس میں مقامی حکومت کی مدد کے محتاج نہیں۔ دستور نے تقریر، اجتماع، پریس کی آزادی کا اعلان کیا ہے، اور کوئی شخص بلا حکم عدالت نہ گرفتار کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کی تلاشی لی جا سکتی ہے۔ یہ تو ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ حکومت کے بنیادی اصولوں کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں، اور یہ بتا دیا گیا ہے کہ یہ دستور خاص طور پر "مزدوروں" کے لئے بنا ہے، لیکن روس میں اب مزدوروں کے سوا کوئی ہے بھی نہیں۔ حال ہی میں یہ سبق آموز منظر دیکھا گیا کہ ملحدوں کے سردار مسٹر یاروس لافسکی نے علانیہ

---

[۵۱] جس کا مطلب ہے کہ ان میں کومیونزم کا پروپگنڈا نہیں کیا جاتا۔

سمجھایا کہ پادریوں کو بھی اسی طرح ووٹ دینے کا حق ہونا چاہیے جیسے کہ دوسروں کو۔ لیکن اس طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ ریاست کی اجتماعی ملکیت کا تقدس وہی مرتبہ رکھتا ہے جو ملک کو دشمن سے بچا لے کا فرض؛ دونوں پر کسی طرح کا حملہ کرنا بغاوت کے برابر ہے۔"

"جب سوویٹ پالیسی کے اس نئے رجحان کی خبر باہر پہنچی تو اس میں شک نہیں کہ سوویٹ حکومت کی حیثیت بہت بڑھ گئی اور اس نے صرف دوسرے ملکوں کے باشندوں ہی کی نہیں بلکہ ان کی حکومتوں کی خوشنودی حاصل کرلی ہر جگہ یہ محسوس کیا گیا کہ دنیا کو پہلے جو چیلنج دیا گیا تھا وہ بہر صورت بہت نرم کر دیا گیا ہے، اور سوشلزم کے تعمیری کام میں چونکہ ایسی کامیابیاں ہوئیں جو ثبوت کی محتاج نہ تھیں اس لئے لوگوں کو ان سے بہت دلچسپی ہوگئی اور ان کی تعریف بھی کی جانے لگی۔ لیکن حال میں یہ عام خوشنودی کچھ کم ہوگئی ہے۔ لینن گراد اور ماسکو میں جو قتل کے مقدمے قریب قریب ایک ہی سلسلے میں ہوئے ہیں انھوں نے قدرتی طور پر ان مقدموں کی یاد تازہ کردی ہے جو پنج سالہ منصوبوں کی عمل درآمد کے سب سے نازک زمانے کی ایک نمایاں خصوصیت تھے، جب ایسے لوگ جن پر منصوبوں کو ناکامیاب کرنے کی سازش کا الزام لگایا گیا تھا عدالت میں پیش کئے جارہے تھے۔ اسی کے ساتھ سوویٹ عدالتوں کے غیر منصفانہ برتاؤ پر جو اعتراض وکرز کے مقدمے میں کئے گئے تھے۔ اور بجا طور پر کئے گئے۔ وہ بھی یاد آگئے۔ مجھے خود تو اس میں شک نہیں کہ حکومت کی مخالف انتہاپسندوں کی پارٹی میں ایسی سازشیں کی جارہی تھیں جن کا مقصد ستالن اور دوسرے ممتاز عہدہ داروں کا قتل تھا۔ اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو سمجھ میں نہ آسکے۔ ستالن پر اکثر یہ الزام لگایا جاتا رہا ہے کہ عالم گیر انقلاب کے معاملے میں وہ ٹھنڈا پڑ گیا ہے، اور تروتسکی، زینوولیف اور کامینف کی پچھلی کارگزاری سازش کے شبہے کے موافق پڑتی ہے، اس لئے کہ ستالن کی طرح انھوں نے بھی سازشوں کی فضا میں پرورش پائی تھی۔ ان کے مقدموں میں ہر طرح سے اس پر زور دیا گیا کہ سازش کرنے والوں اور جرمنی کی سیاسی پولیس کے درمیان اتحاد عمل تھا، اور مقدمے کا یہی پہلو ہے جس کے متعلق شہادتیں سب سے ناقص تھیں۔ اس کے علاوہ میں اس خیال کو بھی کہ تروتسکی فاشزم کے مفاد کے لئے جد وجہد کررہا تھا اس لائق نہیں سمجھتا کہ اس پر سنجیدگی سے غور

کیا جائے۔ مجھے یاد ہے کہ خود لینن کو اقتدار کی راہ میں قیصر کی حکومت سے مدد ملی، اور مجھے اس کے اس جواب میں کوئی تضاد معلوم نہیں ہوتا کہ سرمایہ داروں کی ایک حکومت کو تباہ کرنے کے لئے دوسری حکومت کو استعمال کرنے میں کوئی برائی نہیں۔ لیکن ایک فاشسٹ حکومت سے مدد حاصل کر کے سوویٹ نظام کو تہ و بالا کرنا بالکل اور ہی نوعیت کا مسئلہ ہے، سوشلسٹ سازشی سوویٹ حکومت کے طرز عمل اور رجحان سے چاہے جتنے غیر مطمئن ہوتے۔ مقدموں کے ملزم چار مختلف گروہوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں، ایک ٹروٹسکی کے پیروؤں کا، ایک زینوویف کے، ایک منچلے سیاسی فسادیوں کا اور ایک ان پنچ قسم کے دغاباز افراد کا جنھوں نے روسی سیاسیات میں ہمیشہ بہت حصہ لیا ہے۔ جہاں تک کہ یہ ملزم اصولوں کی نمائندگی کر رہے تھے، ان کا انتہا پسند مخالفوں میں شامل ہونا صاف ظاہر ہے، اور ہٹلر نے یہودیوں پر جو لعنت بھیجی ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ سازشیوں میں آدھے سے زیادہ یہودی تھے۔ ان میں صرف ٹروٹسکی کے پیرو ایسے تھے جن کی شخصیتوں کو دیکھ کر ان کے انجام پر افسوس کیا جا سکتا ہے، اور انھیں کا سردار سمرنوف تھا کہ جس نے الزاموں کو غلط ثابت کرنے کی سب سے زیادہ جوش کے ساتھ کوشش کی۔ لیکن میری رائے میں وہ خود اپنے بیانات کی بنا پر بار بار پچھاڑا گیا اور اس سے جو سوال پوچھے گئے وہ بالکل جائز اور اسی کے بیان پر مبنی تھے۔ میرا خیال ہے کہ روس کے سرکاری وکیل کو اس کا حق تھا کہ وہ اس چار روز کی کارروائی کا جو کھلی عدالت میں ہوئی اس سے کہیں زیادہ تشدد آمیز طریقے سے مقابلہ کرے جو ہٹلر نے رہم اور دوسرے مخالفوں سے نمٹنے کے لئے ۳۰ جون ۱۹۳۴ء کو اور اس کے بعد اختیار کیا۔

"سوویٹ حکومت کی شہرت کو زیادہ صدمہ اس تعلق سے پہنچا جو اس نے ہسپانیہ کے واقعات سے دکھایا ہے۔ وہاں کی نسبت جو مفصل بیانات ملے ہیں ان سب میں اس پر زور دیا جاتا ہے کہ انتہا پسند گروہ کی کارروائیوں میں کمیونسٹوں کے مقابلے میں نراجی زیادہ حصہ لے رہے ہیں، اور اگر یہ دونوں اپنے دشمن فاشزم کے خلاف لڑنے کے لئے مل نہ جاتے تو ان کے درمیان اصول اور مقاصد کا جو اختلاف ہے وہ فوراً ظاہر ہو جاتا۔ یہ فرض کرنا بھی بیجا نہ ہوگا کہ ہسپانیہ کے کمیونسٹ ایجی ٹیشن میں اسی خیال کے لوگ زیادہ پیش پیش ہیں جو روس کی موجودہ حالت سے سب سے زیادہ غیر مطمئن تھے، اور خود ٹروٹسکی نے ہسپانیہ کے معاملات میں

خاص دلچسپی لی ہے۔ اس کے باوجود ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ ہسپانیہ میں روس نے حکومت کی مدد کی ہے جیسے کہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فاشسٹ اٹلی اور جرمنی نے فرینکو کی مدد کی ہے۔ اس کے علاوہ عالم گیر انقلاب کی کمیٹی اب تک ماسکو میں موجود ہے، اور جب تک وہ موجود ہے سٹالن اس کی کارروائیوں سے بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ سوویٹ حکومت واقعی سخت کشمکش و پیچ میں ہے۔ وہ کومیونزم اور عالم گیر انقلاب کا جھنڈا اتار نہیں سکتی، نہ ہسپانیہ کے واقعات سے بے تعلقی ظاہر کر سکتی ہے، خصوصاً جب سٹالن پر ہر وقت ان لوگوں کی طرف سے جنھیں اس نے حکومت سے بے دخل کر دیا یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ اس معاملے میں بے پروائی کر رہا ہے۔

" ایسا ہی موقع تھا جب فاشسٹ ریاستوں نے مناسب سمجھا کہ کومیونزم کے خلاف متحد ہونے کا راگ الاپنا شروع کریں، اور ساری دنیا کو سوویٹ کے خلاف اصولی جنگ میں شریک کر لیں۔ انھیں اپنے یہاں کے کومیونسٹوں سے کوئی خطرہ نہیں، اس لئے کہ انھوں نے اپنے یہاں اس فتنے کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا ہے، اور ان کا محضر دراصل ظاہر کر دیتا ہے کہ غیر ملکوں کی کومیونسٹ تحریک سے انھیں کیوں مطلب ہو گیا ہے۔ مثلاً جرمنی کے اخبارات میں اس افواہ کا بہت چرچا کیا گیا ہے کہ چکوسلوواکیا کی حکومت سوویٹ روس کے ساتھ سازش میں شریک ہے، اور اس سے زیادہ مضحک کوئی خیال ہو نہیں سکتا۔ کومیونزم کے خلاف جو اتحاد ہوا ہے اس کے مدنظر ایک نہایت ہی قابل عمل ارادہ ہے، اور وہ یہ کہ اپنے فائدے کے لئے روس کو باقی دنیا سے علیحدہ کر دیا جائے۔ یہ اس وقت ظاہر ہو گیا تھا جب محضر شائع ہونے کے بعد ہی اٹلی نے جاپان اور جاپان نے اٹلی کی فتوحات پر اس کا حق تسلیم کر لیا، حبش اٹلی کا مان لیا گیا اور مانچوکو جاپان کا۔ روس کے متعلق ہٹلر کے جو اعلانات ہوتے ہیں ان سب سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے، اور جرمن سفیر فون ربن ٹروپ نے انگلستان کو بھی اس کا اعتراف کرنے کی دعوت دی ہے کہ دنیا کے لئے کومیونزم ہی واحد خطرہ ہے۔"

تنقید و تبصرہ

کتب :-

سوئٹ روس کا نظام کار | تصنیف مسٹر ایچ، این، بریلز فرڈ، ایم، پی،

مترجمہ مولانا مظہر علی اظہر، ایڈوکیٹ، ہائی کورٹ، لاہور، ایم، ایل، سی۔

روس میں انقلاب کے بعد جب قدرے سکون ہوا تو غیر ملکوں سے بہت سے لوگ جنھیں سوشلزم سے لگاؤ تھا نئے نظام کا معائنہ کرنے کے لئے روس پہنچے بعض نے انقلاب کو ناکامیاب یا سوشلزم یا انسانی آزادی اور ترقی کے بہترین اصولوں کے خلاف پایا۔ بعض نے انقلابیوں کی ہمت افزائی اور نئی زندگی کی خوبیاں واضح کرنا مناسب سمجھا۔ مسٹر بریلز فرڈ آزاد خیال اور نئی زندگی کی طرح ڈالنے کے حامی تو ہیں مگر کمیونسٹ نہیں ہیں، اور انھوں نے کتاب میں اعتدال اور انصاف کا بہت خیال رکھا ہے، اس لئے وہ مطالعے کی خاص طور پر مستحق ہے۔

افسوس ہے اردو کا یہ ترجمہ اصل تصنیف کے آٹھ سال بعد شائع ہوا ہے۔ جب روس کی حالت بہت کچھ بدل گئی ہے۔ اور اس کے بارے میں مسٹر بریلز فرڈ کی رائے معلوم کرنا زیادہ تر تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ لیکن چونکہ اندیشہ اس کا ہے کہ روس کی موجودہ حالت کا پتہ ابھی کچھ نہیں تو پانچ چھ برس بعد تک نہ ہوگا اس لئے اس ترجمے کو غنیمت سمجھنا چاہیئے۔ ہندوستان میں جو لوگ زندگی کے آئین کو بدلنا چاہتے ہیں اُن کا خاص طور سے فرض ہو جاتا ہے کہ روس کے تجربے کا غور سے مطالعہ کریں۔

(م، ج)

Studies in the Quran | مصنفہ پروفیسر اشتیاق حسین صاحب قریشی ایم اے

چھوٹی تقطیع اصفحات ۲۰۰، صاف اور خوشنما انگریزی ٹائپ۔ قیمت آٹھ آنے

ناشر:- (The Federation of Internatinal Fellowships, "Maitri" Kilpauk (Madras)

پروفیسر قریشی کی یہ کتاب مختصر ہونے کے باوجود نہایت جامعیت کے ساتھ مذہب اسلام کا ایک صحیح اور مکمل خاکہ پیش کرتی ہے۔ کتاب کی ترتیب میں ایک خاص جدت پائی جاتی ہے۔ کتاب کے مطالب کو اسلامی تعلیمات کے لحاظ سے چھ ہفتوں پر پھیلایا گیا ہے اور پھر ہر ہفتہ کے ساتوں دنوں کے لئے ایک ایک بحث کو مخصوص کر دیا گیا ہے۔ پہلا ہفتہ وحدت کے لئے، دوسرا رسالت کے لئے، تیسرا ارکان اسلام کے لئے، چوتھا انسان اور اس کی انفرادی ذمہ داریوں کے لئے، پانچواں نظام اجتماعی کے لئے، اور چھٹا ملت اسلامی کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ مثلاً نظام اجتماعی کے ہفتہ کے سلسلے میں عورت شادی، زن وشوہر، اسلامی شادی کے چند پہلو، خاندان، ہمسایہ، معاشرتی تعلقات کی بنیاد .... یہ سات عنوانات قائم کئے گئے ہیں اور ہر دن کے لئے ایک بحث کو مخصوص کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح ملت اسلامی کے سلسلہ میں سات عنوانات کے ماتحت بحث کی گئی ہے یعنی تنظیم ملت معیاری، اس ملت کا مقصد، اسلام کی تبلیغ، تلوار کا استعمال، جہاد دار امن۔ واعظ اور مبلغ کے لئے یہ ترتیب خاص طور پر مفید ثابت ہوگی۔ عام مسلمانوں کے لئے بھی جو اپنے ایمان کو مستحکم اور صحیح بنیاد پر قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ کتاب کا اس ترتیب کے ساتھ روزانہ مطالعہ موجب استقامت اور خیر وبرکت ہوگا۔ طرز بیان میں مغربی انداز پایا جاتا ہے جس سے جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لئے کتاب میں دلچسپی بڑھ گئی ہے۔ کتاب میں ہر جگہ قرآن کریم کی آیتوں سے کثیر تعداد میں شہادتیں فراہم کی گئی ہیں۔ عبارت اور ترجمہ بہت صاف اور سلیس ہے۔ ہر انگریزی داں مسلمان کو اس کتاب کا ایک نسخہ اپنے پاس ضرور رکھنا چاہیئے۔ اور تمام ایسے غیر مسلموں کے لئے جو اسلام سے متعلق مختصر مگر جامع معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کتاب ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوگی۔

(م، ع)

سوزِ ناتمام | مصنفہ جناب عاشق حسین صاحب بٹالوی، بی اے، ایل ایل بی وکیل، تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ حجم ۲۳۰ صفحے، ملنے کا پتہ: دفتر ادبی دنیا، لاہور۔ قیمت ایک روپیہ عمر

یہ مختصر افسانوں کا ایک مجموعہ ہے۔ اندر کے ٹائٹل پر نہ جانے بھولے پن سے یا غلطی سے لکھ دیا گیا ہے کہ یہ مجموعہ دلآویز ہے۔ مصنف کے پیش لفظ میں افسانہ نویسی کی اہمیت اور انشاء پردازی کے نصب العین پر بحث کی گئی ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ مصنف نے واقعی زندگی کا مطالعہ کیا ہے۔ اور ان افسانوں میں آدمیوں اور واقعات کی زبانی زندگی کی حقیقتیں بیان کی گئی ہیں۔ لیکن افسانے پڑھ کر بہت مایوسی ہوتی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے وہ ان عامیانہ افسانوں سے بہتر نہیں جن سے آج کل کے رسالے بھرے ہوتے ہیں، اور طرز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے باریک نقش کھینچنے کے لیے مصنف کے قلمدان میں قلم نہیں۔ وہ ساری تصویر اپنے ایک ہی موٹے قلم سے بنانا چاہتے ہیں۔ (م، ج)

راز | مرتبہ جناب علی احمد صاحب (عثمانیہ) ناشر محبوبیہ کارخانہ جلد سازی، حیدرآباد دکن تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$، حجم ۹۴ صفحے۔ قیمت ۵ر

افسانوں کا یہ مجموعہ "سلسلہ داستاں گو" کا ایک نمبر ہے۔ اس سے پہلے بھی کئی نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ مجموعے کے بعض افسانے ترجمے ہیں، بعض طبع زاد، لیکن سب دلچسپ ہیں اور زبان بھی اچھی ہے۔ عبدالرشید صاحب قریشی، سال اول (عثمانیہ) کا افسانہ "ردّعمل" ہمیں خاص طور پر پسند آیا۔ جو افسانے کہ ترجمے ہیں اُن کی اصل کے متعلق کچھ نہیں بتایا گیا۔ یہ بات قابل اعتراض معلوم ہوتی ہے۔ پھر محبوبیہ کارخانے نے کتاب کے اندر صفحہ ۴۶ پر اظہارِ حقیقت" کے عنوان سے اپنا اشتہار دیا ہے۔ جس سے ہمارے خیال میں کتاب کی توہین ہوتی ہے رسالوں میں اشتہار ہر جگہ دئے جا سکتے ہیں۔ کتاب کا زیادہ ادب کرنا چاہیئے اور سوائے ان مقامات کے جہاں رواج اجازت دیتا ہو کسی قسم کا اشتہار نہ ہونا چاہیئے۔

ہمیں امید ہے کہ محبوبیہ کارخانہ داستاں گو کے سلسلے کو جاری رکھے گا اور آئندہ بھی افسانوں کا انتخاب اتنا ہی اچھا ہو گا۔ (م، ع)

یادگار ماجد | مجلد، چھوٹا سائز، ضخامت ۰۰ا صفحات بشمول مقدمجات و تمہیدات، کاغذ دبیز، سفید، چکنا، کتابت و طباعت عمدہ، قیمت قسم عام و قسم خاص علی الترتیب عہ، عا، مطبوعہ انڈین پریس، الہ آباد، مع تصویر مصنف۔

"خان صاحب" سید ماجد علی صاحب ماجد (المتوفی ۱۹۳۶ء) ۱۸۶۸ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے، اور اسی شہر میں تعلیم و تربیت و ملازمت اور وفات پائی! وکالت پیشہ تھے، جس کا آخری ارتقار گورنمنٹ پلیڈر شپ اور خطاب "خانصاحبی" تھا! مذہباً شیعہ تھے اور نتیجتاً ہوشمند، حالِ احساس وقت۔ وسیع المشرب تھے، اگرچہ طویل و بیخ گیر اثرات وراثت کے خمیازے میں بعض فرسودہ مراسم محرم کے عامل بھی تھے۔ عموماً ایک شریف و خلیق و مہذب، شائستہ اور خوش باش و مرنجان و مرنج انسان تھے، جدید تعلیم پائی تھی اور اُن کا زمانۂ حیات کم و بیش دورِ جدید کے اندر داخل تھا۔ تاہم عہد نو کی چند غلط انداز کرنیں ہی تھیں جو اُن پر پڑی تھیں! اردو شاعری میں اُن کا مجموعہ غزلیات اک تازگی کا تنفس ضرور رکھتا ہے۔ لیکن بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہندوستانی ادبیات کی "نشاۃ ثانیہ" کا کوئی عجیب الطرفین مولود نہیں۔ وہی غزلیں ہیں، نرم نہیں تو گرم، تاہم غزلیں، اور عموماً غزلیں! نئی زندگی کا ایک خفیف تاثر ان میں ضرور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ تاہم وہ کوئی قومی انقلابی جاذبہ نہیں۔ نہ اس کی بہ دادار کوئی جدید دنا در تخلیق ادب کہی جا سکتی ہے! پنڈت منوہر لال زتشی کا مقدمہ اک "دوستانہ تقریظ" سے چنداں مختلف نظر نہیں آتا! نیم بارد تغزل، رسمی اخلاقیات، دہی تفلسف روایاتی تصوف اور مبہم الٰہیات کے عناصر کسی جدید ادبیت و ثقافت کے ساز و برگ نہیں بن سکتے! ہم بادب اس اس معتدل تلخ نوائی پر مجبور ہیں! زیادہ سے زیادہ حضرت ماجد کے حق میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ راسخ الاعتقاد اردو غزل سرائی کی لوم نوائی کا آہنگ مرگ ذرا مضمحل پڑ گیا ہے اور بس، ہنوز دلی بسیار دور است!

(ا، س، خ)

بادۂ سخن (الف)، کیفِ سخن (ب)، متاعِ سخن (ج) | ہر جلد کی ضخامت کم و بیش سوا سو صفحات چھوٹا سائز، کاغذ معمولی سفید، کتابت و طباعت بدرجہ اوسط قیمت ہر جلد ۱۲/ مطبوعہ اسٹیم پریس حیدر آباد۔

یہ حیدر آباد کے تین جدید العہد شاعروں کے مجموعہ کلام ہیں جن کی ترتیب جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کے قلم سے عمل میں آئی ہے۔ ہر مجموعہ اک معیاری قامت و ضخامت پر مبنی ہے اور مندرجہ ذیل عناصر و مراحل پر مشتمل۔

(۱) دکن کی اردو شاعری، (۲) تصویر شاعر متعلقہ، (۳) شاعر اور اس کی شاعری (۴) انتخاب کلام شاعر۔

پہلی چیز پر از معلومات کاوش کا ثمرہ ہے جو نوجوان، حوصلہ مند ڈاکٹر زورؔ کا حصہ ہے، تیسری چیز عمیق، آشنایانہ مطالعہ و جائزہ کا نتیجہ ہے، اور چوتھی مَد کا حق ادا کرنے میں بھی پوری وسعت نظر اور ذوقِ اخذ کا ثبوت دیا گیا ہے!

حضرت مائلؔ (صاحبِ بادۂ سخن) اک قادر الکلام اور پرگو استاد ہیں، مشکل پسند واقع ہوئے ہیں اور عموماً سنگلاخ اراضی شعر کو توڑا ہے اور بعض قدیم مسلم الثبوت اساتذۂ اردو کے تتبع کی کامیاب و قابل داد کوششیں کی ہیں۔

حضرت کیفیؔ (موضوع کیفِ سخن) اک بوقلموں طبیعت کے سخن گو ہیں۔ تقریباً چار تخلص اختیار کر چکے ہیں۔ آزادؔ منشی و لطیفہ سنجی اُن کے کلام پر بخط جلی لکھی ہوئی ہے اور حیدر آباد فرخندہ بنیاد کے جدید دور احیاء العلوم و نشاۃ ادب کے بلند بانگ و قوی آہنگ نقیب ہیں۔ کیفیؔ اک جامع قال و حال انسان تھے!۔

حضرت عزیزؔ (متاعِ سخن) اک خوش ذوق، مستغنی المزاج، شگفتہ طبع اور مایہ دار شوکتِ زبان و بیان شاعر ہیں! وہ داغؔ کے اک فنافی الشیخ قسم کے شاگرد ہیں! دہلوی لہجہ و محاورہ کا غیر متزلزل اتباع اُن کا اک اور امتیاز ہے۔ (ا، س، ج)

بیاضِ سخن | مولفہ جناب عبدالشکور صاحب شیدا (بتقریب سلور جوبلی شہر یار دکن) تقطیع عام کتابی ضخامت ۵۰۰ صفحے، کاغذ، کتابت، طباعت اوسط قیمت غیر مجلد عمار

ملنے کا پتہ: محمد نسیم احمد نائب محاسب عدالت العالیہ حیدر آباد دکن۔

"موجدینِ اردو سے لے کر دورِ حاضر تک سلسلہ بسلسلہ اردو گو شعراء کے کلام غزلیات کا انتخاب اور ان کا اجمالی تذکرہ، نیز ہم قافیہ و ہم مضمون اشعار کا ایک ایک مجموعہ اور چند ہندی ابیات"

کتاب کی علمی، ادبی، تنقیدی حیثیت محتاج بیان نہیں امید ہے کہ تاریخ ادب نیز تنقید سے ذوق رکھنے والے حضرات میں کافی مقبول ہوگی۔ (ا، س، خ)

قنوطیت یعنی فلسفۂ یاس | مصنفہ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب، ایم اے پی ایچ ڈی، استاد فلسفہ جامعہ عثمانیہ، تقطیع ۲۲×۱۸/۸، حجم ۱۱۰ صفحے، ناشر خود مصنف، قیمت درج نہیں۔

یہ کتاب اس نظریۂ حیات کے متعلق ہے جو ہماری طبیعت اور ہماری شاعری کو دیکھتے ہوئے ہمارا قومی فلسفہ کہا جا سکتا ہے۔ فاضل مصنف نے ایسا انداز بیان اختیار کیا ہے کہ فلسفے کے طالب العلم اور شوقیہ پڑھنے والے دونوں کتاب سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ (م، ج)

داستان | پیر لوئی کی کتاب "افروڈائٹ" کا اردو ترجمہ۔ ناشر ہاشمی بک ڈپو، ریلوے روڈ لاہور، تقطیع ۲۷×۱۷/۸، حجم ۲۵۰ صفحے قیمت دو روپے (عما)

یہ کتاب نہایت گندی اور بے معنی کتاب ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ کسی خوش مذاق آدمی کو ایسی کتاب اٹھا کر دیکھنا بھی چاہئے۔ غلاظت کے کیڑے [illegible] ہوتے ہیں جنھیں شاید یہ غذا موافق آئے گی۔ (م، ج)

رسید کتب:۔

محمدیہ پاکٹ بک | مولفہ منشی محمد عبداللہ صاحب معمار فاضل مرزائیات حجم ۰۰، صفحات تقطیع خورد

لکھائی چھپائی عمدہ، مجلد قیمت فی نسخہ عہ۔

ملنے کا پتہ :۔ شعبہ تالیف وطبع انجمن اہل حدیث برانڈر روڈ، لاہور۔

اس کتاب پر سال گذشتہ رسالہ جامعہ میں ہم تبصرہ کر چکے ہیں۔ اس کا پہلا اڈیشن فروخت ہو چکا اب دوبارہ مع جدید و مفید اضافوں کے انجمن اہل حدیث نے اس کو شائع کیا ہے۔ تقریباً ۴۰۰ صفحات بڑھائے ہیں۔ مگر تبلیغ کی غرض سے قیمت وہی رہنے دی (۱۱ ج)

علم بدیع | مولفہ رشید احمد صاحب بالقابہ پرنسپل دارالعلوم گوجرانوالہ۔ تقطیع خورد، حجم ۱۴ صفحے

ملنے کا پتہ :۔ میسرز لطیف الحسن اینڈ برادرز بک سیلرز، چوک مولوی الٰہی بخش صاحب گوجرانوالہ

قیمت مرقوم نہیں ہے۔

یہ رسالہ صنائع و بدائع میں نہایت اختصار کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ طلباء کے لئے مفید ہوگا۔

(۱۱ ج)

اسباق العروض | یہ کتاب مولوی رشید احمد صاحب موصوف کی تصنیف ہے۔ اس کے ملنے کا پتہ بھی وہی ہے۔ قیمت درج نہیں ہے حجم ۱۲۰ صفحوں کا ہے۔ زبان اور بیان صاف ہے۔ طلباء عروض کے فن کو اس سے آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں۔ (۱۱ ج)

جمع القرآن والحدیث | ازجناب مولوی ابوالقاسم محمد خاں صاحب سیف بنارسی، تقطیع بڑی۔ ضخامت ۴۸ صفحات۔ قیمت ۴ر ملنے کا پتہ : آل انڈیا دارالاشاعت، لاہور

اس کتاب میں ثابت کیا گیا ہے قرآن کریم کی جمع و ترتیب آں حضرت صلعم کے زمانے میں ہو گئی تھی۔ نیز احادیث آں حضرت کے آخری زمانے اور عہد صحابہ میں کتابی صورت میں مدون ہو چکی تھیں۔ مولانا کا انداز عالمانہ، متین اور سنجیدہ ہے۔

الجمعۃ والہند | ریاست پالن پور میں ایک موضع ہے بسو تین ہزار کی آبادی اور آدھے سے زیادہ مسلمان، اب علمار کرام میں کش مکش ہے کہ یہاں جمعہ جائز ہے یا نہیں۔ قاری محمد رفعت اللہ صاحب مولف کتاب جمعہ کے موید ہیں اور انھوں نے قصبہ، مصر، موضع وغیرہ کی تعریف کے بعد بدلائل یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بسو میں جمعہ کی نماز ہونا چاہئے۔ مولانا کا لہجہ سنجیدہ اور متین ہے۔

اثبات التقلید مع فضائل النعمان | از مولانا برکت علی صاحب۔ اس میں تقلید کا وجود ثابت کیا گیا ہے اور امام ابوحنیفہ (رح) کے کچھ حالات ہیں۔

جدید خطبات جمعہ | یہ سات خطبوں کا مجموعہ سیرت کمیٹی پٹی لاہور کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ ان میں سے ہر ایک مفید مباحث پر مشتمل ہے، مثلاً وحدت خطبات، خدا کی توحید، فلسطین کی مظلومی، تعلیم، تبلیغ دین وغیرہ،

ملنے کا پتہ: سیرت کمیٹی پٹی لاہور۔

تحریک اتحاد اسلامی حصہ دوم وچہارم | از جناب کشفی شاہ صاحب۔ کشفی صاحب نے ان مختصر رسالوں میں مختلف عنوانات کے ماتحت مسلمانوں کو متحد ہو جانے کی ترغیب دی ہے

ملنے کا پتہ: سیرت آفس پوسٹ بکس ۲۶۲ رنگون۔

عثمانی قاعدہ | از والدہ خانم صاحبہ۔ بچوں کے لئے قرآن کی تعلیم کو آسان بنانے کے لئے کئی قاعدے مرتب ہو چکے ہیں۔ یہ بھی ایک مبارک کوشش ہے اور بڑی حد تک کامیاب۔ قیمت اور ملنے کا پتہ کتاب پر درج نہیں

قاعدہ اسلامیہ | مصنفہ مختار الحسن صاحب۔ یہ اردو کا قاعدہ ہے۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کا نام قاعدہ اسلامیہ کیوں رکھا گیا اور حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب سے پاس کرانے کا کیا مقصد ہے۔ قیمت ۱؎

ملنے کا پتہ: بانی زنانہ مدرسہ انوار الاسلام کوچہ دکھنی رائے متصل فیض بازار، دریا گنج، دہلی۔

خورشید رسالت حصہ اول و دوم | از جناب تبسم قریشی منشی فاضل۔ بزم سیرت گجرات، آں حضرت کی سیرت منظوم شائع کر رہی ہے۔ ہر مہینے سولہ صفحے شائع ہوں گے۔ ہر حصے کی قیمت صرف ار

ملنے کا پتہ: بزم سیرت مسلم زمیندار ہائی اسکول گجرات (پنجاب)

رہبر | از جناب شیخ حبیب اللہ صاحب، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۳۶ صفحے قیمت ۳ر

ملنے کا پتہ: دی نیو بک اسٹورز کٹک (اوڑیسہ)

ایک اصلاحی فسانہ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ایک مذہبی ماحول میں تربیت یافتہ لڑکی نے ایک یورپ زدہ نوجوان کی کس طرح اصلاح کی۔

سرسید و حالی | از جناب تبسم قریشی صاحب۔ ضخامت ۱۰ صفحات تقطیع چھوٹی۔ قیمت ار

ملنے کا پتہ تبسم قریشی ناظم بزم سیرت مسلم زمیندار ہائی اسکول گجرات، (پنجاب)

یہ مختصر نظم مولانا حالی کے صدسالہ جشن سالگرہ کے موقع پر پڑھی گئی تھی۔

خیابان ترنم | از حضرت شہیر مچھلی شہری تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۰، صفحات۔ قیمت عا۔ غالباً جامعہ اصلاحیہ عثمانیہ الہ آباد سے مل سکتی ہے۔

حضرت شہیر مرحوم، قادر الکلام شاعر تھے اور پرانی تہذیب کی یادگار۔ ان کے شاگردوں نے ان کے کلام کا مجموعہ شائع کیا ہے۔ غزلوں کے علاوہ اس میں قصائد اور قطعاتِ تاریخی وغیرہ بھی ہیں۔

شفق آرا | از جناب نقش عالمی (عثمانیہ) تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۰ صفحے قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ : احمد پریس چار مینار حیدر آباد دکن ۔
اس اصلاحی افسانے میں چند طوائفوں کے کردار کامیابی کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں ۔

عروج زندگی | از جناب ن حسن ایم اے بی ٹی ال ال بی علیگ ۔ تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۶ صفحات قیمت ۸/ ملنے کا پتہ منشی قربان علی بسمل ۔ ایڈیٹر اردوئے معلیٰ جامعہ مسجد ، دہلی ۔
یہ دلچسپ قصہ تعلیم نسواں کی حمایت میں لکھا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح ایک معمولی خاندان کی لڑکی محض اچھی تعلیم و تربیت کی بدولت اپنے اور اپنے خاندان والوں کے لئے خیر و برکت اور عروج کا موجب ہوئی ۔

برسی | یہ نظم جناب بسمل سعیدی صاحب نے اپنے باپ کی وفات پر لکھی ہے ۔ ضخامت ۱۶ صفحے ۔
ملنے کا پتہ اور قیمت کتاب پر درج نہیں ۔

خسرو ذی شان | از جناب سعید احمد صاحب انصاری تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۰۰ صفحات قیمت عہ/
ملنے کا پتہ: ایس ام نذیر احمد گلی نمبر ۲۳ بیڈن پورہ قرول باغ ، دہلی ۔
یہ کتاب شہنشاہ جارج پنجم آنجہانی کے حالات میں نہایت عقیدت سے لکھی گئی ہے آخر میں چند خطاب یافتہ معززین کی تقریظیں بھی ہیں ۔

توجیہ محاورات | از جناب ابو عامر خواجہ محمد باقر حسن انصاری قادری ۔ تقطیع چھوٹی ، ضخامت ۳۲ صفحات قیمت ۲/ ملنے کا پتہ : ابو عامر اینڈ سنز محلہ شاہ ولایت ۔ سہارنپور ۔
اس کتاب میں چند اردو محاورات کی تشریح اور بہتر توجیہہ کی گئی ہے ۔ خواجہ صاحب یہ کام اچھا کر رہے ہیں ہمت افزائی کی ضرورت ہے ۔

میر مشاعرہ | ازجناب عشرت رحمانی تقطیع بڑی ضخامت ۳۲ صفحے قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ: نیرنگستان، دہلی۔

یہ مزاحیہ ڈراما جناب ایم۔اسلم کے مزاحی کے طرز پر لکھا گیا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے براڈکاسٹ بھی ہو چکا ہے۔ میر مشاعرہ کا کیرکٹر دلچسپ انداز میں کھینچا گیا ہے۔

حفظِ عروض | ازجناب احسان بن دانش تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۰ صفحات،

ملنے کا پتہ: مکتبہ دانش، مزنگ لاہور۔ قیمت درج نہیں۔

دانش صاحب نے اختصار اور جامعیت کے ساتھ عروض کے متعلق تمام معلومات یک جا کر دی ہیں

دختران ہند سے | ازجناب م حسن لطیفی صحافی۔ ضخامت ۱۶ صفحے

ملنے کا پتہ: دفتر شاطو، لدھیانہ

لطیفی صاحب نے اپنی خاص زبان اور انداز میں دختران ہند کو دعوتِ عمل و انقلاب دی ہے

آصف نامہ | ازجناب محمد حبیب اللہ صاحب تقطیع چھوٹی۔ ضخامت ۴۸ صفحات قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ: مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن۔

جناب محمد حبیب اللہ صاحب نے عثمانی عہد کی تاریخ نظم میں لکھی ہے۔ اعلیٰ حضرت کے عہد کے واقعات بڑی خوبی اور خوش اسلوبی سے نظم کئے گئے ہیں۔

رفتارِ عالم

ہندوستان

بنگال میں جوٹ ملوں کی ہڑتال گذشتہ ۲ ماہ سے بنگال کی جوٹ ملوں میں ہڑتال کا جو سلسلہ جاری ہے اس سے مزدوروں کی بے کسی، غربت اور افلاس کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان ہڑتالوں کی ابتدا یکم فروری ۳۷ء کو ہاوڑا (کلکتہ) میں ہوئی جو رفتہ رفتہ کارخانہ فورٹ ولیم اور ہاوڑا گنگا تک پھیل گئی لیکن ۲۵ دن کی مسلسل جد و جہد کے بعد بالآخر مزدوروں کو ہتھیار ڈالنا ہی پڑے۔ اور حکومت اور سرمایہ داروں کی عدم توجہی اور بے مہری نے مطالبات منظور ہونے سے قبل ہی انھیں کام پر واپس جانے کے لئے مجبور کیا۔

ابھی اس واقعہ کو تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ ہڑتالوں کا ایک شدید طوفان بج بج سے اُٹھا اور سرعت کے ساتھ علاقہ بول اور جنوبی کلکتہ کی دوسری ملوں تک پہنچ گیا۔ یہاں تک کہ فورٹ ولیم اور شمالی برلا ملوں کے علاوہ قرب و جوار کی تمام دیگر مشینیں بند ہوگئیں۔ مگر ان کا حشر بھی وہی ہوا جو ہاوڑا کی ہڑتالوں کا ہوا تھا۔ اور ایک ہی ہفتے کی قلیل مدت کے بعد لارنس، لیڈلا۔ پریم چند اور دوسری ملیں بھی بلا کسی خاص مصالحت کے کھل گئیں۔

ہر چند کہ یہ ناکامیاں دل شکن تھیں مگر حقوق اور مطالبات کی آگ ابتک ہڑتالیوں کے سینوں میں سلگ رہی تھی۔ اس لئے اکی بار ہاوڑا اور بج بج سے مایوس ہو کر ان کا نرغہ شمالی کلکتہ پر ہوا۔ اس حملے نے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے زیادہ منظم اور مستحکم تھا نہ صرف ٹکر چند خردہ اور جوٹ کی دوسری ملوں کو متاثر کیا بلکہ برطانیہ انجنیرنگ۔ مشرقی صنعتی کمپنی اور گورلپور کے رنگ سازی کے کارخانے بھی زد میں آئے بغیر نہ رہ سکے۔ جوٹ ملوں کے ساتھ ساتھ انھیں بھی بند ہونا پڑا۔ اس کامیابی کے بعد ہڑتالیوں کا حملہ دریائے ہگلی کی دوسری جانب ہوا اور ۱۲ اپریل ۳۷ء کو ٹیٹا گڑھ ملز کی ملوں سے ہڑتال کی صدا بلند ہوئی۔ اور تیزی کے ساتھ بارکپور کے پورے حلقے میں گونج گئی۔ ایک

اتر سے انگلس، وکٹوریہ پریسیڈنسی اور گوندل پارہ وغیرہ تمام ملوں کو بند ہونا پڑا۔

اس یورش سے مجموعی طور پر تقریباً ۶ لاکھ جوٹ کے چرخے بند ہوگئے۔ اور دو لاکھ سے زیادہ مزدوروں کو (جن کی آمدنی سے اُن کی اور ان کے متعلقین کی گذر ہوتی تھی اور تقریباً ۱۲ لاکھ پیٹ پلتے تھے) بے روزگار ہوگئے لیکن افسوس ہے کہ مزدوروں کی اس زبردست جماعت کو تباہ حالی سے بچانے کے لئے حکومت نے کوئی سعی نہیں کی اور غریب ہڑتالیوں کو فاقہ کشی کے ساتھ ڈنڈے بازی کی مصیبت بھی برداشت کرنا پڑی۔ اس ہڑتال سے جوٹ کی بڑھتی ہوئی بین الاقوامی تجارت کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اس کی ذمہ دار یقیناً حکومت قرار دی جائے گی۔

اس موقع پر "جوٹ مل ایسوسی ایشن" کا اعلان مورخہ یکم مئی ۱۹۳۷ء بھی قابل غور ہے۔ وہ ان ہڑتالوں کو "غیر معاشی اور محض سیاسی یورش" سے تعبیر کرتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جوٹ کا کاروبار ابھی اپنی اصلی حالت پر نہیں آیا ہے اس لئے یہ ہڑتال قدرتاً بے محل ہے۔ اس کے علاوہ مزدوروں کی مالی حالت بھی قابل اطمینان ہے کیونکہ وہ اپنے متعلقین کے لئے ایک کثیر رقم ماہ بماہ بھیج رہے ہیں۔ اگرچہ اس اعلان کے جملہ نکات کا جواب پنڈت جواہر لعل نہرو اور مسٹر سرت چندر بوس متعدد بار دے چکے۔ لیکن اگر ہم اسی کے ان حصوں کی مزید توضیح کریں جن میں مزدوروں کے مطالبات کو رد کیا گیا ہے تو ظاہر ہو جائے گا کہ مل ایسوسی ایشن کا نظریہ فہم و ادراک سے بہت دور ہے اور صرف کوتاہ بینی پر مبنی ہے۔

مطالبات کی فہرست میں ایک اہم مطالبہ یہ ہے کہ ملوں کے اوقات کار میں ۵۴ گھنٹہ فی ہفتہ کی جو زیادتی یکم اپریل ۱۹۳۶ء سے عمل میں آئی ہے منسوخ کی جائے۔ اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ اوقات کی یہ ترمیم مزدوروں کے لئے باعث مضرت نہیں۔ کیونکہ اس کے ساتھ ہی اجرت میں بھی مناسب اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر جوٹ کی تجارت کو فروغ حاصل نہیں ہے۔ تو اوقات کار میں زیادتی کے کیا معنی؟ اور اگر مزدور متعینہ اوقات سے زیادہ کام کر رہے ہیں تو اجرت میں کارکردگی اور خانگی تعلقات کے کم ہو جانے والے اثرات کو ملحوظ کیوں نہیں رکھا جاتا؟

پھر یہ کیا ضروری ہے کہ اوقات کی ترمیم تمام مزدوروں پر لازمی کی جائے ؟ اگر وہ اجرت کی زیادتی کے لئے ۴۸ گھنٹہ ہفتہ کی قربانی کے لئے تیار نہیں ہیں تو ملوں کو اس کے خلاف انھیں مجبور کرنے کا کیا حق ہے ؟ اس سلسلے میں یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ جوٹ میں بنگال کی تمام ملوں سے زیادہ ترقی یافتہ اور دولتمند ہیں، مگر ان میں اجرت کا نرخ ہر جگہ سے کم ہے۔ اس کے علاوہ گذشتہ چند سال کے مقابلہ میں بنگال کے جوٹ ملوں کی نکاسی تقریباً نوئے ہزار ٹن بڑھ گئی ہے ساتھ ہی منافع میں بھی تقریباً ایک کروڑ روپے کا اضافہ ہو گیا ہے۔ حیرت ہے کہ ان حالات کے باوجود مزدوروں کے مطالبات اپنی جگہ پر اب تک غیر معاشی ہی قرار دئے جا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ وزیر اعظم بنگال مسٹر فضل الحق نے بھی مالکان مل سے ہم آواز ہو کر اعلان کیا ہے کہ "یہ ہڑتال دراصل کسی معاشی بنا پر نہیں ہے بلکہ کمونسٹ جماعت نے اس کے ذریعے ہندوستان میں انقلاب پیدا کرنے کی ایک نئی صورت نکالی ہے" (اعلان مورخہ ہ رئی)۔

پیرانہ سالی اور ایام ولادت کے اخراجات کے متعلق بھی مل ایسوسی ایشن کا نظریہ عجیب مضحکہ خیز ہے وہ یہ تو مانتی ہے کہ یہ اخراجات ضروری ہیں اور ملوں کی جانب سے پورے ہونے چاہئیں پھر بھی وہ قانونی صورت میں ان کے نفاذ سے روکتی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ یہ مطالبات بلا مانگے ہی دئے جا چکے ہیں اس لئے ان کے متعلق کوئی قانون زیادہ مفید ثابت نہ ہوگا۔ اگر یہ حقوق واقعی دئے جا چکے ہیں تو ان کی قانونی شکل سے مالکان مل کو متوحش ہونے کا کیا سبب ہے ؟

ہڑتالی مزدوروں کی برخاستگی کے متعلق وزیر مزدور مسٹر سہروردی کا اعلان مظہر ہے کہ اگر جوٹ مل کی مزدور مجلس ہڑتال کے سلسلوں کو فوراً ختم کر کے حسب معمول مزدوروں کو اپنے اپنے کام پر لگا دیں تو وہ اس کے ذمہ دار ہوں گے کہ کوئی ہڑتالی مزدور برخاست نہ کیا جائے اس اعلان کے ساتھ ہی وزیر ممدوح نے یہ بھی فرمایا کہ ابتک وہ اس تحریک میں غیر جانبدارانہ دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ لیکن اگر صورت حال میں تبدیلی نہ ہوئی تو وہ اپنے اختیارات سے کام لے کر مزدوروں کو ہڑتال ختم کر دینے پر مجبور کریں گے۔ ہمیں افسوس ہے کہ حکومت کے اس غیر جانبدارانہ طرز عمل کے باوجود بنگال پولیس نے جو گذشتہ ۲۷ اپریل کو

بمقام رشٹرا ضلع کلکتہ روا رکھا اس کے خلاف ابتک کوئی باز پرس نہیں کی گئی - اور نہ مزدوروں کے جملہ مطالبات کو پورا کرنے کے لئے کوئی سعی عمل میں آئی -

حکومت کی طرف سے اس بات پر جو بہت اصرار ہے کہ یہ معاشی نہیں سیاسی ہے اس میں معلوم ہوتا ہے کہ معیشت اور سیاست کے گہرے تعلق کو نظر انداز کردیا جاتا ہے - یہ بات ماننے کو تو مشکل ہی سے کوئی غیر جانبدار شخص آمادہ ہوگا کہ بلا جائز اور شدید شکایات کے لاکھوں مزدور کام چھوڑ بیٹھیں اور اپنی روزی کو خطرہ میں ڈال دیں - لیکن بیشک وہ اپنی معاشی شکایات کے رفع کرنے کے لئے سیاسی قوتوں سے کام لے سکتے ہیں اور اگر لیں تو اس پر کسی کو طعن کا حق نہیں - یہی کیا ہم نے تو سنا ہے مزدوروں کی معاشی شکایات اور عام سیاست کے تعلق کے علاوہ اس ہنگامہ میں خود سرمایہ داروں کی چالیں بھی کچھ کم شریک نہ تھیں - عام افواہ تھی کہ ہڑتال میں خود جوٹ ملوں کے بعض دور اندیش مالک روپیہ دے دے کر اسے طویل کرنے میں مدد دے رہے ہیں - اس لئے کہ خود ان کی ملوں کے حصوں کی قیمت گھٹے اور وہ کم داموں پر حصہ داروں سے خود خرید لیں تجارت اب سنبھلی ہے اور آنے والی جنگ کی تیاریوں نے قیمتوں کو ابھارا ہے - جوٹ کی قیمت بھی یقین ہے کہ خوب بڑھیگی اور جوٹ کے کارخانوں کا نفع بھی اس کے ساتھ بڑھے گا اور حصوں کی قیمت چڑھے گی - اس وقت ہڑتال کے زمانہ میں جتنے حصے سستے داموں ہاتھ آجائیں اچھا ہے -

بہر حال مزدور جماعت کو اپنے ان عارضی اور خود غرض معاونوں کی چالوں میں نہ آنا چاہیئے - ان کا مطالبہ درست ہے، دولت آخر میں وہ ہیں، سرمایہ دار کو یہ حق نہ ہونا چاہیئے کہ وہ انھیں مزدوری یوں دے گویا خیرات بانٹتا ہے - اگر مزدوروں کی جماعت میں مخلص کارکن پیدا ہوتے جائیں تو ان کے اس مطالبہ کو کوئی قوت نہیں رد کرسکتی نہ حکومت، نہ سرمایہ دار، نہ تنگ نظر اہل سیاست -

---

م - ر - ا

ممالکِ غیر

اسپین: یہ بدنصیب ملک اب تک وفاداروں اور باغیوں کی کشاکش کا خونی رزمگاہ بنا ہوا ہے۔ پچھلے دنوں جو خبریں آئی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ وفاداروں کا پلہ کچھ بھاری پڑ رہا ہے۔ اُدھر دول یورپ کی طرف سے فریقین کو التوا جنگ کا مشورہ دیا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ اتنے عرصے سے اصولی اختلافات کی وجہ سے یوں برسر پیکار ہیں کہ بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہو گیا ہے، وہ ان نیک مشوروں کو آسانی سے کیسے مان سکتے ہیں۔ پھر ان مشوروں کی نیکی کا یقین بھی ذرا مشکل ہی سے ہوگا۔ اس لئے کہ یہ دول اگر چاہتیں تو یہ قصہ اس قدر طول ہی نہ پکڑتا۔ جنھوں نے اسے اتنا طویل کرایا ان سے کوئی توقع کیسے کرے کہ وہ اب یکایک اسپین کی ہمدردی کے جذبے سے مجبور ہو کر صلح کی مخلصانہ کوششیں کر رہے ہیں۔

اور سچ بھی ہے کہ دول یورپ کے معاشی اور سیاسی اغراض اس ملک کے ساتھ کچھ اس طرح وابستہ ہیں کہ وہ کوئی مشورہ آسانی سے ایسا نہیں دے سکتے جس میں خود غرضی کی آمیزش نہ ہو۔

مختلف دول یورپ کے لئے اسپین میں سیاسی اثر بڑھانے کی جو ضرورت ہے اس پر ان صفحات میں پہلے بھی لکھا جا چکا ہے۔ ابھی ۲۴ اپریل کے New Statesman & Nation میں ایک باخبر نامہ نگار نے مختلف دول کے معاشی اغراض کا بہت اچھا نقشہ پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ اجناس خام کے حاصل کرنے کے لئے ساری دنیا میں جو کھلی اور چھپی کشمکش جاری ہے وہی اسپین میں اپنا اثر دکھا رہی ہے۔

بات یہ ہے کہ اسپین میں بہت سی وہ چیزیں مل سکتی ہیں جو جنگ کے لئے ضروری ہیں اور اس مقدار میں مل سکتی ہیں کہ نہ اٹلی کو حبشہ میں نصیب ہوں گی نہ جرمنی کو اپنی نوآبادیوں میں ملتی تھیں،

مثلاً لوہا ہے کہ جنگی سامان کی ساری صنعت کا دار مدار اس پر ہے کہ کثرت سے آوویڈو کے قریب، دیگو کے نواح میں اور باسک صوبے میں دستیاب ہوتا ہے۔ صوبہ ہویلا میں یورپ کی سب سے اچھی تانبے کی کانیں ہیں۔ المدن میں پارہ ملتا ہے اور اس کے قریب پنارودیا میں بہت ہی اچھا سیسہ۔ ان کے علاوہ بہت سی اور معدنیات اس جزیرہ نما میں حاصل ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ ۱۹۳۴ء میں اٹلی اور جرمنی کی ایک مشترکہ جمعیتہ نے ان ذخائر سے فائدہ اٹھانے کی تجویزیں شروع کیں۔ جن کا مقصد یہ تھا کہ اٹلی اور جرمنی، برطانیہ، فرانس اور سویڈن کی مدد سے بے نیاز ہو جائیں ۱۹۳۴ء کا زمانہ بھی اس جمعیتہ کے کام کے لئے بڑا سازگار تھا۔ رجعت پسند جماعتوں کو کامیابی ہوئی تھی۔ معدنی کانوں کے مزدوروں کو دبا دیا گیا تھا، سیاست میں موسیو لیرو کا طوطی بولتا تھا، اور یہ تھے ہی بڑے سرمایہ داروں کے پٹھو۔

اس جمعیتہ نے ایک مشہور روسی انجینیر کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا۔ اس نے یہاں کے لگنائٹ سے موٹروں کا تیل بنانے کی تجویز بتائی اور قرار پایا کہ اسپین میں جرمن آب دوزوں اور ہوائی جہازوں کے لئے کیمیاوی طریق سے یہ تیل بنا کرے، اور وہیں اُن کے مستقر بنا دئے جائیں۔

لیکن اسپین میں سیاست کا رخ پلٹا۔ انقلابی جماعتوں کو کامیابی ہوئی۔ ڈر پیدا ہوا کہ جرمنی اور اٹلی کے یہ منصوبے کھٹائی میں نہ پڑ جائیں، تو ان دونوں طاقتوں نے بغاوت کرانے کی پوری کوشش کی۔ جرمنی کے بعض کارخانوں کو اسپینی مراکش میں پہلے ہی سے کچھ مراعات حاصل تھے۔ جنرل فرینکو نے علم بغاوت بلند کیا تو شروع ہی میں اعلان کر دیا کہ مراکش کی تمام کانوں پر ہمارا قبضہ ہے، پرانے مراعات سب ختم۔ اور اشبیلیہ میں ایک اسپینی نام کی کمپنی قائم کی جسے تمام مراکشی کانوں کا اجارہ دے دیا۔ بھولے لوگ سمجھے کہ جرمنی کو جو رعائتیں حاصل تھیں وہ چھن گئیں۔ لیکن دراصل یہ نئی کمپنی ایک جرمنی کمپنی ہی کا اسپینی نام تھا۔ معاہدہ یہ ہوا کہ اس نئی کمپنی سے جرمنی مال خریدے گا۔ اور مال کے باہر بھیجنے میں اسے جرمن جنگی جہازوں کی مدد حاصل ہوگی۔ چنانچہ جرمنی سے جہاز اسلحہ بھر بھر کر لاتے اور کچا لوہا لاد کر لیجانے لگے۔ اور سچ یہ ہے کہ اگر اس وقت اسپین سے یہ لوہا جرمنی نہ پہنچتا تو اسلحہ سازی کا جرمن پروگرام کب کا ختم ہو چکا ہوتا۔ اس لئے کہ یہ سویڈن سے لوہا لیتا تھا۔ وہاں انگریز خریدار مقابلہ کرنے لگے تھے۔ فرانس

ہیں اب اشتراکی جماعت نوری کی کانوں کے لوہے کو جرمنی جانے سے روکنے کی فکر میں تھی اور ذرائع کی کمی سے اسپین سے بھی کوئی سال ڈیڑھ سال سے بہت کم لوہا پہنچ رہا تھا۔

اس کے علاوہ جرمنوں نے گلیسیا کے ٹین اور ویگو کے لوہے پر بھی اپنا حق جمالیا تھا اور اب استرالادورا کے علاقے میں ٹنگ سٹن اور وناڈیم کی کانوں پر نظر تھی کہ اٹلی نے سوچا کہ ہم کیوں پیچھے رہیں۔ فوجی تیاری کے لئے آخر ضرورت تو ان چیزوں کی ہمیں بھی ہے۔ جھٹ اسپینی باغیوں کی مدد کے لئے اطالوی 'رضاکار' پہنچے، مگر بجائے اس کے کہ محاذ جنگ پر جاتے پہلے معرکہ کارزار سے بہت پیچھے ٹنگ سٹن اور وناڈیم کی کانوں کا رخ کیا۔ کہ پہلے نقد سودا کرلیا جائے پھر اور کچھ دیکھیں گے جنوری میں اس اطالوی لشکر نے ملاگا کا رخ کیا۔ تو کیوں؟ اس لئے کہ ساحل کی طرف کارتاگینا کے نواح میں جو زرخیز کانیں لوہے، سیسہ، تانبے اور گندھک کی ہیں وہ قبضہ میں آجائیں۔ قرطبہ کے شمال میں جو اپنے فاشستی بھائیوں کی مدد کے لئے بے جگری سے بڑھے تو اس لئے بھی کہ المدن کے پارہ کے ذخائر اس طرف تھے! اور خیال تھا کہ آسٹریا کی پارہ کی کانیں تو جنگ کے بعد مل ہی گئی ہیں۔ یہ اسپینی کانیں بھی ہاتھ آگئیں تو دنیا میں پارہ کا اجارہ دار اٹلی بن جائے گا اور اس میں عجلت کی اور ضرورت یوں تھی کہ انگریز جن سے اٹلی کی رقابت قدم قدم پر ظاہر ہو رہی ہے ان کانوں کو اپنے قبضے میں لینے کی فکر میں تھے اور سنا ہے کہ اسکندر کیزنگ کی برطانوی فرم نے اسپینی پارہ کی سول ایجنسی حاصل بھی کرلی تھی

فرانس اور اٹلی جو عام خیال کے مطابق 'باغیوں' کے ہمدرد ہیں، در اصل نہ ادھر ہیں نہ ادھر یعنی جدھر کو فائدہ ہے ادھر ہیں۔ یہ ملک اٹلی اور جرمنی پر خفا ہوتے ہیں کہ وہ کیوں اسپین کے خانگی جھگڑے میں بولتے ہیں۔ مگر خود ان کے سرمایہ داروں کی جو کانیں رلیف علاقہ میں ہیں ان کا سارا لوہا جرمنی کو جارہا ہے اور لطف یہ کہ جرمنی انھیں ایک پیسہ نہیں دیتا۔ سب قیمت جنرل فرنیکو کے جنگی قرضے میں شامل کر دی جاتی ہے۔ یہ جنرل فرنیکو کی مدد نہیں تو کیا ہے؟ ہاں کوئی کھلے مدد کرتا ہے کوئی چھپے۔ اسی طرح ہوئیلا کے علاقہ میں جتنا تانبا ہے وہ سب ایک برطانوی کارخانہ کے ہاتھ میں ہے جس کا کامال نہایت سستے داموں جرمنی کے ہاتھ بیچا جارہا ہے اور جس کا رشتہ اسپینی سیاست سے

یوں ظاہر ہے کہ ادھر ۱۹۳۶ء کے انتخابات میں انقلابی جماعتوں کو کامیابی ہوئی اور ادھر انکے حصے ۲۲ پونڈ سے گر کر ۱۳ پونڈ پر پہنچ۔ ادھر بغاوت ہوئی۔ اور ادھر حصے پھر ۳۰ پونڈ کے ہوگئے ۔



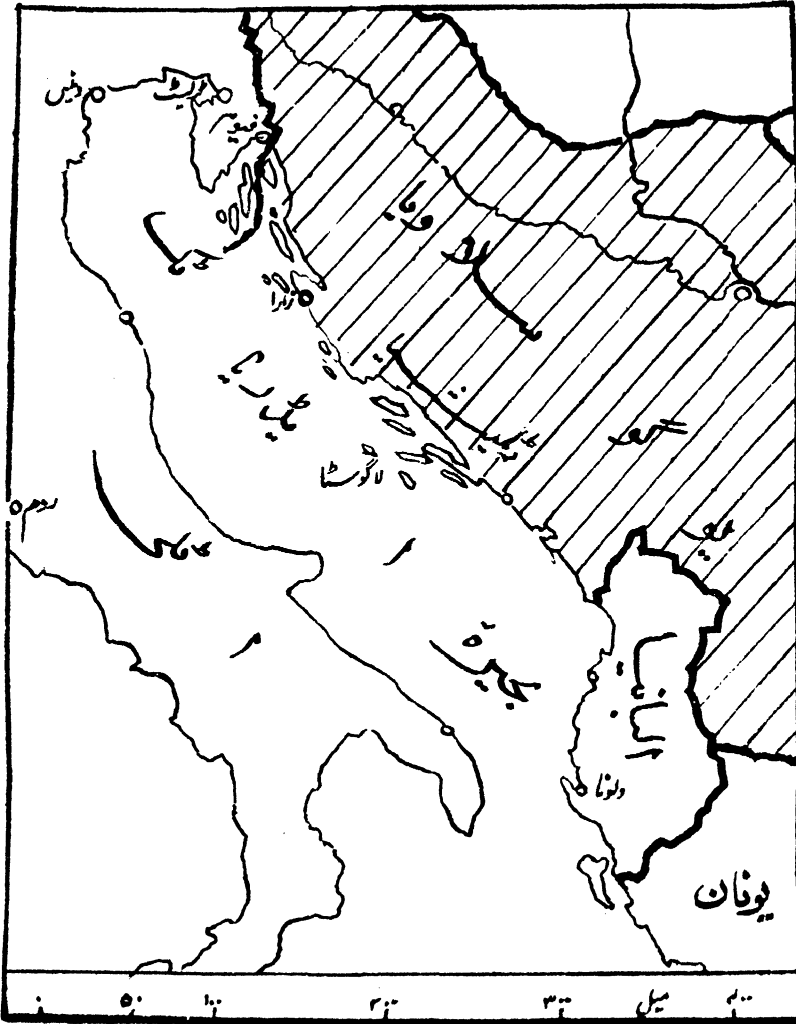
غرض اسپین کی بدنصیبی کی داستان میں اہل اسپین کے محرور المزاج ہونے یا سیاسی ناتجربہ کاری یا بے جا اصول پسندی ہی کو دخل نہیں ؛ اس میں اوروں کی ٹھنڈی طبیعت ، سیاسی تجربہ ، اور بے اصول نفع طلبی کا بھی کچھ شائبہ ہے ۔ ان پوشیدہ قوتوں کے عذاب سے دیکھئے دنیا کب نجات پائے ۔

(ذ ۔ ح)

<u>اٹلی ، برطانیہ اور بحر روم</u> | ہم نے اپنی گذشتہ اشاعت میں اس مقابلہ کا ذکر کیا تھا جو اٹلی اور یوگوسلاویا کے درمیان ہوا ہے ۔ اس سے پہلے اٹلی اور برطانیہ

میں بھی ایک "شریفیوں" کا معاہدہ ہوا تھا، لیکن اس دوسرے معاہدے کے بعد جواب یوگوسلاویا سے ہوا ہے۔ اٹلی اور برطانیہ کے تعلقات کچھ بہت خوش گوار معلوم نہیں ہوتے۔ پچھلے دنوں اطالوی اخبارات اور رسائل میں برطانیہ کے متعلق جس طرح تند و تیز باتیں کہی گئی ہیں وہ بین الاقوامی یا کاری کے معمولات میں سے نہیں ہے۔ شاید برطانیہ کی تاج پوشی سے علیحدگی بھی رائج آداب سیاست کے خلاف ہی ہے۔ اس میں کچھ تو مسولینی اور فاشسٹی جماعت کے مخصوص مبالغہ آمیز اسلوب کار کو بھی دخل ہے۔ مگر واقعہ بھی یہ ہے کہ ان دونوں ملکوں کے درمیان مغربی سیاست میں اور بحر روم کے معاملات میں نہایت اہم اختلافات ہیں۔ برطانیہ خاموشی سے اس مقابلے میں اپنی حیثیت کو مضبوط کرنے کی تدبیر کر رہا ہے اور اٹلی تدبیروں کے ساتھ ساتھ لاطینی حرارت مزاج کا ثبوت بھی دیتا جاتا ہے۔ اور یوگوسلاویا سے معاہدہ دراصل اسی لئے ہے کہ برطانیہ سے نمٹنے میں سہولت رہے۔ جس طرح پولینڈ اور جرمنی میں ڈانزگ کے معاملے پر ایسا اختلاف تھا کہ لوگ سمجھتے تھے کہ بس یہیں جنگ کا آغاز ہوگا اور وہ بھی بس اب اور تب کا معاملہ تھا۔ مگر روس کے مقابلے میں اپنی قوت کو محفوظ کرنے اور وسطی یورپ میں اپنی سیاست کو زور کے ساتھ آگے بڑھانے کی خاطر جرمنی نے یہ تلخ گھونٹ پیا کہ پولینڈ سے دس سال کے لئے معاہدہ کیا۔ اسی طرح اٹلی اور یوگوسلاویا میں بنیادی اختلاف ہے۔ اٹلی بحیرۂ ایڈریاٹک میں بلا شرکت غیرے اپنا تسلط چاہتا ہے اور ڈلمیشیا کے ساحل پر یوگوسلاوی قوت کا فروغ اس کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتا ہے۔ پھر برطانیہ سے یوگوسلاویا کی پینگیں بڑھتی دیکھ کر متوحش ہوتا ہے۔ اسی ایڈریاٹک پر تسلط کی خاطر اس نے ۱۹۱۸ء میں ٹریسٹ اور فیوم لیا۔ پھر ۱۹۲۰ء میں عہد نامہ ریپالو کی رو سے بندرگاہ زارا اور جزیرہ لاگوسٹا پر قبضہ جمایا۔ اسی غرض سے البانیہ کو اپنے سایہ عاطفت میں لیا۔ اس کے لئے اطالوی بنکوں نے البانیہ کی معاشی زندگی کو اپنے ہاتھ میں لیا، اور چوڑی چوڑی فوجی سڑکیں اس غیر اور برائے نام خود مختار ملک میں یوگوسلاویا کی سرحد تک بنا ڈالیں لیکن اس بنیادی مخالفت کے باوجود اس وقت جو معاہدہ کیا ہے تو اس لئے کہ برطانیہ کے سامنے کمزور نہ پڑے، وسطی یورپ میں اس کی سیاست کے لئے ایک روک مل جانے اور بلقان میں

جرمنی کے بڑھتے ہوئے اثر کے مقابلے میں یہ بالکل پیچھے نہ رہ جائے۔ یعنی یہ صلح نامہ بھی دراصل بہتر جنگی تیاریوں کا پیش خیمہ ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے، صلح ہے اک مہلتِ سامانِ جنگ



برطانیہ سے ٹکر لینا کوئی آسان کام نہیں۔ مگر مسولینی آسان کاموں کا زیادہ شایق بھی نہیں معلوم ہوتا۔ گمان ہوتا ہے کہ وہ سب سے مضبوط سے پہلے نمٹنا چاہتا ہے تاکہ پھر سب سے معاملہ ایک ہی وقت میں استوار ہوجائے۔ برطانیہ سے مقابلہ بظاہر چھوٹا منہ بڑی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر حبشہ کی جنگ کے موقع پر برطانوی بیڑے پر جو گذری اس سے تو یہ خیال ہوتا ہے کہ مقابلہ

برابر کا سا ہے اس لئے کہ بحیرۂ روم میں اٹلی کی بڑھتی ہی قوت برطانیہ کے لئے ایک سخت خطرہ ہے اور بحیرہ روم کے مخصوص جغرافیائی حالات نے اور ہوائی جہازوں کی ایجاد نے اس خطرے کو اور بھی سخت بنا دیا ہے۔ مالٹا کا برطانوی بحری مرکز سسلی سے کل ۵۰ میل ہے اور اس فاصلے کو اٹلی کے گولوں سے لدے ہوئے ہوائی جہاز ۲۰ منٹ میں طے کر سکتے ہیں، مالٹا کے بندرگاہ کا منہ بہت تنگ ہے اس میں جہاز آسانی کے ساتھ آ جا نہیں سکتے۔ بندرگاہ کے اندر انھیں برطانوی ہوائی بیڑہ بڑی آسانی سے اپنا نشانہ بنا سکتا ہے۔

چنانچہ جنگ حبش کے موقع پر یہ بات کھل گئی کہ برطانیا مالٹا میں اپنا بیڑہ نہیں رکھ سکتا، سارا بیڑہ اسکندریہ چلا گیا کہ یہاں اطالوی ہوائی جہازوں کی زد سے مقابلتہً محفوظ تھا۔ سوئز پر بھی نظر رکھ سکتا تھا۔ اور حیفہ کے نئے بندرگاہ سے بھی ۲۹۰ میل ہی پر تھا۔ یوں تو بیڑہ کا مالٹا سے ہٹنا کوئی بات نہ ہوئی مگر ہفتوں پہلے سے اطالوی جہاز پیش گوئی کر رہے تھے کہ برطانوی شیر دم دبا کر مالٹا سے کھسک جائے گا۔ اور یہی نہیں کہ بیڑے کو اسکندریہ جانا پڑا، بلکہ کمک کے لئے چین، امریکہ، جزائر غرب الہند کے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ سب ۵ برطانوی بیڑوں سے جہاز بلانے پڑے۔ اگر اسی زمانے میں برطانوی بیڑے کو کسی اوسط درجے کی طاقت سے بھی مقابلہ کرنا ہوتا اور اپنے تجارتی راستوں کی حفاظت کرنی ضرور ہوئی تو مشکل پڑ جاتی۔

برطانیہ نے جنگ حبش میں جو تلخ تجربہ حاصل کیا اس کا نتیجہ فراہمی اسلحہ کا وہ پروگرام ہے جو اس نے شروع کیا ہے اور جس نے فوجی مال کی خریداری بڑھا کر ایک مرتبہ تجارت میں پھر جان ڈال دی ہے مگر اطالوی تیاریاں بھی بڑی شد و مد سے جاری ہیں۔ آج اطالوی بیڑہ ۲۶ سنہ کے مقابلے میں دو گنا بلکہ تگنا طاقت ور ہے۔ مثلاً ۳۰ سنہ میں اٹلی کے پاس ۵ بڑے جنگی جہاز تھے جو جنگ عظیم سے پہلے کے بنے ہوئے تھے۔ پچھلے سال اس کے پاس دو جہاز تو ۳۵، ۳۵ ہزار ٹن کے بالکل نئے تھے، دو نہایت ہی اعلیٰ درجے کے بالکل نئے بڑے جہاز ۲۷ ناٹ کی رفتار والے تھے۔ اور دو جنگ سے پہلے کے بڑے جہاز ۲۶ سنہ میں اس کے پاس کوئی کروزر نہ

تھا جو جنگ عظیم کے بعد بنا ہو۔ پچھلے سال ۱۹ کروزر تھے جو دنیا کے سب سے تیز رفتار جہازوں میں سے ہیں۔ سنہ ۲۶ء میں اس کے پاس ۴۴ نئے ڈسٹرائر تھے۔ پچھلے سال ۴۷۔ سنہ ۳۶ء میں کل ۷۵ آب دوزیں تھیں اکثر پرانی اور از کار رفتہ تھیں پچھلے سال ۸۸ نئی آب دوزیں اسکے بیڑے میں موجود تھیں غرض اٹلی کی بڑھتی ہوئی قوت کا مقابلہ برطانیہ تک کے لئے کچھ سہل نہیں۔ اٹلی اور برطانیہ معاملہ کو اپنے اپنے نقطۂ نظر سے خوب سمجھتے ہیں اٹلی چیختا چلاتا بھی ہے انگلستان صرف تدبیریں کرتا ہے اور حسب معمول دو قسم کی تدبیریں۔ ایک ایسی جن سے معاملہ اس وقت سنبھل سکے، ایک وہ جو آخر تک دیکھ کر اختیار کی جائیں۔ فوری ضرورت کے لئے تو اپنی بحری اور ہوائی قوت کو بڑھا رہا ہے، اٹلی کے لئے کچھ سہل تو نہ ہوگا کہ برطانیہ کو جالے۔ مگر دور بینی کا تقاضا یہ ہے کہ بحر روم سے ہٹنا بھی پڑے تو آگے کا انتظام ہو جائے چنانچہ برطانوی رسائل اور برطانوی ارباب فکر اس فکر میں ہیں کہ قوم کے ذہن سے بحر روم کی غیر معمولی اہمیت کا خیال ہٹائیں چنانچہ جتایا جا رہا ہے کہ ہر ہفتہ برطانیہ میں کوئی ایک ملین ٹن کھانے کی چیزیں اور خام اجناس دوسرے ملکوں سے آتی ہیں اس میں سے صرف پانچواں حصہ بحر روم سے گذرتا ہے۔ بحر روم کے ساحلی ممالک سے جو مال آتا ہے اسمیں سے بہت ہی کم کھانے پینے کی چیزیں ہوتی ہیں۔ زیادہ تر مصر کی کپاس اور اسپین کے معدنیات ہوتے ہیں جن کا آنا رک جائے تو تکلیف ضرور ہو مگر قومی زندگی خطرے میں نہ پڑے۔ پھر ان کے عوض دوسرے ممالک سے چیزیں لانے کے امکان بھی ہیں۔ حساب لگانے والوں نے حساب لگایا ہے کہ اگر بحر روم کا سارا مال رک جائے تو برطانیہ کے کھانے پینے کی برآمد میں بس دس فی صدی کی کمی ہوگی زیادہ نہیں۔ افریقہ کے جنوب سے جہازوں کے لے جانے میں بے شک فاصلہ بڑھے گا۔ جس کی تلافی کچھ رفتار بڑھا کر کی جائے گی۔ کچھ یوں کہ نہر سوئز کے محاصل نہ پڑیں گے۔ اور بہت کچھ یوں کہ اس راستہ پر بیمہ کا صرف بہت کم ہوگا بحر روم میں سے سفر پر خصوصاً جنگ کے زمانے میں بیمہ کی شرح بہت چڑھ جائے گی اور یہ نیا راستہ مقابلتہً مامون ہوگا۔ غرض اٹلی سے شریفانہ معاہدہ بھی ہو رہا ہے، موقع ہو تو اسے نبٹ لینے کی تدبیریں بھی ہو رہی ہیں، اور اگر یہ موقع نہ ملا تو اپنے کام کو دوسری طرح نکالنے کے نقشے بھی بنے بنائے تیار ہیں۔ سچ ہے دور اندیشی اور عاقبت بینی اسی کو کہتے ہیں۔

د ، ح ، ا

مسٹر روزولٹ کا آئینی خطرہ ۱۸۰۳ء کا واقعہ ہے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی عدالت عالیہ نے اپنے اس حق کا مطالبہ کیا کہ وہ کانگریس کے پاس کردہ قانون کو مسترد کر سکتی ہے بشرطیکہ وہ دستور اساسی کے خلاف ہو۔ اسکے کچھ عرصے کے بعد جسٹس واشنگٹن نے اسکی تحدید کر دی۔ کافی مدت تک عدالت عالیہ اپنے اختیارات کو اسی اعتدال کے ساتھ برتتی رہی بعد ۱۸۵۷ء کو پہلی مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا کہ عدالت عالیہ نے کانگریس کے ایک قانون کو خلاف آئین قرار دیا۔ اسکے تباہ کن نتیجے کو دیکھتے ہوئے یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ شاید یہ اپنی قسم کا پہلا اور آخری واقعہ ہو۔ امریکہ کی حدود میں غلامی کے پرچار پر طویل جھگڑا پیدا ہو گیا تھا۔ اس کو ختم کرنے کے لئے عدالت عالیہ نے ۱۸۵۷ء میں اعلان کر دیا کہ وفاقی حکومت کو غلامی کے مسئلہ میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ ۱۸۲۰ء کا (Missouri Compromise Act) غیر آئینی تھا۔ عدالت کا خیال تھا کہ اس فیصلے سے یہ مسئلہ شاید ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ اب کچھ عرصے سے عدالت نے کھلے بندوں کانگریس کے پاس کردہ قوانین کو غیر آئینی قرار دینا شروع کر دیا۔ گذشتہ چند برس سے ہر وہ قانون جو عدالت کے پاس نظر ثانی کے لئے جاتا مسترد ہو جاتا۔ صرف ایک قانون جس کے ذریعے ڈالر میں سونے کی مقدار کم کر دی گئی تھی اس بدسلوکی سے بچا۔ اس دوران میں پے درپے تین انتخابات ہوئے ہیں، ہر ایک میں لوگوں نے امریکہ کی نئی سیاست کی پرزور تائید کی ہے۔

ہوا یہ کہ گذشتہ کئی برس سے عدالت اپنے کو ایک عدالتی مجلس ہی نہیں بلکہ سیاسی اور معاشی مسائل کا بھی نگران سمجھتی رہی ہے اور یہ اختیارات ۱۸۰۳ء والے مطالبے سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ گذشتہ جون میں تو بڑا ہی نازک موقع پیش آ گیا تھا جب عدالت نے نیویارک اسٹیٹ مینی مم ویج ایکٹ (N. York State Minimam wage Act) کو رد کر دیا۔ اور اس کی وجہ یہ بیان کی کہ عورتوں کو مزدوری کرنے سے روکنا انھیں ذاتی ملکیت سے محروم رکھنا ہے۔

امریکہ میں اس وقت اکثر ایسے لوگ ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ عدالت عالیہ اور ... حکومت کا جھگڑا آسانی کے ساتھ طے ہو جائے۔ نزاع اس بات پر ہے کہ ایسا کیوں کر ہو؟ سردست تین تجویزیں زیر غور ہیں۔ اول یہ کہ دستور کے مبہم الفاظ میں تبدیلی کر دی جائے دوم یہ کہ عدالت کے اختیارات

میں ترمیم کردی جائے۔ سوم یہ کہ عدالت کی ہیئت ترکیبی ہی کو بدل دیا جائے۔ ہر ایک طریقے پر یکے بعد دیگرے غور کیجئے تو معلوم ہو جائے گا کہ صدر کانگریس نے تیسرا طریقہ کیوں اختیار کیا ہے۔

پہلی تجویز پر عمل کرنے سے پیچیدہ الفاظ اور مبہم تراکیب اور ان کی تعریف پر بحثیں ہوں گی اور جھگڑا بڑھے گا۔ نیز قانون کے الفاظ اگر جچے تلے ہوں تو اس کے حقیقی معنوں میں وسعت پیدا نہیں ہو سکتی۔ کسی آئین یا دستور کو اگر زندہ رہنا ہے تو اس کے الفاظ اور عبارات کو جامع اور وسیع ہونا چاہیئے تاکہ زمانے کی بدلتی ہوئی ضروریات کے ساتھ ساتھ اس کے معنی اور مفہوم کو وسعت دی جا سکے۔ قانون اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے۔ اور آئے دن اس کی نئی نئی شرحیں ہوتی رہتی ہیں جیسا کہ خود کانگریس کی آئینی تاریخ گواہ ہے۔ پس قانون کے الفاظ کی محدود اور مقید تعریف نہیں ہونی چاہیئے، بلکہ اس کی لچک کو باقی رکھنا چاہیئے۔

دوسری تجویز یہ ہے کہ عدالت عالیہ کے اختیارات کو محدود کر دیا جائے یعنی یا تو قانون پر نظر ثانی کا حق اس سے چھین لیا جائے یا پھر نظر ثانی کے اختیارات پر قیود لگا دی جائیں۔ اس سلسلے میں بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جب کوئی قانون، عدالت عالیہ کی طرف سے مسترد ہو جائے تو اس کی بابت عام باشندوں کی رائے لے لی جایا کرے۔ ایک دوسرا طبقہ ایسا بھی ہے جو یہ چاہتا ہے کہ کانگریس کے دو تہائی یا تین چوتھائی ارکان کو عدالت کے فیصلے کو منسوخ کر دینے کا اختیار ملنا چاہیئے۔ غرض دوسری تجویز پر عمل کرنا بھی بڑی بڑی الجھنوں کا باعث ہو سکتا ہے۔ نیز صدر اور اس کے مشیر اسی کشمکش و پیچ میں ہیں کہ آیا عدالت کے اختیارات کو محدود کرنا خلاف مصلحت تو نہیں ہو گا۔

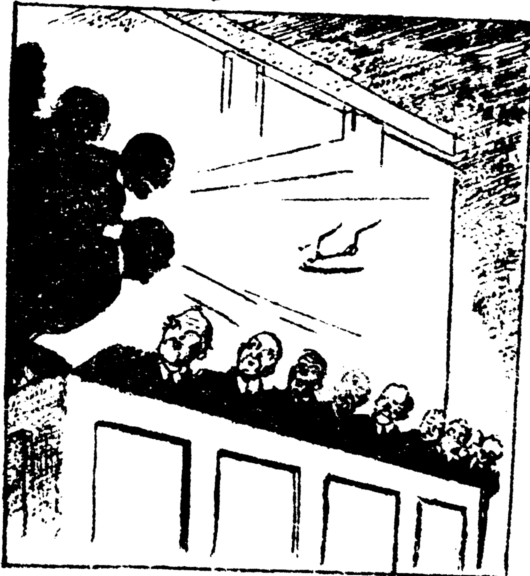
اب رہی تیسری تجویز۔ سو یہ امریکہ کی آئینی روایات کے زیادہ مطابق ہے مسٹر روزولٹ کا یہ خیال ہے کہ عدالت کے گذشتہ چند ایک فیصلوں نے حکومت کا احترام لوگوں کی نظروں میں کم کر دیا ہے اس لیئے وہ اس خیال پر زور دیتے ہیں کہ دستور کو جوں کا توں رہنے دیا جائے

اور صرف ججوں کو تبدیل کر دیا جائے ۔ عدالتِ عالیہ کے اراکین میں ایسے افراد ہونے چاہئیں جو زمانے کی معاشی اور سیاسی ضروریات کو پیش نظر رکھیں ۔ ان کا مقصد محض یہی نہ ہو کہ دستوری حکومت کے کام میں روڑے اٹکائے جائیں ، بلکہ انھیں دستوری نظام کو چلنے کا موقع دینا چاہیئے ۔

اس ساری گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ موجودہ عدالت عالیہ کی قیود سے امریکہ کو کسی نہ کسی طرح آزاد کرایا جائے ۔ لیکن یہ مقصد اس طرح حاصل نہیں ہو گا کہ دستوری قوانین کا دائرہ تنگ کر دیا جائے ۔ کیونکہ الفاظ اور عبارات کا مبہم ہونا بھی اپنے اندر بہت سی خوبیاں رکھتا ہے ۔ دوم عدالتِ عالیہ کو تبصرے کے حق سے محروم کرنا بھی غلطی ہوگی ۔ اب رہا آخری طریقہ کہ دستوری حکومت کے نظام کو عدالتِ عالیہ کی بیجا پابندیوں سے آزاد ہو کر چلنا چاہیئے تو یہی صورت بہترین ہے اس سے حکومت اور عدالت دونوں کا دائرہ عمل جداگانہ رہے گا ۔ اور تصادم کے امکانات دور ہو جائیں گے ۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ عدالت عالیہ کے ارکان ایسے ہوشمند افراد ہوں جو قانون پر نظر ثانی کرتے وقت موجودہ سماجی اور معاشی حالت کو بھی نگاہ میں رکھیں ۔ دیکھیں اس آئینی جنگ میں صدر جمہوریہ امریکہ کامیاب ہوتے ہیں یا عدالت عالیہ کا پلہ بھاری رہتا ہے ۔

(ع ۔ ق)

عدالت عالیہ



The George Matthew Adams Service, Inc.

اسلامی دنیا

ترکی | عبدالحق حمید کا انتقال ترکی کا ناقابل تلافی نقصان ہے۔ حمید مرحوم علمی خاندان کے ایک فرد تھے، اُن کے والد خیرالدہ افندی ترکی کے مشہور مورخ تھے، دادا عبدالحق نے سلطان محمود اور سلطان عبدالمجید کے زمانے میں ترکی میں پہلی طبی فیکٹری قائم کی تھی، مرحوم ۵ر فروری ۱۸۵۲ء کو قسطنطنیہ میں پیدا ہوئے تھے۔ تعلیم بھی وہیں پائی، اور سب سے پہلے ترکی کے سفیر متعینہ طہران کے سکریٹری بنا کے ایران بھیجے گئے۔ اس کے بعد پیرس میں بھی اس خدمت پر مامور رہے۔ جنگ عظیم سے پہلے ہندوستان بھی آئے اور سفیر ترکی کی حیثیت سے یہاں مدتوں مقیم رہے۔ اس کے بعد ایک زمانے میں بلجیم میں ترکی، وکیل التجار بھی رہے۔ ۸۶ سال کی عمر میں وفات پائی، ترکی میں عام طور پر زبردست ماتم کیا گیا۔ نماز جنازہ میں ہزارہا آدمیوں نے شرکت کی جن میں خود مصطفےٰ کمال بھی شامل تھے

مرحوم اس دور کے جس کو خالدہ خانم نے عہد تنظیمات سے تعبیر کیا ہے، سب سے بڑے شاعر تھے۔ اور اس حلقے میں اگر اپنی ذاتی صفات اور اپنی تعلیم کے لحاظ سے نہیں تو اپنے آرٹ کے لحاظ سے ضرور سب پر فوقیت رکھتے تھے۔ انھوں نے ترکی زبان میں ناٹک لکھے جو ادب جدید کی مستند کتابوں میں شمار ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ترکی روحانی شاعری کا اُن پر خاتمہ ہوگیا۔ مرحوم کی تصانیف نے ادب جدید کا معیار بہت بلند کردیا اگر اُن کا ترجمہ دوسری زبانوں میں ہوجائے تو وہ یقیناً بین الاقوامی شہرت حاصل کرلیں۔ ان کتابوں میں ظلم اور نااتفاقی کے خلاف شدت سے احتجاج کیا گیا ہے۔ گو ان میں پرانے زمانے کے قصے ہیں، مگر اس نے جابجا سلطان عبدالحمید کے استبداد پر خوب چوٹیں کی ہیں۔ اس کے نزدیک ظلم و جور۔ زمانے کے تغیرات سے بے خبری، تعلیم کی کمی، سرکاری ملازمتوں کا کوئی باضابطہ محکمہ نہ ہونا۔ حاکم و محکوم میں باہمی اعتماد و اعتبار نہ رہنا سب ملک کے زوال اور تباہی کی علامتیں ہیں۔

ذیل میں مرحوم کی ایک چھوٹی سی عبارت کا آزاد ترجمہ ملاحظہ فرمائیے، یہ وہ موقع ہے

جب طارق ابن زیاد فاتح ہسپانیہ اپنے آپ سے مخاطب ہوکر کہہ رہا ہے۔

"اے طارق آج تو شاہانِ ہسپانیہ کے خزانے میں کھڑا ہے۔ دیکھ تو کہاں سے کہاں پہنچ گیا، شام سے طلیطلہ میں غریبوں کی جھونپڑی سے شاہوں کے خزانے میں مگر یاد رکھ ایک دن تجھے قبر میں بھی جانا ہے (بادشاہوں کے تاج دیکھ کر اور انھیں ہاتھ میں لے کر) تیرے ہاتھ میں یہ چمک دار چیزیں کیا ہیں جن پر نظر نہیں ٹھہراتی؟ بڑے بڑے بادشاہوں کے ٹوٹے پھوٹے تاج یہ آج تیری مٹھی میں ہیں، گذری ہوئی عظمت اور شوکت کے بچپن گواہ، مگر خود تو کیا ہے اے فتح مند سپہ سالار؟ فقط قبروں کا محافظ خبردار اِن تاجداروں کی تقلید نہ کرنا۔ جو ان تاجوں کے مالک تھے۔ وہ نادان اور مغرور تھے، انھیں انسان کی عاجزی اور بے کسی کا علم نہیں تھا اور زمانے کا تغیر نظر نہیں آتا تھا۔

آج تو اُن کے شاندار محل میں کھڑا ہے، ان کی دولت کا مالک ہے۔ تو نے اُن کے گڑے ہوئے خزانوں کو ڈھونڈھ لیا ہے۔

تقدیر کے دھارے کا پلٹنا دیکھ۔ اس جلیل القدر قوم کا پلٹنا دیکھ جو آج تیرے قدموں کے تلے ہے۔ یہ انقلاب تیرے ہی ہاتھوں ہوا ہے۔ مگر پھر بھی اے طارق ابن زیاد تو کیا ہے محض ایک ذرۂ بے مقدار۔

پڑھ اے طارق ابن زیاد پڑھ۔ ان میں سے ہر ایک تاج ایک بادشاہ کی عبرت ناک داستان سناتا ہے۔ پڑھ اے ابن ناصر کے غلام۔

راڈرک نے اپنی قوم پر ظلم کیا۔ اتنا ظلم کیا کہ آج قوم کے دل میں نفرت اور انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے۔ دانش مند اس کی صحبت سے پرہیز کرتے تھے۔ اس کے گرد خوشامدیوں کا حلقہ تھا۔ اور اس کے ملک پر جاہلوں اور نااہلوں کی حکومت اس شہر کی عمارتوں میں مجھے ایک مدرسہ، ایک اسپتال بھی نظر نہیں آیا۔ جدھر دیکھیے

محل ہیں، یا قید خانے، یا گرجے۔

راڈرک کو خبر نہ تھی کہ جس ملک کا بادشاہ ظالم ہو جس کے باشندے جاہل اور بے بس ہوں، اس کا انجام یہی ہوتا ہے۔ کہ غیر قومیں اسے کچل کر رکھ دیتی ہیں۔" (خطبات خالدہ خانم)

جمہوریہ ترکیہ نے طے کیا ہے کہ ترکی حدود کے اندر صرف ترکی بولنا جائز ہے۔ عام لوگ تو ہمیشہ سے ترکی بولتے ہیں۔ اگر بولتے نہیں ہیں تو ترکی کو اپنی مادری زبان ضرور سمجھتے رہے ہیں اس وقت مشرقی ترکی (کردی قبائل) میں کردی بولی جاتی ہے۔ اور جنوب ترکی میں لوگ عربی بولتے ہیں۔ اس کے علاوہ بلقان کی دوسری ریاستوں سے جو ترک مہاجر واپس آئے ہیں۔ اپنی اپنی زبانیں ساتھ لائے ہیں۔ لیکن یہ سب لوگ بہرحال ترک (مسلمان) ہیں۔ لیکن دشواری یہ ہے کہ یہاں یونانی بھی آباد ہیں اور وہ ترکی کو مادری زبان کی حیثیت دینے پر آمادہ نظر نہیں آتے کہ یونان کی تہذیب و تمدن سے اُن کا نہایت گہرا تعلق ہے، دوسرے یہودی، عیسائی اور ارمنی اقلیتوں کے لئے بھی یہ محل تامل ہے۔ اس لئے معاملہ ذرا پیچیدہ سا ہو گیا ہے۔ لیکن وہ قومیں جن کا جذبہ ملی بیدار ہو چکا ہو، ایسی مشکلوں کو خاطر میں نہیں لایا کرتیں۔ ہم دیکھیں گے کہ ایک دن تمام ترکی عملی طور پر وحدت لسان کا قائل ہو گا۔

مصر | برطانوی مصری معاہدہ کے بعد مصر میں ایک نئی روح پیدا ہو گئی ہے۔ قوم اور اکابرین قوم کی خفتہ قوتیں اور فطری صلاحیتیں بیدار ہو رہی ہیں ملکی دفاع اور استحکام کے لئے لوگ بڑی فراخ دلی کے ساتھ عطیات دے رہے ہیں۔ مجلس اقوام کی رکنیت میں بھی اب محض فیس داخلہ (۴۰ ہزار فرانک) ادا کرنے کی دیر ہے۔ جامعہ ازہر کا وفد جو ہندوستان آیا تھا قاہرہ پہنچ گیا ہے اس نے مصر کے ساتھ مسلمانانِ ہند کے گہرے تعلق کی تصدیق کرتے ہوئے دینی جماعتوں کی تفریق و تشتت پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ اس وفد نے حکومتِ مصر سے اپیل کی ہے کہ وہ

دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان کے طالب علموں کے تعلیمی اور اقامتی اخراجات بھی خزانۂ عامرہ سے ادا کرے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ معاہدۂ مصر و برطانیہ میں مراعات[1] کی تنسیخ کا مسئلہ ایک بین الاقوامی کانفرنس پر ملتوی کر دیا گیا تھا۔ حکومت مصر کی بار بار یاد دہانی اور اصرار کرنے کے باوجود برطانیہ اب تک حیلے حوالوں سے ٹالتی رہی۔ لیکن بالآخر اپریل میں مانٹرلو میں یہ کانفرنس منعقد ہوئی تقریباً تمام متعلقہ ملکوں کے نمائندے شریک ہوئے اور زبردست بحث مباحثہ رہا۔ حتیٰ کہ ۸ مئی کی صبح کو ایک معاہدے پر تمام حکومتوں کی طرف سے دستخط کر دئے گئے، اس معاہدہ کی تفصیلات تاحال اخبارات میں نہیں آئی ہیں۔ البتہ نحاس پاشا وزیر اعظم کے بیان سے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ "مصر اپنے مفاد کے لئے حق پر تھا اسی لئے یہ کانفرنس بخیر و خوبی تمام ہوئی" اور برطانوی وزیر کے اس ریمارک سے کہ "وہ امتیازاتِ خصوصی جن کی تنسیخ عمل میں لائی گئی ہے واقعی موجودہ حالات میں مصر کے سراسر خلاف تھے" فیصلے پر روشنی پڑتی ہے۔ مصر کے تعلیمی مسائل میں ایک دشواری پیدا ہوگئی ہے۔ ایک جماعت جس کی رہنمائی ڈاکٹر طٰہٰ حسین کر رہے ہیں چاہتی ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے نصاب سے دینیات کو خارج کر دیا جائے اور عورتوں کو (مغربی لباس میں) مردوں کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے کی اجازت ہو۔ شیخ الازہر مصطفی المراغی ان تجاویز کو پسند نہیں فرماتے اور عام مغربی برائیوں کے پیش نظر اس روشن خیالی کو مصر کے لئے مفید اور مبارک نہیں سمجھتے۔

---

[1] امتیازات کی رو سے مغربی حکومتوں کو۔ جن میں برطانیہ، بلجیم، ڈنمارک، فرانس، اٹلی، یونان، پرتگال اسپین سویڈن، امریکہ جنوبی افریقہ، اور آئرلینڈ شامل ہیں یہ حق حاصل ہے کہ وہ مصر میں اپنے ڈاک خانے کھولیں۔ اپنے مدرسے قائم کریں۔ اور اپنے شفا خانے بنائیں اور عدالتوں کا قیام عمل میں لائیں۔ مصری حکومت خود مختار ہونے کے باوجود کسی سفید قوم مجرم پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی۔

ملک کی دوسری باا ثر جماعت شیخ کی تائید میں جوش کا اظہار کر رہی ہے ۔ اس سلسلے میں یہ خبر بھی قابل ذکر ہے کہ وزیر تعلیم نے ایک حکم نافذ کیا تھا کہ قبطیوں (مصر کی غیر مسلم اقلیت) کو قرآن کی آیات حفظ نہ کرائی جائیں ۔ اس حکم کے خلاف عام طور پر اظہار ناراضی کیا گیا ۔ پارلیمنٹ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے وزیر نے جواب دیا کہ قبطیوں کی طرف سے قرآن کے حفظ کے معاملے میں کوئی شکایت وصول نہیں ہوئی ہے" مصری اس تفریق کو بہت ناپسند کر رہے ہیں ۔ خود قبطی طلبا نے یہ اعلان کیا کہ قرآن کی بلاغت کی بنا پر ہم خود اس کی آیات کو یاد کرنا چاہتے ہیں ۔ یہ حقیقت ہے کہ جہاں قرآن مسلمانوں کا مقدس سرمایہ دینی ہے وہاں عربی ادب کے لئے بے نظیر سامان افتخار بھی ہے ۔ اس لئے اگر قبطی قرآن کی تعلیم و حفظ پر اصرار کرتے ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ، ہمارے نزدیک محض غیر جانب داری کے اظہار میں کسی کو قرآن سے محروم کر دینا عقل مندی نہیں ہے ۔

شاہ فاروق کو طلبا ء تعلیم سے خاص دلچسپی ہے ، ، جاپانی طالب علم جو قاہرہ پہنچ چکے ہیں اور ۱۵ چینی طلبا ء جو جون میں مصر آنے والے ہیں ، ان کی تعلیم اور قیام کے تمام اخراجات شاہ فاروق جیب خاص سے ادا کریں گے ۔

ایران ۲۵ مارچ کو ایران میں ۱۳۱۶ء کا آغاز ہوا ۔ نو روز کا جشن بڑے جوش و خروش سے منایا گیا ۔ شاہ پہلوی کو عنان حکومت ہاتھ میں لئے یہ بارھواں سال ہے ، اس عرصے میں معاشی اور سیاسی تمدنی اعتبار سے ملک کے اندر جو انقلاب پیدا ہوا ہے وہ ہر شخص کے لئے سامان حیرت ہے ۔ فلک بوس پہاڑوں کو کاٹ کاٹ کر جس تندہی کے ساتھ ریلوے لائن کی جوئے شیر نکالی گئی ہے وہ دشمنوں کو داد دینے پر مجبور کر دیتی ہے ، ایک مغربی اہل الرائے کا خیال ہے کہ "ایران سے زیادہ خوب صورت سڑکیں اس وقت دوسرے ملکوں میں مشکل سے ہونگی ہیں " ایران میں اب ہر جگہ کار جا سکتی ہے ، پہاڑوں کے گرد گھومتے ، دریاؤں پر دوڑتے ، ریگستانوں میں فراٹے بھرتے ہوئے جہاں دل چاہے چلے جائیے ۔

سڑکوں اور ریلوں کے سلسلے میں شاہ پہلوی کا سب سے بڑا کارنامہ "ٹرانس ایرانین" ریلوے ہے۔ جس کے ذریعے وہ بحیرۂ خزر کو خلیج فارس سے ملا دینا چاہتے ہیں۔ اسکی تیاری میں عام وزراء اور مغربی "دوستوں" کی مخالفت کے باوجود شاہ نے محض اپنی ذمہ داری پر بے پناہ روپیہ خرچ کر ڈالا ہے۔ شاہ جہاں کو شاید تاج کی تعمیر سے وہ عشق نہ ہوگا جو رضا شاہ نے اس ریل کی تعمیر میں ظاہر کیا ہے۔ اس کے نزدیک اس کی اہمیت جسم ایران میں "شہ رگ" سے کم نہیں۔ اس ریل کا ایک حصہ شمالی مکمل ہوگیا ہے جس کا طول ۴۶۱ کلو میٹر اور ۲۰۰ میٹر ہے۔ اس کے علاوہ جنوب میں بھی ۲۶۱ کلو میٹر لائن طیار ہوچکی ہے حال ہی میں طہران کے ریلوے اسٹیشن کا خود شاہ نے سنگ بنیاد رکھا ہے۔ شمال، جنوب اور مشرق و مغرب کی ساری لائنیں اس نقطہ پر مرکوز کردی جائیں گی۔ بندر شاہ پور اور بندر شاہ کے درمیان بھی ایک ریلوے لائن بچھائی جارہی ہے۔

ترکی میں لاطینی حروف اختیار کرنے پر جس شدت سے کام لیا گیا تھا آج وہی سختی ایران میں اطالوی رسم خط کے خلاف برتی جارہی ہے۔ دکانداروں کے بورڈ پر بھی لاطینی میں کچھ نہیں لکھا جاسکتا۔ اس حکم کے نافذ ہوتے ہی ایران کے بازاروں کے سارے بورڈ بدل گئے۔ غیر ملکی کمپنیوں، بنکوں اور کارخانوں کو بھی ایرانی جامہ پہننے پر مجبور ہونا پڑا۔

عراق حکومت حجاز کے ولی عہد امیر سعود[1] گذشتہ مہینے دولت عراق کی دعوت پر بغداد تشریف لائے۔ عراقی حکومت نے بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا اور اعزاز و اکرام کے ساتھ مہمان رکھا۔ امیر سعود کے اعزاز میں بغداد میں ایک فوجی مظاہرہ ہوا۔ وزرا اور افسران حکومت

---

[1] حکومت حجاز کے دو مستقل حصے ہیں نجد اور حجاز جن کی ولایت سلطان ابن سعود کے دو بیٹوں فیصل اور امیر سعود کے سپرد ہے۔ امیر سعود بڑے لڑکے ہیں اور ۱۳۵۲ھ میں ولی عہد مقرر ہوئے ہیں۔ انکے سپاہیانہ اوصاف بہت نمایاں ہیں۔ گذشتہ سال حج کے موقع پر ایک یمنی حملہ آور سے سلطان کی جان بچائی تھی۔

کے علاوہ ہزاروں عوام اس میں شریک ہوئے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے دنوں حجاز اور عراق کی حکومتوں کے درمیان ایک دوستانہ معاہدہ ہوا ہے ولی عہد حجاز کی آمد نے اس معاہدے میں جان ڈال دی اور تعلقات میں مضبوطی پیدا کردی۔ امیر سعود کا یہ فقرہ خاص طور پر مشہور رہا "العراق منا ونحن منہ"۔ یہ تعلقات یوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ایک ہمسائیگی اور پھر اسلامی اخوت لیکن اگر دس بارہ سال پہلے کے حالات پیش نظر ہوں تو پھر تعجب بھی کم نہ ہوگا۔ شریف حسین مرحوم کو ترکوں کی مخالفت اور اتحادیوں کی حمایت کے صلے میں عرب کی سلطنت بخشی گئی تھی۔ ابن سعود (امیر نجد) نے ۱۹۲۵ء میں حجاز پر حملہ کیا علی (ابن حسین) جو اس وقت باپ کے جانشین تھے۔ مقابلے کی تاب نہ لاسکے، جان بچاکر حجاز سے چلے آئے اور اپنے بھائی فیصل امیر عراق کے یہاں پناہ گزین ہوئے۔ حجاز پر ابن سعود کا پرچم لہرانے لگا۔ اس کے بعد کویت کے مسئلہ پر فیصل سے بھی ابن سعود کی خاصی کش مکش رہی۔ اس وقت سے شریف حسین اور ان کے تینوں فرزند فیصل (شاہ عراق)، عبداللہ (امیر شرق اردن) اور علی (سابق امیر حجاز) برابر انتقام کی فکر میں رہے۔ حتیٰ کہ حسین، فیصل اور علی راہی ملک عدم ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بغض و عناد بھی ان کے ساتھ رخصت ہوا۔ شاہ غازی والی عراق اس معاملہ میں خاص طور پر قابل داد ہیں کہ انھوں نے بڑی عالی ظرفی کے ساتھ یہ نیک قدم اٹھایا۔ ان کے چچا امیر عبداللہ امیر شرق اردن اس تعلق پر بہت برہم ہیں۔ وہ اس فکر میں تھے کہ عراق، شام اور فلسطین کو ملاکر حجاز کے خلاف محاذ قائم کیا جائے

خبر آئی ہے کہ حکومت عراق سرحد کے یزیدوں سے آخری طور پر نبٹ لینا چاہتی ہے سلیمان حکمت وزیر اعظم عراق نے طے کرلیا ہے کہ یا تو یزیدوں کو فوج میں بھرتی کریں گے یا ان کا قلع قمع کردیں گے۔

یزیدی عراقی فوج کو ہمیشہ پریشان کرتے رہتے ہیں۔ ان کے عقیدے میں عراقی حکومت کافروں اور شیطانوں کی حکومت ہے اور اس کو تباہ برباد کرنا عبادت و جہاد ہے۔ اُن کے حملے یکایک ہوتے ہیں اس لئے زیادہ نقصان کا باعث ہوتے ہیں۔ اصل میں یہ ایک کردوں ہی کا

ایک قبیلہ ہے لیکن عقائد میں اُن سے بہت کچھ مختلف ہی، اُن کی آبادی زیادہ تر عراق کے شمال (نزد موصل)، مغربی سرحد (موصل سے ۱۰۰ میل)، اور جبل سنجر وغیرہ میں ہے - یہ لوگ بھی بڑے جنگ جو اور خوں خوار ہیں۔ حکومت عراق میں انکی تعداد ۴۰ ہزار سے کم نہ ہوگی۔ عقائد اس کے عجیب ہیں - ایک فرشتہ طاؤس (مور) اُن کا معبود ہے۔ جگہ جگہ اس کے مجسمے ہیں اور اس کی پوجا کرتے ہیں - ان کا با قاعدہ ایک نظام ہے - ان کا ایک شیخ اعظم ہے جو حاکم اعلیٰ کی حیثیت رکھتا ہے - اور جرائم کی سخت سے سخت سزا دینے کا مجاز ہی۔ اسی شیخ کے اشارے پر یزیدی "شیطانوں" کے خون کی ندیاں بہا دیتے ہیں -

---

البانیہ البانیہ کی آبادی میں اکثریت مسلمانوں کی ہے اوراس لحاظ سے اسے اسلامی ریاست کہا جا سکتا ہی۔ یہ احمد زوغو کے دورِ حکومت میں ترقی کر رہی ہے - ایک مغربی سیاح ترانا (دارالسلطنت) میں "جدید کشادہ سڑکوں پر برقی روشنی، خوش نما عمارتوں کا تسلسل نئے رنگ روپ میں پرانی مسجدوں کا طمطراق، جابجا قابلِ تعریف ٹریفک کا معقول انتظام اور ہوائی جہازوں کا وسیع مرکز" دیکھ کر اس چند سالانہ انقلاب پر حیرت کا اظہار کرتا ہے۔ البانیہ آہستہ اہستہ ترکی کے نقش قدم پر چل رہا ہے - اگرچہ ترکی کی بجائے - لاطینی[۵۱] حروف استعمال کرنے میں وہ ترکی کے امام کی امام کی حیثیت رکھتا ہے ابھی حال میں حکومت نے برقعہ کی ممانعت، کا قانون پاس کیا ہے جس کی منظوری "مجلسِ دینی" نے بھی دے دی ہے - اب تک یہاں پردے کا سختی سے رواج تھا - البتہ نیچے کے طبقوں میں ہندوستان کی طرح وہاں بھی برقعہ استعمال نہیں کیا جاتا تھا - سوائے ایک خاص قصبہ کے جہاں

---

۵۱ - البانیہ کے باشندے ۱۹۳۰ء سے ترکی رسم خط کی بجائے لاطینی حروف استعمال کرتے ہیں -

معمولی مزدور عورتیں بھی رسماً پردے پر مجبور تھیں ۔ اور دلچسپ بات یہ تھی کہ ان کے برقعہ میں صرف بائیں آنکھ کے لئے ایک سوراخ کھلا رہتا تھا ۔ یہ اصلاح اور دوسری ترقیاں ہمارے لئے کسی مسرت کا باعث نہیں ہوسکتیں ۔ اس لئے کہ وہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اٹلی کے مفاد کی خاطر اور مسولینی کے اشاروں پر ہو رہا ہے ۔ البانیہ کی ان ترقیوں کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے دشمنوں کے لئے مفید سے مفید تر ہوتا جا رہا ہے ۔

(ع ، م)

سیاسی رواداری



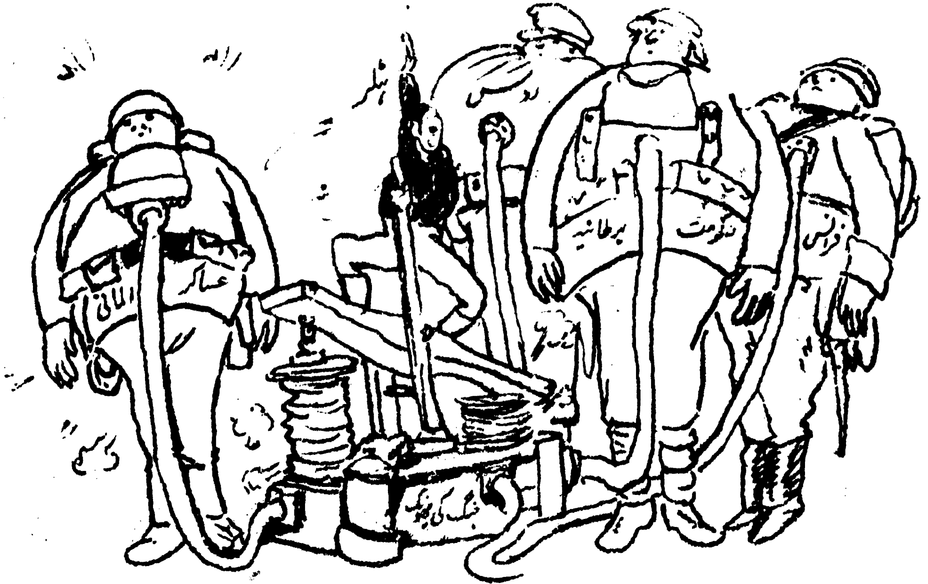
"Die Brennessel," Munich.

اشتراکی روس میں "بادشاہ سلامت" کی مشق

مارشل ٹوکاچیوسکی اور موسیو لٹونوف کی جشن تاج پوشی میں شرکت

دنیا کی پیٹھ پر جنگی مصارف کا بوجھ





"چار سال کے مختصر عرصے میں ہٹلر نے عساکر المانی کی قوت کہاں سے کہاں پہنچا دی"

اور دوسرے عساکر؟

Daily Herald
London.

توسیعی خطبات

جامعہ ملیہ میں جہاں طلبہ کی دینی اور دنیوی تعلیم کا انتظام ہے وہاں ملک کو دنیا کے مشاہیر سے روشناس کرانے کیلئے توسیعی خطبات کا انتظام بھی کیا جاتا ہے۔ ابتک ترکی قوم کے مایۂ ناز اہل عمل اور اہل فکر میں سے تین شخصیتیں خاص اس غرض سے ہندوستان تشریف لا چکی ہیں:۔

۱۹۳۳ء - غازی رؤف بے   ۱۹۳۴ء - ڈاکٹر بہجت وہبی

۱۹۳۵ء - خالدہ ادیب خانم

یہ لکچر دہلی اور بیرون دہلی کے ہزار ہا آدمیوں نے سنے۔ اب اردو اکادمی انھیں کتابی صورت میں شائع کر رہی ہے۔ غازی رؤف بے اور ڈاکٹر بہجت وہبی کے خطبات ابھی شائع نہیں ہوئے، البتہ خالدہ خانم کے خطبات "ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش" انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

اردو اکادمی اور مکتبہ جامعہ

اردو زبان میں بلند پایہ لٹریچر کی فراہمی جامعہ کا ایک خاص مقصد ہے۔ ہمارا ملی عروج دنیا کی دوسری اقوام کی طرح بہت کچھ اچھے لٹریچر پر منحصر ہے۔ جامعہ نے اپنی زندگی کی مختصر مدت میں ایک اکادمی اور مکتبہ قائم کیا ہے۔ اکادمی تصنیف و تالیف کا شعبہ ہے اور مکتبہ سے ان کتابوں کی فروخت ہوتی ہے۔ ابتک بچوں اور بڑوں کیلئے تقریباً سو کتابیں چھپ چکی ہیں۔ اکادمی کی جانب سے ایک علمی، ادبی ماہوار رسالہ "جامعہ" چھپتا ہے۔ مکتبہ میں اکادمی کی کتابوں کے علاوہ اردو ادب کی تمام کتابیں رہتی ہیں۔ اس علمی اور ادبی خزانے سے مزید واقفیت حاصل کرنے کیلئے فہرست کتب طلب کیجئے۔

چند خاص مطبوعات

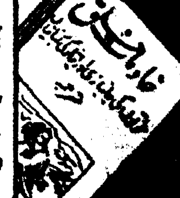
معاہدہ عمرانی	آزادی
پستالوزی	نفسیات شباب
تاریخ الامت	تاریخ فلسفہ اسلام
سیرت محمد علی	تلاش حق
میدان عمل	شعلۂ طور
نقش و نگار	

جامعہ کی شائع کی ہوئی بچوں کی کتابیں



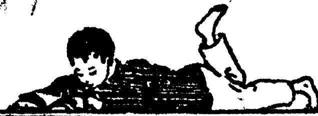






اردو میں بچوں کے لئے نئی نئی کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ جامعہ نے بھی اس کام میں حسب مقدور حصہ لیا ہے۔ جامعہ کی سب کتابوں میں ایک خاص رنگ یہ ہے کہ بچے پڑھیں تو اُنکے اخلاق پر اچھا اثر پڑے اور وہ سچے مسلمان، اچھے شہری اور سچے محب وطن بنیں۔

مذہب اور تاریخ ان کتابوں کی روح ہے جو ادب کے قالب میں پھونکی گئی ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ کتابیں بچوں کیلئے ایک خاموش معلم کا کام دیتی ہیں۔



پیام تعلیم

جامعہ سے بچوں کیلئے ایک ماہانہ رسالہ "پیام تعلیم" کے نام سے نکلتا ہے۔ اس کے ذریعہ انھیں اچھی اچھی کہانیاں سنائی جاتی ہیں اور خالی وقت میں مصروف رکھنے کیلئے کارآمد مشغلے بتائے جاتے ہیں۔ سال میں ایکبار سالنامہ شائع ہوتا ہے۔ جسے مفید اور دلچسپ معلومات کا مخزن کہنا چاہیے۔







